اشاعتِ خاص جون سنہ ۱۹۳۸ء
عالمگیر
لاہور
قیمت عہ
ایڈیٹر حافظ محمد عالم

زمینداروں کو مالا مال کرنیوالی کتب
مندرجہ ذیل کتب ماہرین فن کی بہترین اور مشہور و مقبول تصانیف ہیں جو کاغذ۔ لکھائی۔ چھپائی اور تصاویر کے لحاظ سے بھی بہت عمدہ ہیں۔ آپ بلا تکلف زیادہ سے زیادہ پسندیدہ کتب کا یکدم آرڈر دیں۔ تاکہ محصول ڈاک میں کفایت ہو
سنہری سکیم
چار ایکڑ سکیم
معالجات الکلب
طبیب مویشی
باتصویر مجلد
تندرستی حیوانات
بھیڑ بکری
ترکاری
باتصویر
اصول باغبانی
طبیب مرغی خانہ
باتصویر
پھلواڑی
سنگترہ اور اس کا ثمر
کیمیائے زراعت
نرسری
مجلد
میوہ جات
ہندوستانی مرغی خانہ
باتصویر مجلد سنہری
کتاب الاثمار
طبی تجربات کی نایاب بیاض خیر التجارب
اپنا پتہ مفصل اور خوش خط لکھئے۔ محصولڈاک بذمہ خریدار
ملنے کا پتہ: منیجر کتب خانہ دار البلاغ محمد نگر میور روڈ لاہور پنجاب

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ دلچسپ ہے

عالمگیر اشاعت خاص ماہ جون ۱۹۳۸

جلد ۲۹ نمبر ۱

فہرست مضامین!

ملاحظات

خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ عالمگیر کی اشاعت خاص ماہ جون ۱۹۳۸ء بروقت مکمل و مرتب ہوکر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

زیر نظر اشاعت خاص سے عالمگیر اپنی زندگی کی پندرھویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس عرصہ میں اگر عالمگیر نے ملک و قوم، زبان و ادب کی کسی قدر بھی خدمت انجام دی ہے تو یہ محض خدا تعالےٰ کا کرم و فضل ہے، یا پھر اس کے بعد ناظرین و معاونین عالمگیر کی توجہات خصوصی کا نتیجہ۔ جنھوں نے فی الحقیقت عالمگیر کی ترقی و بہبودی میں ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر حصہ لیا۔ ہمیں ایسے معاونین و محبان کرام سے امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح عالمگیر نوازی کا ثبوت دیتے رہینگے۔ ہمیں ان محبان کرام کی توجہات کی ہر وقت ضرورت ہے۔

زیر نظر اشاعت خاص میں جن حضرات کے مضامین عالیہ شریک اشاعت ہوکر اشاعت خاص کو چار چاند لگا رہے ہیں۔ ہم ان کے بدل ممنون ہیں امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنے بلند پایہ مضامین بھیجکر اردو زبان و ادب کی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹاتے رہیں گے۔ افسوس ہے کہ دیر سے موصول ہونے کے باعث بعض حضرات کے بہترین مضامین شریک اشاعت نہیں ہوسکے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں معذرت خواہ ہیں۔ انشا اللہ آئندہ پرچوں میں وہ ضرور شایع کر دیے جائینگے

اشاعت خاص کا دیدہ زیب ٹائیٹل مسٹر یعقوب صاحب کے

حسین موقلم کا رہین منت ہے۔ سید صاحب ایک باکمال آرٹسٹ اور مصور ہیں۔ آپ عرصہ سے بمبئی میں کام کر رہے تھے مگر ناموافق آب و ہوا کے باعث آپ بمبئی کے فیلم کو ترک کرکے لاہور آگئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ زندہ دلان پنجاب جو فن مصوری کے خاص طور پر دلدادہ ہیں آپ کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیشہ کے لئے آپ کو لاہور ہی میں مقیم رہنے پر مجبور کر دینگے۔

اشاعت خاص کا ٹائیٹل اور تمام تصویریں "عالمگیر الیکٹرک پریس" کی نئی ٹریڈیل مشین پر چھاپی گئی ہیں جو حال ہی میں کثیر اخراجات برداشت کرکے براہ راست ولایت سے منگوائی گئی ہے۔ اب انشاء اللہ ہم "نیرنگ" اور "خیام" کو زیادہ سے زیادہ جاذب نظر شکل و صورت میں پیش کر سکیں گے۔ امید ہے کہ ناظرین عالمگیر اپنی عالمگیر نوازی کا سلسلہ بدستور جاری رکھیں گے۔

حال ہی میں ہم نے عالمگیر بکڈپو میں بھی کافی ترقی کی ہے اور بہت سی اچھی اور عمدہ کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ ناظرین عالمگیر ہمیشہ ہر قسم کی کتابیں عالمگیر بکڈپو سے طلب فرمائیں۔ عالمگیر بکڈپو کی تمام تر آمدنی محبوب رسالہ عالمگیر پر صرف ہوتی ہے اس لئے عالمگیر بکڈپو سے کتابیں خریدنا گویا رسالہ عالمگیر کی امداد کرنا ہے۔

ادارہ

ارشاداتِ عالیہ

عالیجناب استاذ السلطان نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مدظلہٗ جانشین امیرؔ

کیفِ جامِ ارغوانی اور ہے — نشّۂ جوشِ جوانی اور ہے
دردِ دل آہیں بھی کہتی ہیں مگر — اشکِ خوں کی ترجمانی اور ہے
پھول گلشن کے کھلے مُرجھا گئے — وہ گلِ باغِ جوانی اور ہے
کیا کہوں مر مر کے جینے کا مزہ ! — اے خضر یہ زندگانی اور ہے
سب ہیں اُن کے دیکھنے والے مگر — آئینے پر مہربانی اور ہے
بہتے دریا کی روانی کچھ نہیں — چلتے خنجر کی روانی اور ہے
آنکھ سے آنے لگے پھر اشکِ خوں — کیا کوئی رازِ نہانی اور ہے
آپ سُنئے نغمۂ عیش و نشاط — دردِ فرقت کی کہانی اور ہے
یوں تو سب کچھ ہے زبانِ شمع پر — کہتی ہے جو بے زبانی اور ہے
بیکسی کو بھی مٹاتے جایئے ! — مرمٹوں کی یہ نشانی اور ہے

عشق میں راحت ہی راحت ہے جلیلؔ
ہاں بلائے ناگہانی اور ہے

خوجی

یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو سٹیشن لاہور سے نشر کیا گیا تھا جو سٹیشن ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے شائع کیا جا رہا ہے۔

از جناب حمید احمد خاں صاحب ایم۔اے۔ پروفیسر اسلامیہ کالج۔ لاہور

"فسانہ آزاد" کی رنگ برنگ اور بھرپور دنیا میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بیسیوں چھوٹے بڑے کردار ہمارے سامنے پیش کئے ہیں لیکن جو قبول عام خوجی کے حصے میں آیا ہے وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

خوجی کو اردو ناول کے زندہ کرداروں میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور گذشتہ ساٹھ سال میں ہم فسانہ آزاد کے خوجی کی قرولی سے تقریباً اسی قدر مانوس ہو چکے ہیں جس قدر داستان امیر حمزہ کے عمرو عیار کی زنبیل سے۔

فسانہ آزاد کی تصنیف کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ پنڈت رتن ناتھ کے ایک دوست نے انہیں ڈان کوئکسوٹ کی طرف توجہ دلائی اور تحریک کی کہ اردو میں اس ہی مثال کتاب کے نمونے پر کچھ لکھا جائے۔ ڈان کوئکسوٹ سترھویں صدی کے ہسپانوی افسانہ نگار سروانٹیز کا شاہکار ہے۔ اس قصے میں اس نے یورپ کے دور شجاعت کے شہسواروں کا خاکہ اڑایا ہے۔ ان شہسواروں کا قاعدہ تھا کہ مظلوموں کی حمایت اور عورتوں کی دستگیری کا عہد کر لیتے تھے اور ملکوں ملکوں پھر کر داد جوانمردی دیا کرتے تھے۔

سروانٹیز کی کہانی ۱۶۰۵ء سے شروع ہوتی ہے جب یورپ میں دور شجاعت کے رسم و رواج کو آنے والے تمدن کا طوفان بڑی تیزی سے بہائے لئے جا رہا تھا اس لحاظ سے یہ قصہ گویا دور شجاعت کے یورپ پر یورپ کے دور جدید کی تنقید ہے۔

ڈان کوئکسوٹ ایک ادھیڑ عمر کا سنجیدہ مزاج آدمی ہے اس کے سر میں یہ سودا سمایا ہے کہ وہ دور شجاعت کے سورماؤں کے مانند

طرح طرح کے کارہائے نمایاں دکھا سکتا ہوں۔ چنانچہ ان پرانے سورماؤں کی رسم پوری کرنے کے لئے وہ اپنے پڑوس کے ایک گنوار سینکو پینزا کو گدھے پر سوار کر کے اپنے سلاح بردار کے طور پر ساتھ لیتا ہے۔ دونوں گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ڈان کوئکسوٹ کا حد سے بڑھا ہوا جوش شجاعت ہر جگہ کوئی نیا گل کھلاتا ہے۔ کہیں تو وہ کسی پن چکی سے یہ سمجھ کر جا بھڑتا ہے کہ اس کے گھومتے ہوئے بازو کسی دیوزاد کی بانہیں ہیں۔ اور کہیں بھیڑوں کے کسی گلے پر یہ سوچ کر پل پڑتا ہے کہ یہ کسی دشمن کی بڑھتی ہوئی فوج ہے۔ غرض کہ پوری کتاب میں مصنف خدمت خلق کے اس جنون کا تمسخر اڑاتا چلا جاتا ہے جس پر کاربند ہونے کا یورپ کی نئی دنیا میں کوئی موقع نہیں رہا تھا۔

ڈان کوئکسوٹ کے دل کو اپنے بلند اخلاقی اصولوں کی اس طرح لگن لگی ہوئی ہے کہ اس جوش میں اس کو اور کچھ سجھائی نہیں دیتا چنانچہ اسی باعث اس کی شخصیت ہمیں مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے۔ ڈان کوئکسوٹ کی بلند پروازیوں کے مقابلے میں دوسری طرف سینکو پینزا ہے جو اپنی سادہ لوحی کے باوجود عام کاروباری سمجھ بوجھ کا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے اگرچہ اس کی اپنی حماقتیں کتاب میں ظرافت کا ایک اور باب کھول دیتی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کو ڈان کوئکسوٹ اور سینکو پینزا کے [illegible] باہمی تعلق کا مسئلہ سامنے ضرور تھا انہوں نے آزاد کے ساتھ خوجی کو [illegible] تھا ہوگا سینکو پینزا [illegible] [illegible]

اگر یہ افضل اپنی عشق بازیوں کے سلسلہ میں جب کوئی ہوائی بات کرتا ہے تو خوجی اپنی خوب سمجھداری سے بائے زنی کرتا ہے اور اپنی افیون کی پینک کے باوجود بڑی پتے کی بات کہہ جاتا ہے۔ پھر بھی سرشار چونکہ اپنے ہیرو کا مذاق اڑانا نہیں چاہتا تھا اس لئے آزاد اور خوجی کے درمیان ڈان کوئکسوٹ اور سینکو پینزا کا تعلق نباہنا اسے سخت مشکل معلوم ہوا اور اب اس تعلق کا صرف موہوم سا نقش کہیں کہیں رہ گیا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ خوجی کی شخصیت میں سرشار نے ڈان کوئکسوٹ اور سینکو پینزا دونوں کو ملا دیا ہے اور خوجی اپنے وقت کا لکھنوی ڈان کوئکسوٹ بھی ہے اور سینکو پینزا بھی۔ جس طرح ڈان کوئکسوٹ کی شخصیت یورپ کے مٹتے ہوئے دور شجاعت کی ایک علامت ہے اسی طرح خوجی بھی اس لکھنوی معاشرت کا ایک نغمہ ہے جس کا چراغ انگریزی تہذیب کی محفل میں نہ جل سکا۔

~~~~~~

دراصل فسانہ آزاد اور ڈان کوئکسوٹ دونوں کتابیں اپنی اپنی جگہ ایک اہم معاشرتی انقلاب کے وقت لکھی گئیں۔ دونوں اپنی اپنی طرز میں ایک مٹتے ہوئے تمدن پر تنقید کرتی ہیں اور سچ پوچھئے تو اس قسم کی کتابیں لکھنے کیلئے کوئی ایسا ہی زمانہ مناسب بھی ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی سوسائٹی پر اس ڈھنگ کی تنقید کا حق صحیح طور پر اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب وہ کمزور ہوتے ہوتے اپنی قدرتی موت کے قریب آ پہنچی ہو مگر بالکل مٹ بھی نہ گئی ہو کہ اس کی خامیوں کی رسوائی کرنا لاحاصل اور بے معنی معلوم ہو۔

فسانہ آزاد میں جس سوسائٹی کی تصویر ہمیں دکھائی گئی ہے وہ صد در جہ کی ایک سطحی، ناکارہ اور بے مقصد سوسائٹی ہے۔ اول تو اس سوسائٹی کا کوئی نصب العین ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو محض خوش وقتی اور بے فکرا پن۔ یہاں زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ نواب صاحب قبلہ و دام ظلہ کو زیادہ دیر تک ایک ہاتھ میں اچھال سکتے ہیں یا ان کی طائفے، بھٹیاریوں، طوائفوں، افیونیوں اور ... کی سوسائٹی ہے جس کی ہستی پار رنگا ہوں پر موقوف ہے کاہلی، عیاشی، پہلوانی، بیٹری اور پینک بازی ہے۔ غرض اس سوسائٹی میں سنجیدہ مشاغل اور بلند مقاصد کی جھلک کہیں نظر نہیں آتی۔ آزاد

ترکوں کی حمایت میں روس کے خلاف بظاہر ایک مذہبی جنگ لڑنے کے لئے جاتا ہے لیکن قصے کے شروع ہی میں نافرجام نوابوں اور بدقماش مصاحبوں کی صحبت میں اس کی سیرت اور اس کی دلچسپیوں کا نقشہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کے بعد روس کا معرکہ سر کرنے کے لئے اس کا روانہ ہونا بہت زیادہ تکلف معلوم ہوتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ سرشار آزاد کو کسی مذہبی یا قومی جوش کی تحریک پر ترکی نہیں بھیجتا۔ اس کی اس شجاعت کی تہ میں صرف یہ جذبہ ہے کہ لکھنؤ کی ایک حسین عورت سے شادی ہو سکے۔ اور پھر یہ جذبۂ عشق بھی کوئی حقیقی یا گہرا جذبہ نہیں ہے۔ آزاد کے سینہ میں کئی دل ہیں جنہیں وہ مشرق سے لیکر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک حسین عورتوں کے قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لئے پھینکتا چلا جاتا ہے۔ یہ خدا ہی بہتر جان سکتا ہے کہ ایسے شخص کو ہندوستان سے کالے کوسوں دور جانے کی زحمت سرشار نے کیوں دی ہے؟ بہر حال وہ ترکی جاتا ہے مگر ستم یہ ہے کہ روم و روس کا یہ معرکہ بھی بھان متی کا تماشہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ترکی کے میدانوں میں لکھنؤ کی مٹی کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ یہاں بھی خوجی افیون کی پینک میں بکارتا پھرتا ہے اور ترکی فوج کی کمپنیوں میں اسی طرح شمع انجمن بن جاتا ہے جس طرح لکھنؤ کے طبلہ نواز نوابوں کی مجلسوں میں۔

غرضکہ "فسانہ آزاد" کی لکھنؤ کی سوسائٹی ایک بے مفہوم، بے مقصد اور ناکارہ سوسائٹی ہے۔ اس کے ہنگامے محض خوش وقتی، اس کی رونق نری مسخرگی اس کا مقصد صرف فضولیات کی پرستش اور اس کا جوہر فقط لاابالی پن ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فسانہ آزاد کے واقعات غیر مربوط، بے تعلق اور الجھے ہوئے ہیں۔ اس الجھاؤ اور بے ربطی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ قصہ دراصل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اودھ اخبار میں چھپا تھا۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ فضا کے عام لاابالی پن سے ناول کا پلاٹ یعنی عمل بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی لاابالی پن پوری کتاب کی روح رواں ہے۔ اسی سے پلاٹ یعنی عمل میں ایک وحدت کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس قصے میں واقعات کا ربط یا عمل کی وحدت ڈھونڈنا بیکار ہے
~~~~~~

البتہ فضا کی وحدت بڑی وضاحت کے ساتھ شروع سے آخر تک موجود ہے سرشار کی لکھنویت اتنی پختہ ہے کہ لاابالی پن کی عام کیفیت میں کہیں بھی خلل نہیں آتا۔ ہر طرف فضولیات کا دور دورہ ہے۔ ہر واقعے کی تہ میں یہی لاابالی پن ہے۔ اس لاابالی پن کا بہترین مظہر خوجی ہے۔ خوجی کو سوائے انیسویں صدی کے لکھنؤ کے اور کوئی خطہ پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ جن چیزوں کو ہم نے بے معنی فضولیات کہا ہے ان کا مفہوم خوجی ہے۔

فسانہ آزاد کے عمل میں خوجی کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہے، اس کے باوجود اگر فسانہ آزاد کے کرداروں میں خوجی سب سے زیادہ نمایاں اور اہم کردار ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی موجودگی سے اس پوری داستان کو ایک مفہوم مل گیا ہے۔ آزاد کا بٹیر باز نوابوں کی محفل سے اٹھنا اور جہاد کے لئے ترکی پہنچ جانا، حسن آرا کی محبت کی خاطر وطن سے رخصت ہونا مگر بمبئی پہنچتے پہنچتے اختر النسا، زینت النسا، مس درجینا بیگم، مرزا اسد بیگ اور خدا جانے اور کس کس کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانا ایسے واقعات ہیں جن کا ماننا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ لکھنؤ کا یہ نازک مزاج سپاہی جو ترکی میں میدان مارنے نکلا تھا سفر کی پہلی ہی منزل میں تپ اور اختلاج قلب کا شکار ہو جاتا ہے اور اس عارضے میں اس طرح گھبرا گھبرا کر واویلا کرتا ہے اور "ہائے میں مرا" کی پکار لگاتا ہے کہ اس کے بعد اس سے کسی مردانگی کی توقع رکھنا غیر معمولی حسن ظن کے بغیر ممکن نہیں رہتا مگر بے تکا پن دیکھیے کہ یہی بانکا روس کے میدان کارزار میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ گھمسان کے رن میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا مس کلیرسا کو آغوش میں کھینچ کر اس کی چٹ چٹ بلائیں لیتا نظر آتا ہے۔ یہ سب باتیں بالکل ان مل بے جوڑ ہیں۔ مگر خوجی کی موجودگی سے ان میں ایک خاص قرینہ ایک خاص مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔

خوجی ہر موقع پر ہمیں یاد دلا دیتا ہے کہ ہم عزم و ہمت اور جد و جہد کے عالم میں سختیاں نہیں جھیل رہے ہیں بلکہ فضولیات کی دنیا کی سیر کر رہے ہیں۔ یہی قصہ خوجی کے بغیر ایک گھٹیا سوانگ ہو کر رہ جاتا مگر خوجی اسے اٹھا کر واقعات کی دنیا میں لے آتا ہے۔ یہ دنیا قدیم لکھنوی معاشرت کی حقیقی دنیا ہے اور اس کا جوہر ایک حقیقی لاابالی پن ہے جس کا مرکز خوجی کی شخصیت ہے۔ سرشار کے فنکارانہ کمال کے صدقے میں لکھنؤ کی زندگی کا یہ پہلو ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا ہے اور اس بنا پر یہ بالکل بجا ہے کہ سرشار کو اردو کا پہلا حقیقت نگار ناولسٹ تسلیم کیا جائے۔

الیوفیوں کے مسلم الثبوت استاد حضرت خوجی کا پورا نام خواجہ بدیع الزماں ہے۔ مگر عملی طور پر بھانڈ کا جو پیشہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے اس نے ان کے نام کو گھسا کر خوجی بنا دیا ہے۔ خوجی اصل میں گجرات کا باشندہ ہے مگر اس کی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ، کانپور اور لکھنؤ کے اطراف میں گزرا ہے۔ جس وقت ہمارا افسانہ شروع ہوتا ہے خوجی کی عمر ساٹھ برس کے قریب ہے۔ خوجی دبلا پتلا آدمی ہے قد بہت پست ہے گردن کوتاہ اور پیشانی تنگ ہے۔ آپ کی ایک عدد ریش مبارک بھی موجود ہے جس کو خاص خاص موقعوں پر منڈوانے کی کوشش میں آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا دیا کرتے ہیں۔ سچی آپ کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اپنے آپ کو تراتیس مار خاں سمجھتے ہیں اور اسی اکڑفوں میں ہر کسی سے الجھ پڑتے ہیں چونکہ بھانڈ پن آپ کی فطرت کا جزو ہے اس لئے تعجب نہیں کہ کبھی یار لوگوں کو خوش کرنے کے لئے بھی ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہوں۔ بہر حال آپ کو ہر بات میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے۔ کمزور منحنی سے آدمی کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ اور اس پر تیکھے اور بگڑے دل نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر جگہ خوب دھپیائے جاتے ہیں۔ ہر جھگڑے میں انہیں دھب بچاؤ کی پڑتی ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ایسے موقعوں پر آپ اپنی قرولی کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ مگر شکر ہے کہ قرولی کبھی پاس ہوتی ہی نہیں۔ قرولی چھری کے مانند ایک ہتھیار ہوتا ہے جسے کمر میں باندھتے ہیں۔ قصے کے آغاز سے انجام تک ہم خوجی کی زبان سے "لانا میری قرولی!" کی ہانک شاید ہزار دفعہ سنتے ہیں مگر اس قرولی کا دیکھنا نہ ہماری قسمت میں ہے اور نہ خوجی کے نصیبوں میں۔

قصے کے شروع میں ایک نواب صاحب دکھائے گئے ہیں جو اپنے گم شدہ بٹیر کے غم میں سوگوار بیٹھے ہیں خوجی بظاہر ان کے مصاحب مگر دراصل ان کے بھانڈ کی خدمت بجا لا رہا ہے۔ اور ہر وقت الیوفیوں کی بیٹھک میں رہنے کے باوجود نواب صاحب کی خوشامد میں دوسرے مصاحبوں کو مات کرتا ہے۔ اسی نواب کی مصاحبت میں آزاد بھی خوجی کا ایک خواجہ تاش ہے۔ آزاد ترکی کے سفر میں خوجی کو اپنے ساتھ لیتا ہے۔
سرشار کے قصے کی لاابالی دنیا کی یہ ا[illegible]

لڑنے کے لئے ہندوستان سے چلتا ہے مگر اس معرکہ کے لئے ساتھی وہ انتخاب کرتا ہے جسے لات مار کر اٹھایا تب وہ کہیں گھر سے نکلا۔ ذرا اس کالے میں دونوں کی روانگی کی شان ملاحظہ کیجئے۔

آزاد۔ کیا یہ کھانا کھا چکے؟

خوجی۔ جی نہیں تو۔ کچھ آپ کی طرح بیوقوف ہوں؟ اور سب میٹھی میٹھی چیزیں پکوائیں اور آج افیم بھی معمول سے زیادہ پی۔ خوب چسکی لگائی اور پینک پر پینک لگائے۔

غرضکہ اس طرح یہ سورما مذہب کی راہ میں لڑنے کے لئے وطن سے رخصت ہوتے ہیں۔ آزاد اس لئے گھر سے نکلا ہے کہ حسن آرا پر اپنی سچی محبت ثابت کرے اور روس کے خلاف داد جوانمردی دے لیکن اپنے نام کے باوجود وہ علائق دنیوی میں اس طرح گرفتار ہے کہ سوائے سچی محبت اور جوانمردی کے اور کسی چیز سے آزاد نہیں۔ وہ لکھنؤ سے چلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کے آدھے علاقے کی چھیل چھبیلی اور چنچل بھٹیاریاں اس کی بغلوں میں ہیں۔ ایک مرد مجاہد کے ساتھ ان کی موجودگی غلط اور بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جونہی ہماری نظر خوجی پر اٹھتی ہے ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان من موہنی مگر بیباک بھٹیاریوں کی موجودگی کی سب سے بڑی سند اور سفارش خود خوجی کا وجود ہے۔ وہ اس لاابالی زندگی کی فضا اس بے تکلف طریقے پر اپنے ساتھ لاتا ہے کہ اعتراض کا حق ہم سے چھین لیتا ہے۔

خوجی جہاں جاتا ہے لکھنؤ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ مالٹا ہو یا مصر ترکی ہو یا پولینڈ جس جگہ خوجی ہے اسی جگہ لکھنؤ بھی ہے اور لکھنؤ کی زندگی کا وہ بانکپن بھی جس کا رنگ کسی سنجیدہ خیال یا سنجیدہ کام سے آلودہ ہوتے ہی میلا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سمندر میں ایک ہلاکت خیز طوفان آتا ہے اور جہاز غرق ہو جاتا ہے تو ہم اپنے دوست خوجی کی نقلیں اس معمولی سے حادثے کو نظر انداز کر دیتے ہیں مگر لکھنؤ کے اس سپوت فرزند کی طرح جس دلگداز صدمے کو ہم برداشت نہیں کر سکتے وہ اس بحری طوفان میں افیم کی ڈبیا کا نقصان ہے۔

مالٹا پہنچتے ہی ہمارے لئے زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ افیم کس طرح حاصل کی جائے۔ چنانچہ جب خوجی مالٹا کے بازاروں میں مارا مارا پھرتا ہے تو ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ مالٹا میں اس سے زیادہ ضروری اور ضروری کام ہو بھی کیا سکتا ہے کہ ادھر ادھر گھوم کر افیم تلاش کی جائے سکندریہ کے بازار میں نکلتے ہی خوجی سب سے پہلے یہ تین چار سوال کرتا ہے کیوں بھئی اسکندریہ میں افیم ملتی ہے؟ کوئی چانڈو خانہ ہے۔ کہیں مدک اڑتی ہے؟ چرس کی لو آسمان کی خبر لاتی ہے یا نہیں۔

اب بتایئے کہ خوجی جیسے رفیق سفر کے ہوتے ہوئے کون کافر یہ سوال کر سکتا ہے کہ حسن آرا کے ساتھ آزاد کے قول و قرار کیا ہوئے اور روس کے خلاف لڑنے کے لئے وہ ہمت و شجاعت کہاں سے لائے گا؟ جب یہ عجیب و غریب سفر شروع ہوتا ہے تو ہندوستان ہی میں خوجی کی مصیبتوں اور ہمارے قہقہوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے ایک کسان کے ساتھ حضرت خوجی کا جھگڑا ہوا اس نے خود تو ان کو ہاتھ نہ لگایا مگر اتنے میں اس کی کرّیل جورو آن پہنچی۔ وہ آتے ہی ان سے گتھم گتھا ہو گئی اور وہ تان تان کر لپڑ لگائے کہ بیتین ہی نکال دیا۔ بارہا اس ہاتھا پائی اور جوت پیزار پر ہمیں ہنسی آتی ہے مگر سرشار نے کچھ دستور سا بنا لیا ہے کہ محض تفریح کے طور پر گھونسوں، چانٹوں اور لاتوں سے خوجی کی تواضع کی جائے۔ اس تکرار سے طبیعت کہیں کہیں بدمزہ ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا حیران ہوتا ہے کہ آخر اس لپاڈگی میں سرشار کو کہاں کی ظرافت نظر آ رہی ہے۔ سرشار کا عام سلوک خوجی سے یہ ہے کہ قصے میں جہاں کہیں خوجی نے سر نکالا اس کا مصنف گویا زبان حال سے پکار اٹھا "وہ آیا خوجی! مارو اسے جوتیاں"۔ کسان کی جورو کے واقعہ کے بعد چند ہی صفحوں میں ایک پٹھان۔ تین شرابی، ایک گھسیارن، بوا زعفران اور خدا جانے اور کون کون اسی انداز میں خوجی کی مرمت کرتا ہے۔

حضرت خوجی کو اپنی شکل و صورت کے متعلق بہت حسن ظن ہے۔ ان کو یقین ہے کہ پریاں تک مجھے چرانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ روس اور پولینڈ میں آپ کا یہ خبط خاص طور پر بڑھ جاتا ہے اور وہاں کئی بار یہ راگ گاتے ہیں کہ ہائے نہ حسین ہوتا نہ پریاں عاشق ہوتیں۔ مگر اس سے پہلے بھی آپ اپنے آپ کو مع اپنے بڑھاپے اور بونا پن کے ایک جوان رعنا سے کم نہیں سمجھتے۔ لکھنؤ سے بمبئی پہنچتے ہیں تو ایک سات فٹ اونچی عورت کے متعلق آپ کو خیال ہو جاتا ہے کہ ہم پر ریجھ گئی۔ وہاں کے مختصر ترین و

توش کو بغل میں دبا کر رفو چکر ہو جاتی ہے اور الگ لیجا کر وہ زنانے کے گھونسے رسید کرتی ہے کہ آپ کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ عورت نہیں تھی بلکہ مرد بھر دیا تھا اس سے ملتے جلتے اور کئی سین کتاب میں آتے ہیں۔ جن کے بار بار آنے سے کہیں کہیں طبیعت اکتا بھی جاتی ہے۔ اسی طرح افیم کا مضمون بھی سرشار نے کچھ بہت زیادہ رگید ڈالا ہے اور ہر جگہ اس میں ظرافت کی شان پیدا نہیں ہو سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ خوجی کی ظرافت کئی جگہ اس طرح تنزل کرتی ہے کہ گھٹیا قسم کی مسخرگی اور بھانڈپن سے آملتی ہے۔ مثلاً جہاز پر کسی نے خوجی کی ناک میں مرچیں دے دی ہیں اور خوجی جہاز کے عرشے پر ادھر اُدھر چھینکیں مارتا پھرتا ہے۔ اس سین کو سرشار کا کوئی بڑے سے بڑا مداح بھی ظرافت کا اچھا نمونہ قرار نہیں دے سکتا۔ کتاب کے کئی حصوں میں یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ سرشار کی ظرافت، افیون کی پینک اور خوجی پر تڑا تڑ جوتیاں پڑنے تک محدود ہے لیکن جس جگہ سرشار خوجی کے ذریعے سے لکھنؤ کی خانہ نشین تہذیب کو بیرونی حالات سے دوچار کر دیتا ہے وہاں اس کے لب و لہجہ میں وہ لطافت آجاتی ہے کہ ہم اسے فوراً اُردو ادب کے بہترین ظرافت نگاروں کی صف میں دیکھتے ہیں مثلاً خوجی کو یقین ہے کہ ہوٹل میں کھانا کھانے سے انسان ناپاک ہو جاتا ہے آزاد ہوٹل میں سے کھانا کھا کر نکلتا ہے تو دونوں میں یہ نوک جھونک ہوتی ہے۔

آزاد۔ واہ استاد تم تو خوب مزے سے کباب اڑا رہے ہو؟

خوجی۔ پھر کوئی شراب اڑائے کوئی کباب کھائے۔

آزاد۔ ایں، شراب! لاحول ولا قوۃ۔ قسم قرآن کی کس مردک نے شراب کا ایک قطرہ بھی چھوا ہو۔ شراب پی ہو تو سؤر ہی کا گوشت کھایا ہو۔

خوجی۔ تسلیم ایکت شد دو شد۔ آپ نے سؤر کا گوشت بھلا کب چھوڑا ہو گا۔ قسم کو تو آپ مانتے ہی نہیں۔ مجھے آج تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ آپ کا دین وایمان کیا ہے۔ تمھارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ خیر جی اپنی اپنی سب بھگت لیں گے۔ ہم کو اس بکھیڑے سے کیا واسطہ؟

آزاد۔ ہماری [illegible] بیتی!

خوجی۔ ہائیں کیا خوب۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھری کانٹا کھٹا کھٹ چل رہا ہے۔

آزاد۔ تو بھائی چھری کانٹے سے کوئی شراب پیتا ہے۔

خوجی۔ ہم کیا جانیں، ہماری جانے جوتی کہ شراب کیونکر پیتے ہیں۔ یہ کسی اپنے ایسے میگسار بادہ خوار سے تحقیقات کیجئے۔ افسوس.....

آزاد۔ آپ ایک کام کیجئے۔ ہوٹل میں جاکر.....

خوجی۔ لاحول لاحول خدا ایسی جگہ کسی سچے اور پکے مسلمان کو نہ لے جائے توبہ توبہ، خداوندا بچائیو۔ گنہگار بندہ ہوں۔ ارے توبہ ہوٹل میں ہم جائیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ بس آپ ہی کو مبارک رہے قبلہ۔ نیدرلینڈ پولینڈ میں بھی خوجی کی یہی کیفیت ہے۔ آزاد پولینڈ کی شہزادی سے اپنا بیاہ رچاتا ہے۔ برات بڑی دھوم دھام سے آتی ہے۔ خوجی کو یہ فکر ہے کہ دلھن جہیز میں کیا لائیگی۔ کبھی پوچھتا ہے یار لطیفے نہیں آئے دور دور سے لطیفے منگواؤ۔ رہ رہ کر پینے والی بی حیدر جان اور چھیریا کے لطف یاد آتے ہیں اور پھر یہ ضد بھی ہے کہ دس روپے کی اٹھنی چونی اور دونی اور ایک دس روپے کے پیسے بھنا کر خیرات کر دو۔

ٹرکی کے میدان جنگ میں خوجی کا عمل اپنی سیرت کے عین مطابق ہے آپ روسیوں سے چھپ کر درخت پر بیٹھے ہیں اور وہیں افیم گھول رہے ہیں۔ اسی طرح گرفتار ہو جاتے ہیں روسی ان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں تو افیم کی ڈبیا کو کسی طرح ہاتھ سے نہیں چھوڑتے پھر روسیوں کی قید سے بھاگ کر آتے ہیں تو نعرہ لگاتے ہوئے آتے ہیں کہ "آن پہنچے آن پہنچے دو کروڑ روسیوں سے بچ کر خواجہ بدیع آن پہنچے"۔

یہ اور اس قسم کی دوسری حرکتیں مثلاً مرتے ہوئے روسیوں کا نانا اور زخمیوں کے سر اڑانا ایسی باتیں ہیں جن سے ڈان کوکسوٹ اور سینکو پینزا کے بجائے شکسپیر کے مشہور مزاحیہ کردار فالسٹاف کی یاد تازہ ہوتی ہے فالسٹاف "جان ہے تو جہان ہے" کے اصول پر کار بند ہے نام پیدا کرنے کے لئے کٹ مرنا اس کے نزدیک بیوقوفی ہے پھر اس طرح کا مشورہ خوجی بھی آزاد کو دیتا ہے تاکہ وہ ٹرکی جانے سے باز رہے۔ "چپ سے شادی ہو جائے۔ مزے سے چین کرو اور ہمیں بھی نوکر رکھ لو۔ مدمیدان [illegible] ٹیڑھی کھیر ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی مورچے پر گولی لگی اور لینے کے دینے [illegible] حسن آرا سے کون ملے گا؟"

لیکن خوجی میں ہم فالسٹاف کی جھلک دیکھیں یا ڈان کوئکسوٹ پھر بھی خوجی ہی رہتا ہے۔ اس کی ایک جداگانہ شخصیت ہے جس میں ہر جگہ مطابقت اور یکرنگی نظر آتی ہے۔ خوجی کا بیٹوپن اور خوش مزاجی خود پسندی اور لاف زنی، بزدلی اور لڑاکا پن، حماقت اور چالاکی، بڈھا بُڈھاپا اور عشق بازی، بے اصولی اور آزاد سے وفاداری سب ایک ہی زندہ کردار کی سیرت کے مختلف پہلو ہیں۔ مسخرگی۔ پھبتی بازی۔ ہزل گوئی اس کے خاص کمالات ہیں۔ خوجی کو پیدائشی بھانڈ کی وہ خداداد صلاحیت حاصل ہے جس سے وہ جان بوجھکر بیوقوف بنتا ہے تاکہ دوسروں کو اس پر ہنسنے کا موقع مل سکے۔ افیون کی پینک میں ہاتھی کی پیٹھ سے ایک مرتبہ جونہی دھڑام سے زمین پر گرتا ہے فوراً پوچھتا ہے "کون گرا؟" اپنے دوست آزاد کے لفظوں میں "یہ مردود ایک مسخرہ ہے۔ بے حیا، بے شرم، نہ اس کو چھیپائے جانے کا خوف نہ جوتیاں کھانے کا ڈر"۔ مگر آزاد کی اس رائے کے ساتھ خوجی میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ پٹ پٹا لیتا ہے تو جھاڑ پونچھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مختصر انیسویں صدی کے لکھنؤ کی یہ دلغریب شخصیت رتن ناتھ سرشار کا ادبی شاہکار ہے۔ اس کردار کی تعمیر ایسی ہنرمندی سے ہوئی ہے کہ کہیں کوئی پیچ ڈھیلا نظر نہیں آتا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر خوب کھپی ہوئی ہے اس کے برعکس افسانے کے ہیرو آزاد کی سیرت ڈھیلی ڈھالی غیر حقیقی اور انمل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ آزاد کے کردار میں اتنی خامیاں کیوں دکھائی دیتی ہیں۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں ہے۔ دراصل سرشار کا تخیل اپنے گرد و پیش کی معاشرت سے اوپر جا ہی نہیں سکتا۔ جس جہاز میں خوجی اور آزاد سفر کر رہے ہیں وہ طوفان کی زد میں آجاتا ہے تو کیا کپتان اور کیا دوسرے انگریز مسافر سب کا رنگ اسی بے تکلفی سے فق ہو جاتا ہے جس سے ہمارے لکھنؤ کے خوش وقت بانکوں کا ـــــ سرشار اپنی سوسائٹی کا نقاد ہونے کے باوجود اسی سوسائٹی کی مخلوق ہے وہ صرف خوش وقتی اور چھیلکرے پن کا مصور ہے۔ سچی محبت، گہری وفاداری، سچی مردانگی، غرض کہ کسی سنجیدہ اور بلند جذبے کو وہ نہیں سمجھ سکتا۔ معرکہ روم و روس کے ہونے والے غازی آزاد کے جذبات شاعرانہ دل پذیر سنئے۔

"میں ٹرکی میں وہ وہ کارنمایاں کرونگا کہ میری بسالت کے جھنڈے گڑ جائینگے۔ اور ساری خدائی میں میرا نام ہوگا"۔

یہ شجاعت کی زبان کے نکلے ہوئے جملے نہیں ہیں یہ کوئی لپاڈیا بھانڈ موچھوں پر تاؤ دے دے کر دون کی لے رہا ہے۔ اس سے آگے چل کر آزاد حسن آرا سے رخصت ہوتا ہے تو اس عاشق صادق کے قلم سے یہ فقرے ٹپک پڑتے ہیں۔

"میں ٹرکی سے فائز المرام واپس آکر تمھارے ساتھ بیاہ رچاؤں گا اور مزے سے دندناؤں گا"۔

دندنانے کا لفظ آزاد کے منہ سے کتنا بھونڈا معلوم ہوتا ہے لیکن دیکھئے یہی لفظ خوجی کی زبان پر کس طرح نکھرتا ہے۔

(کسی رئیس کی صحبت میں) جمنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے اور جو جم گئے تو دونوں وقت پلاؤ اور باقر خوانی شیرمال اور پراٹھے، کباب اور قورما، دو پیازہ اور مربائے لذیذ چکھیے اور دندنائیے"۔

الغرض جب بھی سرشار لکھنؤ کے بیکروں کی محفلیں سجاتا ہے تو مضمون کے دلپسند ہونے کی وجہ سے زبان کی نوک پلک اس طرح درست ہوتی ہے اور الفاظ کی تراش خراش میں وہ جذب ہوتا ہے کہ ہم لکھنے والے کے استادانہ کمال پر عش عش کرتے ہیں۔ حضرت صف شکن علی شاہ بیر کے ماتم گساروں کی مجلس کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کی ظرافت نے دوبارہ جنم لیا ہے لیکن حرکت اور عمل کی دنیا میں داخل ہوتے ہی مصنف کی زبان میں لکنت آجاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرشار میں کسی ایسے احساس کے ادا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ جس میں رفعت یا سنجیدگی کا کوئی شائبہ پایا جائے وہ صرف لکھنؤ کی زندگی کے ایک اس دور کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوجی کا کردار جس میں نہ رفعت ہے نہ سنجیدگی اور نہ کسی بلند نظری کی جھلک اس کی تصویر کھینچنے میں وہ کمال دکھایا ہے کہ بارہا شکسپیر اور سرونٹیز اور سوفٹ سے مثال دینے کو جی چاہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ سرونٹیز اور شکسپیر اپنی ادبی مخلوق سے بالاتر ہیں۔ وہ جب چاہتے ہیں اپنے ماحول سے بہت اوپر پرواز کرتے ہیں مگر سرشار کا اوڑھنا بچھونا لکھنؤ ہے یہ رہ گیا

نفسیات کی دنیا سے باہر نکلتے ہی وہ بے بس ہو جاتا ہے مگر اس محدود سی کائنات میں اردو نے اس سے بڑا صناع پیدا نہیں کیا۔

ملک کے ناول اور ڈرامے میں بعض کردار ایسے آجاتے ہیں جن میں خود مصنف کے دل و دماغ کی بہترین قوتوں کی جھلک نظر آنے لگتی ہے مثلاً سیکسپئر کے متعلق کہتے ہیں کہ جب اس نے اپنا مشہور ڈراما ہملٹ شہزادہ ڈنمارک لکھا تو ہملٹ کے آئینے میں خود سیکسپئر کی روح کا عکس نظر آنے لگا۔ کچھ ایسا ہی تعلق سرشار اور خوجی کے درمیان قائم معلوم ہوتا ہے اس کردار میں جو مطابقت اور یکرنگی ہمیں نظر آتی ہے اس کی تہ میں سرشار کی اپنی روح کام کر رہی ہے۔ سرشار کو خوجی سے ایک خاص دلی تعلق ہے۔ وہ اپنے کسی اور کردار سے اتنا بے تکلف نہیں ہے جتنا خوجی سے جس بارعب اور ریگانگی کا نشانہ خوجی بنایا جاتا ہے اس کے باوجود مصنف کی آنکھ بڑی شفقت سے خوجی کے ہنگاموں پر بھی رہتی ہے اور اسی کے نور سے خوجی کے خد و خال زیادہ نمایاں اور روشن ہو جاتے ہیں۔ خوجی لکھنؤ کی سوسائٹی کا جوہر ہے مگر اس آئینے میں ذرا جھک کر دیکھنے سے ہمیں خود رتن ناتھ سرشار کی صورت نظر آتی ہے۔

غزل

عالیجناب نواب سید محمد جمال الدین حسین خاں صاحب بہادر والی اسٹیٹ کلیانی

مر جانا تھا کچھ کھا کر اس بت پہ نہ مرنا تھا
اے دل وہ کیا تو نے جو تجھکو نہ کرنا تھا

تیر نظرِ جاناں کیا اور نہ نفیس را ہیں
میرے ہی کلیجے سے کیا پار گذرنا تھا

غمخانۂ عاشق کی کیا پوچھتے ہو راہیں
آنکھوں سے گذرنا تھا اور دل میں اترنا تھا

تم گورِ غریباں پر کیا جلد گئے آکر
بستی تھی خموشوں کی بے فائدہ ڈرنا تھا

ہونا یہ جمال اچھا اُن پر جو فدا ہوتا
دُنیا تھی یہ دو روزہ آخر تجھے مرنا تھا

محمد عطا کیانی

ترغیب!

از "میراجی"

چاند خاموش ہے فضا خاموش،
راہ خاموش ہے ہوا خاموش

سارے عالم پہ چھائی خاموشی،
نیند کی پُرسکون بے ہوشی

دھیرے دھیرے قدم اٹھائیں ہم
اور بستی کو چھوڑ جائیں ہم

دیکھو محدود زندگی کیوں ہو؟
غیر کے بس میں سرخوشی کیوں ہو

آؤ بھولو سماج کی باتیں!!
اپنی ہیں اب سے چاندنی راتیں

آؤ پابندیوں کو بھولو تم!
آؤ، آزادیوں کو چھو لو، تم

دل کی افسردگی کو دُور کرو
دل سے پژمردگی کو دُور کرو،

آج کی رات ہے مسرّت کی
آج ہر بات ہے مسرّت کی

آج تکمیل جذبۂ دل کی
ہو گی ہمدم ہماری محفل کی،

کشتی عمر چھوڑ دو آزاد،
اپنی ہستی کو اب کرو، آزاد

ہات میں ہات تھام لو میرا
اب سے بس ایک نام لو میرا

ہو کے تحلیل میری ضو میں تم
آؤ، چلدو میری جلو میں تم

زندگی چار دن ہے چار ہی دن،
دل میں چاہت ہے چار دن ساکن

چار دن کے لئے مری بن جاؤ،
مرے ہمراہ آؤ چل دو — آؤ،

رات ایسی نہ آئیگی پھر سے
وقت ایسا نہ لائیگی پھر سے

چاند خاموش ہے فضا خاموش
سارا عالم ہے نیند میں بیہوش،

چپکے چپکے قدم اٹھائیں ہم!
آؤ آؤ یہاں سے جائیں ہم!!

نقش بر آب

ایک درد انگیز رومانی افسانہ

از جناب قاضی زاہد علی صاحب بلہوری

جب چاند کی نازک کرنیں اپنے زریں جسموں کو دریا کی ننھی ننھی لہروں میں چھپانے لگتی ہیں۔ جب تمام کائنات چاند کی سیمیں چادر میں ملفوف ہوکر خاموش ہو جاتی ہے۔ جب نسیم شامہ نواز گلشن میں آوارہ پھرتی ہے وہ رات اور وہ آدھی رات کیا ہوتی ہے۔ شاید کسی حسن مغنیہ کا نغمہ یا لمبے لمبے بالوں والی کسی دوشیزہ کی ایک مسکراہٹ۔

ایک ایسی ہی رات تھی۔ دریا کی روانی ایک ہلکا سا نغمہ پیدا کرکے فضا کے وسیع خلا میں کھو دیتی تھی۔ اسی روانی کے ساتھ ساتھ ایک کشتی بھی جا رہی تھی۔ اس کی نازک خرامی اور خوبصورت ساخت پھر اس پر کرنوں کی بیتابانہ بارش۔ کیسا عجیب منظر تھا کشتی میں صرف ایک شخص تھا جو خیالات کے سمندر میں غرق ہوکر اسے چلا رہا تھا۔ جس چیز پر وہ اپنی ساری توجہ صرف کر رہا تھا وہ ایک ایسا نغمہ تھا جو بے انتہا آہستگی سے فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ کشتی پل کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ پل ابھی تھوڑے گز کے فاصلے پر تھا کہ فضا میں شور ہونے لگا۔ لہریں بیتاب ہونے لگیں تیور بتا بیچ ٹرھنے لگا۔ ریل کے انجن کی تیز روشنی نے پل کو اپنے گرد و نواح میں ممتاز کر دیا۔ ایک ہی منٹ بعد ریل پل پر تیزی کے ساتھ گزر رہی تھی ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دریا کا سینہ چیر دیا۔ لہریں موتیوں کی طرح بکھرنے لگیں۔ پھر دوسرے ہی لمحہ میں کشتی کے پاس ایک دھماکا ہوا۔ کشتی سوار دریا کو چیرتا ہوا پل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پل کے نیچے وہ پانی میں غائب ہوگیا۔ ایک سیکنڈ کے بعد کسی بوجھ کو لئے ہوئے پانی سے ابھرا اور اسی تیزی کے ساتھ اپنی کشتی کی طرف بڑھا۔ کشتی تو ارڈالدینے کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے کشتی کو آہستہ سے پکڑا اور دوسرے کا سہارا دیکر اپنے بوجھ کو کشتی پر لاد دیا۔ پھر خود بھی چڑھ آیا چڑھنے کے فوراً بعد اس نے اس بوجھ کو جو ایک انسانی نعش تھی الٹ دیا۔ دریا کا تمام پانی جو اس کے پیٹ میں چلا گیا تھا منہ کے راستے خارج ہوگیا اور پھر وہ اس کو اپنے زانو پر لے کر بیٹھ گیا۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ سمندر کی ملکہ ہے جو موتیوں کی چمک، سمندر کی شفاف ترین سیپن اور لہروں کی نزاکت کا دلفریب مجموعہ ہے۔ یا جنت کی حور جو بلندی سے گھبرا کر گہرائیوں کا لطف اٹھانے کے لئے دریا میں چلی گئی۔" یہ تھے حامد کے تاثرات جو نتیجہ تھے اس مبہم کی دید کا۔ جس سے بھیگے ہوئے کپڑے چمٹ رہے تھے اور جس سے نور کی ہزاروں شعاعیں چھن چھن کر فضا کو رنگین سے رنگین تر بنا رہی تھی۔ اس کے بال آپس میں الجھے ہوئے تھے جن میں پانی کے ننھے ننھے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کے پتلے پتلے زرد ہونٹ آب نیساں کی منتظر سیپی کی طرح تھے تھوڑے سے کھلے ہوئے تھے۔ اور تھرتھرا رہے تھے کونپلوں کی سی ابھری ہوئی بڑی بڑی بند آنکھوں کے کنارے پر کالی جھالر سی لگی ہوئی تھی۔

حامد اس مجموعہ رنگ و خوبی۔ اس اجتماع حسن و شباب و ناز و ادا کی اس حسین ترین آمیزش کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اور کچھ سوچتا رہا...

نزدیک اس وقت خدائی، خودی اور سب کچھ فنا ہو چکا تھا صرف ایک ہیجان سی نغش تھی جو وسیع ہو کر اس کی ساری دنیا پر چھا کر رہ گئی تھی۔ وہ بت کی طرح نغش کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تار نظر چہرہ پر کسی چیز میں چمٹ کر رہ گیا ہے اور شاید کبھی نہ چھوٹے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چونکا۔ وہی خاموشی۔ وہی سکوت اور وہی کرنیں۔ صرف فرق اتنا تھا کہ کرنیں اس مرتبہ زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھیں اور چاند کی چادر پہلے سے زیادہ ضیا بار۔

اس نے اپنے بوجھ کو اٹھایا اس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ دل میں ایک قسم کی کپکپی سی پیدا ہو گئی لیکن اس نے فوراً ہی اسے دوسری طرف رکھ دیا اور خود جلد جلد کشتی کھینے لگا تھوڑی دیر کے بعد وہ کنارے پر پہنچ گیا۔ کشتی باندھنے کے بعد اس نے نعش کو اٹھا کر ریگ کے ذروں پر رکھ دیا جو زمین پر ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ حامد نے اس کا ہاتھ پکڑا جو کچھ گرم تھا نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ چہرہ پر سرخی آ رہی تھی۔ زرد ہونٹ گلابی ہو رہے تھے جیسے کوئی بہت تکلف کے ساتھ ان پنکھڑیوں میں گلابی رنگ بھر رہا ہو۔ حامد نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر آہستہ سے دبائے پھر انھیں دیکھا۔ پھر حامد اپنے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے بدن کا سارا خون کھنچ کر ہونٹوں میں آ گیا ہے اور وہاں سے سمٹ کر نکل جانا چاہتا ہے ایک لمحہ کے لئے وہ ایسی دنیا میں پہنچ گیا جہاں ہوش و حواس، عقل و خرد جیسے الفاظ بے معنی ہیں اس کی آنکھیں چاند اور اس کی ہر ہر کرن کو رقصاں دیکھ رہی تھیں۔ وہ دیر تک اپنے ہونٹوں کو ان ہاتھوں سے الگ نہ کر سکا۔ پھر نعش میں ایک جنبش ہوئی۔ حامد نے گھبرا کر فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے دیکھا کائنات کی ساری تجلیاں ایک دم عریاں ہو گئیں اسے ایسا معلوم ہوا جیسے قدرت نے تڑپتی ہوئی بجلیوں پر پردہ ڈال رکھا تھا پھر ایک دم اسے اٹھا لیا۔ اس کے سینہ کا عمیق ترین قطرہ بھی اپنی جگہ تھرا گیا۔ اس کی خوبصورت پلکیں جو پہلے ایک دوسری سے ملی ہوئی تھیں اب مقابلہ کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ حالانکہ ان سے نقاہت ظاہر ہو رہی تھی لیکن پھر بھی گرمیٔ نظر حامد کے لئے کافی سے زیادہ تھی اس نے تھوڑی دیر حامد کے چہرے کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر آنکھیں بند رہیں۔ اب اس کے چہرے سے صرف کمزوری ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھولیں اور نظر بھر کر حامد کو دیکھا۔ "میں کہاں ہوں؟" ایک لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"آپ بالکل محفوظ ہیں" حامد نے کہا۔

"تھوڑی دیر تک فضا میں سکوت رہا۔" مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں دریا میں گری تھی" اس نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن اب آپ کنارے پر ہیں" حامد نے جواب دیا۔ اگر آپ تکلیف محسوس نہ کریں تو کھڑی ہو کر تھوڑی دور چلئے شاید آگے کوئی سواری مل جائے" اس نے حامد کی طرف دیکھا کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھا حامد نے بھی دیکھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے دو بجلیاں ٹکرا گئی ہیں۔ بڑھتے ہوئے دو سمندر مل گئے ہیں دونوں کی نگاہیں الگ ہو گئیں۔ حامد چاند کو دیکھنے لگا اور وہ ریت کے ذروں کو۔

وہ اٹھی اور کھڑی ہو گئی حامد اس کو سہارا دیکر آگے بڑھنے لگا۔ وہ سڑک پر آیا چاروں طرف موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان عالیشان مکانوں کے رہنے والے کسی کے خوف سے بھاگ گئے ہیں۔ حامد اس کو لئے ہوئے تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا وہ چوراہے پر پہنچ گیا تھا وہاں ایک یکہ والا اونگھ رہا تھا حامد نے ذرا زور سے یکہ والے سے کہا "اندرا ہوٹل چلو گے؟" وہ چونک پڑا اس نے حامد اور اس کے ساتھی پر ایک نگاہ ڈالی جس سے شک و شبہ ٹپک رہا تھا۔ "کہاں حضور؟" اس نے پوچھا حامد نے کہا "اندرا ہوٹل۔ اے۔ بی روڈ پر" یہ سننے کے بعد بھی وہ ایک منٹ بیٹھا رہا پھر کہنے لگا۔ "بیٹھ جایئے حضور" کہتے ہوئے وہ آگے بیٹھ گیا۔ حامد نے سہارا دیکر اسے یکہ پر بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اندرا ہوٹل پہنچ گئے۔ حامد اس وقت اس سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا اس لئے اسے ایک کمرہ میں پہنچا کر اس نے کہا۔ "اب آپ آرام کیجئے ہم صبح پھر ملیں گے" اس نے حامد کی طرف دیکھا جس میں نسوانی پندار کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ حامد کمرہ بند کر کے چلا آیا۔ اور ایک دوسرے کمرہ میں سو رہا۔

علی الصباح اٹھ کر حامد دروازے پر پہنچا اس نے کواڑ پر ہاتھ مارا تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا اور حامد اندر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس مطلع چاند کی طرح چمک رہی ہے جو آدھی رات کی خاموشی میں ضیا بار ہو

کرسے- اس کے چہرے سے اطمینان ہیرے کی کرنوں کی طرح ظاہر ہو رہا تھا۔
اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے حامد پر نظر کی۔ پھر دوسرے ہی لمحہ میں اس کی نظریں گرے ہوئے تیر کی طرح نیچے آ رہیں۔ حامد ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ ایک پلنگ پر۔

"آپ کو ابھی کچھ دیر اور یہاں رہنا ہوگا۔ میں شہر جا رہا ہوں چند گھنٹے کے بعد واپس آکر آپ کو بھی لے جاؤنگا۔" حامد نے کہا۔

"آپ میری وجہ سے کیوں تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ مجھے میری قسمت ہی پر رہنے دیجئے"۔ اس نے ایک عجیب مایوسانہ انداز میں کہا۔

حامد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن وہ "یہ باتیں بعد کے سننے کی ہیں" کہتا ہوا کمرہ سے باہر چلا آیا۔

حامد دراصل ایک مکان تلاش کرنے کی غرض سے چلا آیا تھا حالانکہ وہ اپنے والدین کے ہمراہ کانپور ہی میں رہتا تھا۔ لیکن وہ اسے اپنے گھر لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کو اب تک کچھ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کون ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور کیوں ڈوب کر جان دینا چاہتی تھی۔ وہ اس وقت طالبعلمی کی زندگی بسر کر رہا تھا اس لئے اتنا خود مختار بھی نہ تھا کہ والدین کی ناراضگی کی پروا نہ کرے ان وجوہ کی بنا پر اس نے مناسب سمجھا اسے اپنے اعزہ کی نظروں سے چھپا کر کسی علیحدہ جگہ رکھے۔

اس نے تین چار گھنٹے میں شہر کے مختلف حصے دیکھ ڈالے اور پھر ایک مکان پسند کیا جو اس کے اپنے گھر سے کافی دور تھا۔ حامد اس کو اس نئے مکان میں لے آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب دونوں اطمینان سے بیٹھے تو حامد نے کہا "میں ابھی تک یہ بھی نہ جان سکا کہ مجھے کس کی مہمانداری کا شرف حاصل ہے"۔

"ایک غریب کی، ایک بیکس کی، ایک ایسی ہستی کی جس کو زمانے اور قسمت کے تھپیڑے پیس کر فنا کر دینا چاہتے ہیں"۔ اس نے دردبھری آواز میں کہا۔

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ بلکہ میں آپ کا نام معلوم کرنا چاہتا تھا" حامد نے پھر کہا۔

"مجھے جمیلہ کہتے ہیں"۔

"کتنا اچھا نام ہے جمیلہ!" حامد نے کسی قدر آہستہ سے کہا وہ شرما گئی اس کے خوبصورت گلابی گال اور گلابی ہو گئے جن پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

حامد نے کہا۔ "میں یہ نہ سمجھ سکا کہ قدرت کا یہ شاہکار دنیا ئے شباب کی ساری رعنائیاں لئے ہوئے پردہ آب میں کیوں روپوش ہو رہا تھا؟"

جمیلہ نے اوپر نگاہ کی۔ حامد کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے تار نظر میں شراب کے چھوٹے چھوٹے دھارے چل رہے ہوں۔ جمیلہ نے کہا "یہی وہ داستان ہے جو قسمت نے صرف مجھی کو بیان کرنے کے لئے سونپی ہے جس کا ہر لفظ ایک مستقل عذاب ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اسے پوری طرح بیان بھی کر سکونگی یا نہیں"۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ حامد بھی کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے خود ہی کہا۔

"میں ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتی ہوں جس کا شاید آپ نام بھی سننا گوارہ نہ کرینگے۔ بہرحال جب میں اپنے کو عریاں کر رہی ہوں تو پوری طرح عریاں کر دونگی۔ میں اس سوسائٹی کی ایک ممبر ہوں جسے شاہد بازاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میں نہیں جانتی میری ماں کون تھی لیکن ایک عورت جسے دنیا میری بہن کہتی ہے لکھنؤ کی ایک مشہور طوائف ہے میں اسے عورت کہہ رہی ہوں حالانکہ اسے کچھ اور کہنا چاہیئے تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے خلوتکدے کی ہر آرائش داستان ہے مایوسیوں کی۔ ناکامیوں کی۔ خون کے ان چند قطروں کی جو ٹپک کر خاک میں مل جاتے ہیں۔ میں ہزاروں ایسے انسانوں کو جانتی ہوں جن کی راتیں کبھی گل بداماں اور بہار ساماں ہوا کرتی تھیں اب وہ قبر کی طرح تاریک اور صحرا کی طرح بھیانک ہیں۔ کبھی وہ عالیشان محلوں کے پرتکلف کمروں میں پانوں کی ہلکی ہلکی جھنکار اور رادگنوں کے نغمے سنا کرتے تھے اب سڑکوں پر کتوں کی آوازوں کا جائزہ لیا کرتے ہیں۔

میں اپنے کو اس دوزخ کے بے پناہ شعلوں سے بچانا چاہتی تھی لیکن میری نام نہاد بہن کے ظالم ہاتھ مجھے اس میں دھکیل رہے تھے میری یہ زندگی سخت کشمکش و آزمائش کی زندگی تھی لیکن ناکامیاب میری بہن کے ناپاک ہاتھوں نے مجھے گناہ و معصیت کے عمیق سمندر میں پھینک دیا اور میں اس میں ایک ناتجربہ کار تیراک کی طرح غوطے کھانے لگی۔

کل میں دولت کی ایک عظیم قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لئے یہاں لائی جا رہی تھی۔ میری بہن اور ایک دوسرا آدمی جو ہمارے ساتھ

...سے مقابلہ کر کے تھک کر لیٹ گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد سو گئے۔ میں اٹھی۔ کھڑکی سے سر نکالا۔ میں نے دیکھا کہ ٹرین اپنی پوری رفتار سے جا رہی ہے۔ گاڑی کی تیز روشنی میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک پُل چمک رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی میں نے اپنا سر اندر کر لیا۔" قدرت بہت کم ایسا موقع دیتی ہے۔ دریا کی موجیں میری ناشاد زندگی اور دنیا کی ہوسناک خواہشوں کو پوری طرح چھپا لینگی" یہ خیال میرے دماغ میں آیا اور میں اپنی غم آفریں زندگی فنا کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ اپنی بہن پر ایک نظر ڈالی۔ جس میں نفرت سے زیادہ محبت تھی۔ اب میں نے اپنا سارا جسم کھڑکی کے باہر کر لیا۔ اس وقت اگر فضا سے ریل کا شور نکال لیا جاتا تو اس میں موت کے سنانے کے سوا کچھ بھی نہ رہ جاتا۔ گاڑی اب پُل پر آ گئی تھی میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سینے کو پھاڑ کر نکل جائیگا۔ جب ریل پل کے عین وسط میں پہنچی۔ میں نے دریا کی خاموش لہروں کو دیکھا۔ دل میں اک جوش پیدا ہوا اور میں اپنی پوری قوت سے کود پڑی میں نہیں جانتی اس کے بعد کیا ہوا؟"۔

یہ کہہ کر جمیلہ خاموش ہو گئی۔ اس کی نگاہ موٹی موٹی آنکھوں سے نکل کر لانبی لانبی پلکوں سے چھنتی ہوئی سامنے ایک گلدان پر پڑنے لگی۔

"ان تمام باتوں کو فراموش کر دیجیے۔ دنیا اسی کا نام ہے"۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد حامد نے پھر کہا۔ آپ نے اب آئندہ کے لئے کیا سوچا ہے"۔ ایک مرتبہ پھر دو شہابی ستارے چمکنے لگے جمیلہ کی بڑی نگاہیں اوپر اٹھ آئیں جس میں نسوانی پندار کے ساتھ ہی ساتھ ایک عاجزانہ نسائیت بھی تھی۔ اس نے کہا۔ "میرا مستقبل اندھیری راتوں کی طرح سیاہ یا پھر عنقا کی طرح معدوم ہے۔ میرے نزدیک مستقبل کچھ بھی نہیں۔ ماضی و حال کے افسانوں نے مجھے مستقبل سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اب میں زیادہ دن تک زندہ رہ کر دنیا کے گناہوں میں اضافہ نہ کرونگی"۔ وہ خاموش ہو گئی۔ حامد نے جواب دیا۔ "میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ جمیلہ یہیں رہے۔ حامد کے پاس رہے اس کی آنکھوں میں رہے جمیلہ"۔ حامد نے جملے کی نسبت آہستہ سے کہا۔ "میری دنیا سمٹ کر تمھاری ذات میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے جمیلہ میں نہیں جانتا ان جذبات کا اظہار کس طرح کروں۔ جو میرے سینے کو شق کئے دے رہے ہیں۔ جمیلہ یہ وہ الفاظ نہیں ہیں جو تم اپنے بالاخانے پر دن میں معلوم نہیں کتنی مرتبہ سنا کرتی تھیں۔ بلکہ یہ ایسے دل سے نکل رہے ہیں جس کا ہر قطرہ محبت کا سمندر ہے۔ جمیلہ اس وقت تیری ہاں یا نہیں میرا روشن یا بھیانک مستقبل بن کر رہ جائیگی"۔

اتنا کہہ کر حامد خاموش ہو گیا اب اس کی ملتمیانہ مگر بیتاب نظریں جمیلہ کے رنگین چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جمیلہ نے کہا "حامد تم جانتے ہو میں کون ہوں۔ وہ جس کی عزت چاندی کی چمک میں پوشیدہ ہوتی ہے اور جس کے حسن کا راز زرق برق ملبوس کی حسین ترین تراش خراش میں چھپا ہوتا ہے۔ حامد اگر موتی کوڑیوں کی تمنا کرنے لگے تو وہ کتنا مضحکہ خیز ہے۔ دنیا میں کوئی بھی مخمل میں گاڑھے کا پیوند نہیں لگاتا۔ اور اگر ایسا کر بھی دیا جائے تو گاڑھا کبھی مخمل نہ کہلائے گا"۔

"جمیلہ یہ نمک پاشیاں ہیں۔ ان ہونٹوں سے تو پھول برسنے چاہئیں"

"حامد سوسائٹی ہر اس شخص کو ذلیل سمجھتی ہے جو کسی ذلیل ہستی پر نگاہ ترحم ڈال دے۔ کیا تم جانتے ہو تمھاری یہ جسارت تمھارے والدین برداشت کر لیں گے یا تمھارے دوستوں اور عزیزوں کی نظروں میں قابل تعریف ہو گی۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتی"۔

"کچھ بھی ہو۔ سوسائٹی جمیلہ کو اب میرے ہاتھوں سے نہیں چھین سکتی"۔ حامد نے یہ جملہ اتنے استقلال سے کہا کہ جمیلہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

اب جمیلہ حامد کے پاس اسی مکان میں رہنے لگی۔ حامد دن کا بڑا حصہ کالج کے علاوہ جمیلہ کے گھر میں گذارتا تھا۔ لیکن رات کو وہ زیادہ تر اپنے والدین کے گھر سوتا تاکہ یہ معاملہ اس کے اعزہ کو معلوم نہ ہو جائے اس کے دوست احباب بھی اس قصے سے ناآشنا تھے۔

حامد کالج کے بعد جمیلہ کے پاس آتا آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاتا۔ پھر اندر داخل ہوتا۔ زنجیر پکڑے ہوئے جمیلہ کی حسین مگر معصوم مسکراہٹ دیکھ کر اس کا دل اس پھول کی طرح کھل جاتا جسے صبح کی ہوا گدگدا گئی ہو وہ گھنٹوں اس کے ملکوتی نغمے سنا کرتا۔ پہروں اس سے میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا۔ اس کے وقت کا بڑا حصہ اس کی کالی کالی لٹوں اور عقیق کے تراشے ہوئے ہونٹوں سے کھیلنے میں گذرتا۔ وہ کبھی اس کی آنکھوں میں رنگ شہاب بھرتا۔ پھر خود ہی اسے کھینچنے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ سراپا ناز نظر آتا اور کبھی سرتاپا نیاز۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں زیادہ

پرستش کرتے تھے۔ ہر ایک اپنی جگہ دیوتا بھی تھا اور پجاری بھی۔ جمیلہ کی ساری دنیا حامد بن کر رہ گئی تھی اور حامد کی ساری کائنات ایک سرو قد میں منتقل ہو گئی تھی۔ ان کے دن بہار کی لطیف صبحوں اور برسات کی حسین راتوں کی طرح گذر رہے تھے۔

حامد کے والد کچھ دن تک اس تمام قصے سے بے خبر رہے۔ لیکن حامد کا دن دن بھر گھر میں نہ آنا اور کبھی کبھی راتوں کو بھی غایب رہنا ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے ان کے دل میں شبہ پیدا کر دیا۔ وہ حامد کی نقل و حرکت کی نگہداشت کرنے لگے اور آخرکار انھوں نے پتہ چلا لیا۔ وہ قدیم خیال کے انسان تھے۔ یہ معلوم کر کے انھیں بیحد صدمہ ہوا۔ پھر یہ خیال تو ان کے لئے روح فرسا تھا کہ اب وہ فخر کے ساتھ لوگوں کے سامنے یہ نہ کہہ سکیں گے "میرے خاندان میں کبھی کوئی کم ظرف لڑکی نہیں لی گئی"۔ ان کا سر جھک جائیگا جب دنیا یہ کہے گی کہ حامد نے ایک طوائف سے شادی کر لی۔ وہ پہلے حامد کو فرشتہ سے زیادہ معصوم سمجھتے تھے لیکن اب ابلیس کی طرح راندۂ درگاہ۔

ایک صبح حامد کے پاس پیغام آیا کہ اسے والد صاحب بلا رہے ہیں یہ اس کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ وہ فوراً ان کے پاس چلا گیا۔ جس وقت کمرہ میں داخل ہوا اس نے اپنے باپ کا خشونت آمیز چہرہ دیکھا جو بالکل غیر متوقع تھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لیکن وہ اپنے پیر دیکھتے ہوئے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے باپ نے کہا۔

"حامد معلوم نہیں تم آج کل کیا سے کیا ہوئے جا رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دن دن بھر کہاں غایب رہتے ہو۔ راتوں کو بھی تمھارا پتہ نہیں چلتا۔ گھر میں کھانا وغیرہ بھی نہیں کھاتے ہو"۔ حامد کے والد کہہ رہے تھے اور وہ گھبرا رہا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا دماغ کسی شکنجہ میں کسا جا رہا ہے۔

"حامد تمھاری خاموشی بہت کچھ ظاہر کر رہی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمھاری تقریر بھی وہ کہے جو تمھاری خاموشی"۔ حامد اس عرصہ میں کچھ سنبھل چکا تھا۔ پہلے کی طرح اس کے چہرہ پر ہوائیاں نہیں اڑ رہی تھیں۔ لیکن پریشانی کو وہ کسی طرح چھپا نہیں سکا۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا "میں نہیں جانتا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں رات کو یہیں سوتا ہوں دن کو کالج میں رہتا ہوں جو تھوڑا سا وقت بچتا ہے وہ سیر وغیرہ میں صرف کرتا ہوں"۔

"حامد تم میری توقع کے خلاف جھوٹ بول رہے ہو۔ میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سرخ ہو گئیں۔

حامد نے کہا۔ "آپ جو کچھ سمجھ چکے ہیں وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے"۔

"بالاتر ہے۔ ذلیل لڑکے تجھے تو پیدا [illegible] ہوتے ہی مر جانا چاہئے تھا تاکہ شریفوں کی عزت پر دھبہ نہ لگتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ فرشتوں کے بھیس میں شیطان پرورش پا رہا ہے۔ ننگ خاندان تو نے اپنے باپ اور اس کے خاندان کی ساری تابانیاں بجھے ہوئے کوئلوں میں چھپا دیں ظالم تجھے تو ستارے توڑ لانے چاہئے تھے جو تجھے روشن سے روشن تر کرتے۔ اب بغیر کچھ سنے ہوئے میرا یہ فیصلہ ہے کہ یا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے بھول جا یا ہمیشہ کے لئے مجھے اور اپنے خاندان کو فراموش کر دے ان دو میں سے ایک چیز قبول کر لے اور ابھی"۔ ان کا چہرہ دہکتے ہوئے لوہے کے مانند ہو رہا تھا۔ حامد کا سر اب تک جھکا ہوا تھا۔ لیکن اب وہ اٹھا یہ بتاتے ہوئے کہ وہ بھی اسی باپ کا بیٹا ہے۔

"لیکن میں اسے نہیں چھوڑ سکتا"۔ اس نے ذرا تیز آواز سے کہا

"تو پھر اس گھر کو چھوڑ دے۔ اگر تو اسے نہیں چھوڑ سکتا تو میں بھی تجھے اپنا بیٹا نہیں سن سکتا"۔ ایک گرجتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی حامد کے والد اب کمرے کے باہر تھے۔ وہ وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ کہ اتنے میں اس کی ماں کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے کہنا شروع کیا "حامد! تم ایک شریف باپ کے سعادتمند بیٹے ہو۔ تم کو اپنے باپ کا کہنا ماننا چاہئے۔ ہم لوگوں کی کتنے دنوں کی زندگی ہے کہ ہمیں تکلیف دے رہے ہو تم کو زیادہ سمجھداری سے کام لینا چاہئے پھر یہ کہ دنیا میں لڑکیاں مفقود نہیں۔ شریف گھرانوں سے تمھیں حسین تر بیوی مل سکتی ہے۔ حامد تم اپنے باپ کا غصہ جانتے ہو۔ میری ہر طرح کی منت وسماجت بھی انھیں اپنے فیصلے سے نہیں ہٹا سکتی۔ پھر وہ صرف [illegible] نہیں کہینگے بلکہ اپنی جائداد سے بھی محروم کر دینگے۔ حامد [illegible] اس گھر کو چھوڑنے کے بعد کیا تم اپنی یہ مفید تعلیم جاری رکھ سکوگے۔ شاید تم ایسا ہرگز نہ کر سکو۔

حامد۔ ان سب باتوں کو نظر انداز [illegible]

کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ایک چھوٹی سی بات کے لئے تم اپنی ضعیف ماں کی خواہش سب سے پہلی مرتبہ ٹھکرا رہے ہو اور شاید یہ اس کی آخری خواہش ہو۔" آخری جملہ اس کی ماں نے اس درد کے ساتھ کہا کہ حامد کے آنسو نکل آئے اس نے اپنی ماں کی آنکھوں کی طرف دیکھا اس میں محبت و شفقت کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔

"اماں یہ میرے بس میں نہیں کہ کمان کا چھوٹا ہوا تیر واپس لے آؤں، ایک شریف ماں کا بیٹا اپنے وعدہ کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔" حامد یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کی ماں نے اسے بلانے کی کوئی کوشش نہیں کی ہاں اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

حامد جمیلہ کے پاس آیا۔ جمیلہ کو سب سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ حامد بھی غمگین ہو سکتا ہے۔ وہ اس کی مسکراہٹ کی عادی تھی آج اس نے رنجیدہ پایا تو گھبرا گئی۔ جمیلہ بے چین ہو رہی تھی۔ آخر اس نے حامد کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پوچھا۔ "حامد آج تم بہت رنجیدہ معلوم ہوتے ہو۔ بتاؤ تو آخر کیوں اتنے غمگین ہو۔"

اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگا۔ "جمیلہ! دنیا، خاندان اور رسم و رواج سب مل کر تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ آج والد صاحب کو سب قصہ معلوم ہو گیا۔ وہ بہت زیادہ ناراض ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یا تو تم کو چھوڑ دوں یا گھر سے چلا جاؤں۔ میں نے آخری چیز کو قبول کر لیا۔ اب اس وسیع دنیا میں حامد کے پاس جمیلہ ہے اور میں اسے کافی سے زیادہ سمجھتا ہوں۔"

"حامد تم میرے لئے اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ میں جتنے دن تمہاری خدمت کر سکتی تھی کر دی اب اجازت دو میں چلی جاؤں۔ حامد! سماج کے قوانین ہم کو ایک جگہ نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن اُف! میں تیرے نقوش کس طرح مٹا سکتی ہوں۔ نہیں نہیں، میں مٹانے کی کوشش کرونگی حامد میں تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤنگی۔" یہ کہتے ہوئے جمیلہ کے آنسو نکل آئے۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حامد نے کہا۔ "مجھے جو کچھ کرنا تھا کر چکا۔ جمیلہ حامد کی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ پھر مالک کی ملکیت اس کے سامنے کیوں بہا رہی ہو۔ پیاری ان سیپیوں کے موتی تو میرے سطح دل کے لئے ہیں نہ کہ تمہارے آنچل کے لئے۔"

حامد نے پھر کہا۔ "جمیلہ اب ہم کو مستقبل کے متعلق سوچنا چاہئے میں موجودہ حالت میں اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا اس لئے میں کالج سے کل ہی علیحدہ ہو جاؤنگا۔ میں اس شہر کو بھی چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ کسی دوسری جگہ چلیں گے اور وہاں اطمینان سے زندگی گزاریں گے" حامد اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ جمیلہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں گلاب کی خمیدہ پنکھڑیوں کی طرح ہو رہی تھیں وہ کہنے لگی۔ "حامد میرے لئے تم کیوں اپنے کو مصیبت میں ڈال رہے ہو۔ مجھے بھول جانے کی کوشش کرو۔ حامد بھول جاؤ۔ بالکل بھول جاؤ۔ گذری ہوئی زندگی ایک خواب تھی پھر کیا کوئی ہمیشہ خواب میں رہتا ہے۔ حامد مجھے جانے کی اجازت دے دو میں آج ہی تمہارے پاس سے چلی جاؤنگی۔"

"جمیلہ! تم کو ہر وقت جانے کی آزادی ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ میرے سب کچھ امکان میں ہے لیکن یہ نہیں کہ میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکوں یہ میرے آخری الفاظ ہیں جو میں تم کو چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کے متعلق کہہ سکتا ہوں۔" حامد خاموش ہو گیا۔ جمیلہ کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتی تھی کہ تم میری وجہ سے اپنے خاندان سے علیحدہ ہو لیکن اب تم نہیں مان رہے ہو تو جو مناسب سمجھو کرو۔"

دوسرے دن شام کو حامد اور جمیلہ دہلی چلے گئے۔ یہاں انہوں نے ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور رہنے لگے۔ حامد صبح سے نوکری کی تلاش میں نکلتا کارخانوں، دفتروں اور دکانوں کی خاک چھانتا اور شام کو ناکام گھر واپس آتا۔ چہرہ برگ خزاں دیدہ کی طرح پژمردہ ہوتا۔ جمیلہ بھی بدل چکی تھی اس کی ساری مسکراہٹ و شوخی کا فور ہی کی فضا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ اس سے حامد کا تھکا ہوا افسردہ چہرہ دیکھا نہ جاتا۔ وہ تلملا جاتی جب سوچتی کہ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا۔ وہ حتی الامکان حامد کی دلدہی کرتی۔ "نوکری مل ہی جائیگی۔ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہو؟"۔

"جمیلہ! میں نہیں جانتا کہ کل کہاں ملازمت تلاش کرنے جاؤنگا شہر بھر کی خاک تو آج چھان ڈالی۔" جمیلہ خاموش رہتی۔ اس بات کا اس کے پاس جواب ہی کیا تھا۔ حامد انتہائے زیادہ کوشش کرنے کے بعد بھی نوکری حاصل کرنے میں ناکامیاب رہا۔ اس کے پاس جو کچھ تھا وہ خرچ

ہوچکا تھا اب وہ اس اجنبی شہر میں مفلس و قلاش تھا آج اسے اور جمیلہ کو دو دن کا فاقہ تھا ان کے چہرے زرد ہو رہے تھے سینہ میں سے جو سانس نکلتی تھی وہ فضا میں سیاہ بادل بن کر رہ جاتی تھیں۔ حامد صبح کو تلاش معاش میں نکلا۔ آج اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ کئی جگہ سے مایوس ہونے کے بعد وہ گھر واپس آیا۔ جمیلہ ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اس کے چہرہ سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ مہینوں کی بیمار ہے بادام جیسی آنکھوں کو حلقوں نے گھیر لیا تھا۔ نگاہیں مردہ سی ہو رہی تھیں۔ اس نے زندگی میں بہت مصیبتیں اٹھائی تھیں لیکن یہ مصیبت اس کے لئے نئی تھی جس میں وہ پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ پھول تھی جس کو بہار کی ہوا ہی تر و تازہ رکھ سکتی تھی۔ باد سموم کا ایک جھونکا اسے مرجھا دینے کے لئے کافی تھا۔ حامد اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے اپنا منہ پھیر لیا لیکن پھر بھی جمیلہ نے دیکھ لیا۔ وہ تلملا گئی۔ آج سب سے پہلی مرتبہ اس نے حامد کی آنکھوں سے آنسو نکلتے ہوئے دیکھے۔ اپنا منہ اس نے حامد کے شانے پر رکھ دیا اور آہستہ سے بولی۔ "حامد پیارے"۔ اس کی آواز ستار کے نغمہ کی طرح تھرتھرا رہی تھی۔ "اتنے کیوں آزردہ ہوتے ہو؟" آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی ہاں حامد کے دامن پر موتی بکھرنے لگے۔ اس نے بے اختیار جمیلہ کو آغوش میں لے لیا۔ "جمیلہ مجھے جینے دو۔ اگر پنکھڑیاں مرجھا جائیں تو بلبل کے لئے مرنے کے سوا کیا چارہ ہے۔ اب تمہاری افسردگی تو دیکھی نہیں جاتی"۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ آنسو آنکھوں میں چھلنے لگے لیکن اس نے انہیں ایک آہ میں تحلیل کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد حامد پھر باہر چلا گیا وہ شام تک گھومتا رہا۔ رات کو وہ بے نیل مرام واپس آیا۔ اندر آیا تو اس نے جمیلہ کو نہیں دیکھا۔ وہ کمرے میں گیا۔ جمیلہ چارپائی پر پڑی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ حامد نے خیال کیا۔ بھوک نے اس پر غنودگی طاری کر دی ہے۔ وہ لالٹین جلا کر اندر آیا۔ جمیلہ ایک عجیب شان و ادا سے لیٹی تھی قدرت کی ساری رعنائیاں اس کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کے ہونٹ کسی قدر کھلے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ تھی جو کلی میں شگفتہ ہونے سے کچھ دیر پہلے ہوتی ہے لیکن اس کا چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح زرد تھا اور آنکھیں کسی قدر اندر دھنس گئیں تھیں۔ حامد بیٹھ گیا اس نے جمیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر فوراً اسے دیکھنے لگا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ بدن ٹھنڈے پسینہ سے تربتر ہو گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ اس نے فوراً اس کے رخساروں پر ہاتھ رکھا وہ بھی سرد تھے گھبرا کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ وہاں سکون تھا، ابدی سکون۔ حامد کی مسرتیں ایک لاش میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ وہ بیٹھا رہا۔ بالکل غیر متحرک۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ساحر نے اپنے سحر سے اس کمرے کی تمام اشیاء کو جامد کر دیا ہے وہ بہت دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور اس نے اپنی کائنات گود میں اٹھالی۔ نعش کو اٹھاتے ہوئے کوئی چیز پلنگ پر گری اس نے نعش کو پھر رکھ دیا اور اس چیز کو اٹھایا۔ وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا چند سطریں مرقوم تھیں۔

"حامد پیارے!

قدرت لکھ کرشاتی نہیں ہے، وہ انسانی طاقتوں سے کھیلتی ہے آج میں پھر وہ کر رہی ہوں جس سے تم نے ایک مرتبہ مجھے بچایا تھا۔ میری زندگی تمہاری مسرتوں میں پوشیدہ تھی پھر جب میں ان مسرتوں کو نہیں لا سکتی تو مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں حامد ہم لوگوں نے دنیا کے خاندانی فخر و امتیازات سے ایک جنگ لڑی اس کی ساری قوتیں برسرکار آئیں ہم کو شکست ہوئی لیکن لڑتے ہوئے —

پیارے میں تم سے جدا ہو رہی ہوں تمہارے ایک حسین تحفے کو سینہ میں لئے ہوئے۔ اسے میری قبر میں رکھ دینا اس وقت میری دو خواہشیں ہیں مجھے یقین ہے کہ تم انہیں ضرور پورا کرو گے ایک تو یہ کہ میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دوسرے جو میں نے کیا وہ تم نہ کرنا۔ پیارے میرا اسلام قبول کر لو۔ تمہاری جمیلہ"

حامد نے خط جیب میں رکھ لیا پھر اس نے نعش کے منہ سے ایک انگوٹھی نکالی اسے بھی جیب میں رکھ لیا اس نے لاش کو گود میں اٹھا لیا اور باہر سڑک پر نکل آیا کچھ دور تک وہ نظر آیا لیکن پھر رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

دہلی سے دور کوسوں دور سنسان جنگل میں ایک فقیر رہتا ہے جس کی چھوٹی سی کٹیا میں ایک قبر ہے۔ لوگوں نے بہت کم اسے قبر سے جدا دیکھا ہے۔ ہاں کبھی کبھی وہ گزرنے والوں کو پانی پلانے کیلئے ضرور دکھائی دیتا ہے۔ (ناہید)

گرمی کی دوپہر

حضرت علامہ شفق رضوی عمادپوری

بڑھا ساقیا برف کا اک گلاس
کہ گرمی کی ہے دوپہر اور پیاس
صراحی کوئی جھلکے شورے میں لا
بجھا آج دل کی لگی ساقیا!
پلا ٹھنڈی ٹھنڈی گلابی مجھے
کہ دوں ٹھنڈے دل سے دعائیں تجھے
دعا سوکھے ہونٹوں کی کرلے قبول
کہ مرجھائی کلیاں نہیں کھل کے پھول
یہ دنیا ہے ساقی سرابِ حیات
وہ مے دے جو بن جائے آبِ حیات

قیامت کی ہے دوپہر الاماں!
نئے سر سے ہے فصلِ گرما جواں
زمیں سے فلک تک ہے وہ التہاب
سوا نیزے پر جیسے ہو آفتاب
بنا ہے جو ہر کوہ آتش فشاں،
زمیں ہے تنور اور توا آسماں،
درختوں نے سائے میں لی ہے پناہ
اترنے کی ہے تہ میں پانی کو چاہ

یہ صرصر نے جھاڑی ہے دامن کی گرد
کہ پتے ہری جھاڑیوں کے ہیں زرد
حرارت سے ایسے تپے ہیں جبال
کہ پتھر بھی ہیں تاؤ کھا کھا کے لال
لہکتے ہیں سب ڈھاک کے پھول بھی
شرربار ہیں آک کے پھول بھی
شجر جلنے ہیں بن گئے ہیں چنار
جلی ڈالیاں بھی ہیں بے برگ و بار
جو مرجھائے صحنِ چمن کے ہیں پھول
وہ تھالوں میں شمع لگن کے ہیں پھول
پکار اٹھتی ہے العطش ہر کلی،
دکھاتی ہے سوکھی زبان پنکھڑی

پھلوں کا بھی گرمی سے ہے حال زار
جلائی ہوئی پھلجھڑی ہے انار
تپش سے یہ صورت ہے انگور کی
قلم خشک ہو جیسے بلّور کی
سراپا ہے داغی ہر اک سیبِ خام
بھنے جاتے ہیں بے پکے جل کے آم

پرندوں پہ بھی آپڑا ہے وبال
نشیمن پہ ہے دھوپ پھیلائے جال
چھپائے ہوئے آشیانوں میں سر
پڑے ہیں لپیٹے ہوئے بال و پر
کلیجے میں کوئل کے اٹھتی ہے کوک
تو منقار سے بھرتی پھرتی ہے کوک
فضا میں کہاں تاب پرواز کی
کہ آنکھیں نہیں کھلتیں شہباز کی

لبِ نہر بھی جلتے ہیں خشک کھیت
چھپائے ہے بجلی کو ذروں میں ریت
تری میں تو خشکی سے ہے انقلاب
کہ سوتوں کا بھی گرم ہے فرشِ خواب
تڑپتی ہیں موجیں نکالے زباں
کہ کانٹا ہوئیں سوکھ کر مچھلیاں

جو انساں ہوا اس وقت گرمِ سفر
مسافر عدم کا بنے الحذر

قطعہ

بہت ایسے بھی ہیں غریب الوطن
اٹھانے کو غربت کے رنج و محن
چلے ہیں پریشان گھر سے دہاں
قدم پھونک کر رکھے صرصر جہاں

نہیں ملتے ڈھونڈے کہیں ٹھنڈی چھاؤں
بھرے آبلوں سے ہیں مجروح پاؤں
بگولے سروں پر اڑاتے ہیں دھول
بچھاتی ہے رستے میں کانٹے ببول
نقاہت سے چلنے کی طاقت نہیں
یہ خطرہ کہ چھالے نہ ٹوٹیں کہیں

مکانوں کے وہ شہر والے مکیں
جو ہیں اپنے محلوں میں مسند نشیں
انھیں دیکھیں اس دوپہر میں ذرا
کہ ٹھنڈے ہیں یا گرم کرتے ہیں کیا
انھیں کیا ہو گرمی کے سہنے کی تاب
جنھیں فرشِ مخمل پہ آئے نہ خواب
چلے گرم جھونکے ہوا کے جہاں
تو شعلہ بنیں خس کی بھی ٹٹیاں
ہوا گرم ایسی ہوئی ناپسند
کیا اٹھ کے بجلی کے پنکھے کو بند
یہ کہہ کر محل سے ہوئے اٹھ کھڑے
کہ اس سے بھلے پھوس کے جھونپڑے

لکھوں کیا کڑی دوپہر میں شفیق
قلم کو بھی آنے لگا ہے عرق!

بائرن!

انگلستان کا رنگین مزاج شاعر

جناب چودھری محمد طفیل صاحب نیّر بی-اے بی ٹی

روچڈیل کا چھٹا لارڈ بائرن جارج گورڈن ۲۲ جنوری ۱۷۸۸ء کو بمقام لندن پیدا ہوا۔ وہ ایک ایسے خاندان کا چشم و چراغ تھا جس کے تمام افراد عشرت پسندی کی وجہ سے انگلستان میں عام شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس کا باپ کپتان بائرن جو دراصل اس لارڈ کا بھتیجا تھا جس کی وراثت میں جارج گورڈن کو جائداد اور خطابات ملے۔

کپتان جون نے ایک امیر کبیر عورت کیتھرین سے شادی کی جس کے بطن سے جارج بائرن پیدا ہوا۔ زچگی کی کسی تکلیف کے باعث اس کے ایک پاؤں میں کسی قدر نقص واقع ہوگیا۔ جو مدت العمر تک رہا اور جس نے اس کی زندگی کو قدرے تلخ بنا دیا تھا۔

۱۷۹۱ء میں جون قرضخواہوں کے پیہم تکرار اور تقاضوں سے تنگ آکر فرانس کی طرف بھاگ گیا۔ اور وہیں مرگیا۔ جارج بائرن اور اس کی ماں دونوں ایبرڈین میں چلے آئے اور اپنی جائداد کی آمدنی سے جو تقریباً ۱۵۰ پونڈ سالانہ تھی گذارہ کرتے رہے۔ ۱۷۹۸ء میں بائرن کے دادا (جو حقیقت میں اس کے باپ کا چچا تھا) لارڈ بائرن پنجم کا انتقال ہوگیا اس لئے جارج بائرن کے حصہ میں معقول جائداد آئی۔ لیکن چونکہ جائداد کا بیشتر حصہ لارڈ مرحوم کی بدعنوانیوں کے باعث رہن ہو چکا تھا اس لئے لارڈ کارلائل کو بائرن کا ولی قرار دیا گیا۔ تاکہ جائداد کی مناسب غور و پرداخت ہوتی رہے۔

اب بائرن کو تعلیم کے لئے ڈیوچ کے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ گو اس نے پڑھنے کی طرف چنداں دھیان نہ کیا لیکن اس کا ہیڈ ماسٹر اس کی ذہنی قابلیت کا اعتراف اکثر لارڈ کارلائل کے روبرو کرتا رہا۔

طالب علمی کے زمانہ میں بائرن کی محبت ایک قرابت دار لڑکی میری چاورتھ کے ساتھ ہوگئی۔ لیکن وہ ہمیشہ اس سے نفرت ہی کرتی رہی۔ میری کی شادی ایک اور شخص سے ہوگئی۔ مگر یہ شادی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ بائرن اپنی محبوبہ کی شادی کے بعد اس سے ملا تو اس کے دل پر الفت رفتہ کی یاد نے خاص اثر کیا اس وقت اس کے منہ سے بےساختہ نکل گیا۔ "اے زمانہ گذشتہ کی یاد! مجھے زیادہ مت ستا!"

۱۸۰۵ء میں بائرن ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخل ہوا باوجودیکہ اس کی ایک ٹانگ بچپن سے کمزور تھی وہ کالج کے کھیلوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا۔ وہ کشتی لڑنے اور نشانہ بازی میں خاص طور پر مشہور تھا۔ اس کی ماں نے اس کی زیادہ نگہداشت نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بائرن کا چال چلن بگڑ گیا۔ اب اس کا مستقبل روز بروز تاریک ہوتا گیا۔ جائداد پاس تھی۔ کوئی روکنے والا تھا نہیں۔ اس لئے جذبات سے مغلوب ہو کر عیش و عشرت کا غلام بن گیا۔ ساتھ ہی اسے شعر و شاعری کا شوق بھی ہوگیا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب اس کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ اس زمانے میں "لمحات فرصت" کے عنوان سے اس نے ایک نظم شایع کی جس پر اخبار "اڈنبرا ریویو" نے بڑے دل آزار انداز میں تنقید کی۔

بائرن بہت سٹپٹایا اور جھٹ سے ایک اور کتاب "انگریز شعرا اور سکاچ نقاد" کے نام سے لکھ کر چھپوا دی۔ اسلوب تحریر میں [illegible]

مزاج پرسی کی۔ اس میں ورڈزورتھ جیسے شہرۂ آفاق شاعر کو بھی
یا اور صاف لکھدیا" اس کی نظم نثر ہے اور نثر نظم ہے"۔ لیکن
ئرن ورڈزورتھ سے ملا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس لئے
ہ دوبارہ وہ کتاب شائع نہ ہونے دی۔

۱۸۰۹ء میں اس نے اپنے دوست کیم ہوب ہوس کی معیت
یپ کی سیاحت کی۔ لزبن۔ سیول۔ کیڈز۔ جبرالٹر۔ سارڈینیا
ر البانیہ سے ہوتا ہوا یونان تک چلا گیا۔ یونان میں ایک خوبصورت
ے عشق میں ایک نظم "ایتھنز کی دوشیزہ" لکھی۔ ۱۸۱۱ء میں
نان واپس آیا اور اپنے ایک دوست کے ہمراہ پہلی دفعہ "ہوس
ا رڈز" میں گیا۔ لندن میں رہ کر چائلڈ ہیرلڈ" کے پہلے دو حصے
ئے اس نظم کے شایع ہوتے ہی بائرن کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا
ہی دنوں میں وہ آسمان شہرت پر درخشندہ ستارہ بن کر چمکنے لگا
ے سیاستدانوں۔ خوبصورت عورتوں اور بہت سے ناواقف
کے ہزاروں تعریفی خطوط اس کی میز پر جمع ہوگئے۔ وہ لوگ جو
رتھ، کولرج اور ساوتھے جیسے شعراء کا کلام نہیں پڑھتے تھے
ڈ ہیرلڈ سے بہت محظوظ ہوئے۔

۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۶ء کی درمیانی مدت میں بائرن نے لندن
ٹی میں خاص شہرت حاصل کرلی۔ زیادہ تر چھوٹی چھوٹی نظمیں
لارا، کورنتھ کا محاصرہ وغیرہ اسکاٹ کے تتبع میں لکھیں اور
م ہمعصر شعرا کو مات کردیا۔ تمام لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول
س میں اعلیٰ نفس مضمون، خیالات کا تسلسل اور جذبات کا
یرہ سب خوبیاں تھیں۔ گو اس کی بندشیں چست نہیں لیکن
عار ایسے ہیں جو انسانی خون میں تحریک پیدا کردیتے ہیں اور
و انصاف کے لئے ضمیر کی آواز بلند کرتے ہیں۔

بائرن کی شاعری نے ایسے لاکھوں آدمیوں میں شعر فہمی کی
ت پیدا کردی جنھوں نے شعر کبھی پسند نہیں کئے تھے پروفیسر
ن برگ کہتا ہے کہ بائرن نے انگریزی شاعری میں نئی قسم کے تخیل کی
ی اور اس کا شمار ایسے نامور شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے
یب غفلت سے بیدار کیا۔

۱۸۱۵ء میں بائرن نے اپنی اسابیلا ملبنکی کے ساتھ شادی کی
لیکن وہ ایک ہی سال کے بعد اپنی ایک بیٹی آگسٹا ایڈا کے ہمراہ بائرن
کو چھوڑ کر فرار ہوگئی۔ اس کے جانے کی وجہ کسی کو معلوم نہیں۔ اب بائرن
سوسائٹی کی نظروں میں گر گیا۔ وہی لوگ جو اس کی پرستش کرتے تھے
اسے لعنت ملامت کرنے لگے۔ وہ ان حالات سے بہت گھبرا گیا اور اسی
گھبراہٹ میں اس نے لندن کو بھی خیرباد کہہ دیا۔

۱۸۱۶ء سے ۱۸۲۴ء تک بلجیم سے ہوتا ہوا سوئٹزرلینڈ پہنچا
وہاں وہ شیلے سے ملا۔ پھر وینس گیا جہاں اس نے ایک اطالوی نژاد دسامت
سے انقلابی پارٹی کی ممبری اختیار کی۔ جب یونان نے سلطان ٹرکی کے
خلاف علم بغاوت بلند کیا اس وقت بائرن جینوا میں رہتا تھا وہاں سے
یونان پہنچا اور جزیرہ آیونا میں آرہا یہاں اس نے ترکوں کے خلاف خوب
زہر چکانی کی اور یونانیوں کو ان کے خلاف بھڑکانے میں ساری شاعری ختم
کردی۔ لیکن جنوری ۱۸۲۴ء میں سولینگی کے مقام پر گیا جہاں وہ یونانیوں
کی باہمی نااتفاقی سے بہت پریشان ہوا کیونکہ انھوں نے اس کے رفاہ عام
کے کاموں میں مداخلت شروع کردی تھی۔

۲۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو وجع المفاصل کے عارضہ سے بیمار ہوکر مر گیا
اس کی بڑی خواہش تھی کہ سپاہیانہ موت مرے تاکہ عیاشی کا دھبہ اس کے
نام سے دھل جائے مگر اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی

بائرن عیش پرست تھا اور اس کی نفسانی خواہشات قوت ارادی
پر ہمیشہ غالب رہتی تھیں۔ لیکن وہ فطرتاً رحمدل، فیاض اور خلیق تھا ضرورتمند
مصنفین کی اکثر امداد کرتا تھا اس لئے نہیں کہ وہ ان پر احسان رکھنا چاہتا
چاہتا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ خود غریبی کی تکلیفوں سے آشنا تھا۔ اور
انسانی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر اس کے دل میں بھرا ہوا تھا۔
جب وہ وینس گیا تو وہاں بھی اس نے کچھ رقم خیراتی کاموں کے
لئے وقف کردی۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ نہ تو اس کی عیش پرستی
اور نہ بدنامی اس کے جوہر ذاتی کو ماند کرسکی البتہ اس نے کبھی کبھی دوستوں
اور ان کی معنوی منافقت کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار ضرور کیا جو
اس کی شایان شان نہیں تھا لیکن وہ [illegible]

[illegible]ت سے متاثر ہوکر اظہار رائے کیا۔ وہ نہ تو رومن کیتھولک خیال رکھتا [تھ]ا اور نہ پراٹسٹنٹ مگر بایں ہمہ وہ مذہبی معاملات میں بہت جوشیلا [تھ]ا۔ اس کی خامیوں اور بدعنوانیوں کے باوجود اس میں قابل تعریف [خو]بیاں بھی تھیں جن کو اس نے بُرے سے بُرے وقت میں بھی ہاتھ سے [ن]ہیں جانے دیا۔ وہ سچائی کو ہمیشہ جھوٹ پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ محبتی تھا [س]پاہی تھا اور ظلم سے نفرت کرتا تھا۔ انسانی آزادی کی خاطر وہ اپنا مال آرام اور جان تک کو قربان کر دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

شعرائے انگلستان میں بائرن کا مرتبہ بہت زیادہ بلند ہے۔ اس [ک]ی شاعری زیادہ تر رجز اور محاکات کی حامل ہے جس میں انقلاب پسندی کا عنصر اکثر جگہ غالب نظر آتا ہے اس کے اعلیٰ تخیل کی وجہ سے انیسویں صدی کے پہلے ربع میں تمام یورپ کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو گئی چونکہ وہ خود فریب و ریا سے متنفر تھا اور جو کچھ کرتا تھا علانیہ کرتا تھا اس لئے اسے یورپ کی رسمی تہذیب سے کھلم کھلا بغاوت کرنی پڑی۔ اگرچہ اس کے کلام سے ایسے احساسات کا اظہار ہوتا ہے کہ خود اس کا ضمیر انفعال کی تلخیوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ بایں ہمہ وہ کبھی اپنی ناشائستہ حرکات سے باز نہ آیا۔ اس کی صاف گوئی اور آتش بیانی نے اس کا سکہ مصروں پر بٹھا دیا۔ اقوام یورپ کے لئے بائرن کی شاعری مشعل ہدایت بن گئی کیونکہ وہ خود آزاد مسلک اور آزادی کا علمبردار تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم یا فرقے سے آزادی کے نام پر اپیل کی جائے تو دل میں اتر جاتی ہے۔ اٹلی اور یونان کی گذشتہ عظمت کو تازہ کرنا اس کا سرمایہ شاعری تھا۔ جب وہ ان الفاظ میں اپیل کرتا ہے کہ "اگرچہ خون پانی کی طرح بہنکلے گا اور آنسو کہر کی طرح چھا جائیں گے لیکن عوام الناس کامیاب ہونگے" تو انسانی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔

انگلستان چونکہ اپنے عمرانیات میں رجعت پسند واقع ہوا ہے۔ اور اپنی سیاسی، تمدنی اور اقتصادی حتیٰ کہ ادبی روایات سے لمحہ بھر کیلئے [illegible] پسند نہیں کرتا اس لئے بائرن اور اس کی شاعری سے زیادہ [illegible] اس کا یہی خصوصیت یہ ہے کہ کار لائل نے لوگوں کو پیغام [illegible] کرو۔

لیکن یہ امر واقع ہے کہ اس کا کلام انسانی جذبات میں انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کارہائے نمایاں کے لئے اکساتا ہے یعنی وہ محض تودہ طوفان یا بارود کی طرح بھک سے اُڑ جانے والی چیز نہیں بلکہ وہ کبھی نہ بجھنے والی آگ ہے جو خاموش ہو تو چقماق اور آتش زبان ہو تو شعلۂ جوالہ ہے۔

وہ جوش بیان میں مبالغہ نہیں کرتا اور نہ تسلسل اور دلائل کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے البتہ شیلے اور ورڈز ورتھ کی طرح مناظر قدرت سے بہت کم بہرہ اندوز ہوتا ہے اور ان کے سامنے سے آنکھیں بند کرکے گذر جاتا ہے۔ وہ خوبصورتی سے متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن چنداں تعریف کرنے کی بجائے جذبات سے کھیلتا ہے۔ اس کے اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زور بیان کے ساتھ ساتھ جذبات کو بھی شامل رکھتا ہے جو اس کی شاعری کو اور زیادہ موثر و کامیاب بنا دیتے ہیں۔

بائرن اس قدر خوبصورت تھا کہ آج تک انگلستان میں اس کا ثانی پیدا نہیں ہوا۔ والٹر اسکاٹ کہتا ہے۔ "وہ فرشتہ صورت تھا"۔ چارلس متھیو لکھتا ہے۔ "بائرن ہی ایک ایسا آدمی تھا جسے خوبصورت کہا جا سکتا ہے"۔ کولرج کہتا ہے۔ "اگر تم اسے دیکھ لیتے تو اس کی کسی بات سے انکار نہ کر سکتے اس کی خوبصورت آنکھیں چشمۂ آفتاب تھیں جن میں روشنی ہی روشنی تھی وہ ڈیکن کے دیوتا اپالو بلویڈیر کی نظیر تھا"۔ ان اقوال کی تصدیق بائرن کی تصویر سے ہوتی ہے۔

نمونہ کلام

ایتھنز کی دوشیزہ ۔ بائرن نے یہ نظم اس وقت لکھی تھی جب وہ پہلی دفعہ یونان گیا۔

— ۱ —

ایتھنز کی دوشیزہ! قبل اس کے کہ ہم دونوں جدا ہوں میرا دل مجھے واپس پھیر دے۔

لیکن چونکہ وہ میرے سینہ سے نکل چکا ہے۔

(اس لئے) اسے اب تم اپنے پاس رکھو اور آرام کرو۔

لیکن میرے جانے سے پہلے میرا پیغام سُن لو
"جان من! میں تم سے محبت کرتا ہوں"

— ۲ —

قسم ہے ان پریشان زلفوں کی
جن کے ساتھ یونان کی ہوا مَس کرتی ہے
قسم ہے ان آویزوں کی جن کے نیچے ہوئے کنارے
تمہارے پیارے آفریں نرم رخساروں کو چھوتے ہیں
قسم ہے تمہاری بڑی بڑی گول آنکھوں کی
"جان من! میں تم سے محبت کرتا ہوں"

— ۳ —

قسم ہے ان ہونٹوں کی جنھیں میں بوسہ دینا چاہتا ہوں
قسم ہے تمہاری نازک کمر کی
قسم ہے نشانی کے ان پھولوں کی جو ایسا پیغام سنا رہے ہیں۔
جسے الفاظ بھی اچھی طرح بیان نہیں کر سکتے
قسم ہے عشق کے عیش و رنج کی
"جان من! میں تم سے محبت کرتا ہوں"

— ۴ —

ایتھنز کی دوشیزہ! میں جا رہا ہوں
پیاری جب تم تنہا ہو تو اس وقت مجھے یاد کرنا
گو میں استنبول کو جا رہا ہوں
لیکن میرے دل و جان ایتھنز میں ہیں۔
کیا میں تم سے محبت کرنا چھوڑ سکتا ہوں؟ نہیں
"میری جان! میں تم سے محبت کرتا ہوں"

شلون کا قیدی ۔ یہ نظم اصل میں ایک قیدی کے اپنے خیالات پر مشتمل ہے۔ فرانسس بونی وارڈ کو (۱۴۹۳ء تا ۱۵۷۰ء) کسی شبہ کی بنا پر قید کر لیا گیا اور اُسے شلون کے قلعے میں رکھا گیا۔ لیکن خیال یہ ہے کہ یہ نظم کسی سیاسی غرض و غایت تحت فرضی نام سے لکھی گئی ہے بہر حال بہت دلچسپ ہے۔

یہ نظم اس قدر پُراثر اور پُردرد ہے کہ جیسے جیسے اسے پڑھتے جائیں قیدی کے ساتھ گہری ہمدردی ہوتی جاتی ہے۔ اور پڑھنے والا اس میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ آپ کو نظم کا ہیرو تصوّر کرنے لگتا ہے۔

میرے بال سفید ہو گئے لیکن بڑھاپے سے نہیں
(اور) نہ یہ سفید ہوئے ہیں ایک ہی رات میں
جیسا کہ انتہائی خوف و ہراس سے بعض لوگوں کے بال سفید ہو جاتے ہیں
میرے دست و پا بیکار ہو چکے ہیں
لیکن مشقت سے نہیں
بلکہ متواتر کئی سال تک بیکار پڑے رہنے سے

اور میری قسمت ان لوگوں کی طرح ہے۔
جن کیلئے ، اور گیتی کی آزاد ہوا سے لذت اندوز ہونا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔
لیکن یہ میرے والد محترم کے خیالات کی وجہ سے ہے۔
کہ میں پابزنجیر ہوں اور موت کا منتظر
میرے باپ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔
اس لئے کہ وہ اپنے اصول کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

ہم سات بھائی تھے
چھ بھائیوں نے اپنے باپ کی طرح داعی اجل کو لبیک کہا۔
جن میں سے یہ بیچارہ آخری ہے
شلون کے عمیق و قدیم زندان میں
میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے قید میں زندگی بسر کرتے کتنی مدت ہو چکی ہے
میں شمار نہیں کر سکتا۔
کیونکہ میں گنتی بھول گیا ہوں
جب میرے آخری بھائی نے نقاہت سے گر کر جان دی
میں اس کے پہلو میں زندہ گڑ گیا۔

آخر کار ایک دن چند آدمی
میرے لئے آزادی کی نوید جانفزا لائے
میں نے ان سے کوئی وجہ دریافت نہیں کی اور نہ کچھ پوچھا۔
کیونکہ میرے لئے آزادی اور پابندی برابر تھی
میں مایوسی سے محبت کرنا سیکھ گیا تھا
آخر کار وہ آئے اور میری تمام زنجیریں علیحدہ ہوئیں
زندان کی تمام دیواریں میرے لئے مقدس تھیں۔
اور میں نے یوں محسوس کیا کہ وہ مجھے میرے گھر سے جدا کرنا چاہتے ہیں

مجھے زنجیروں سے اُلفت ہو چکی تھی
کیونکہ دیر تک ایک ساتھ رہنے سے ہم دوست بن چکے تھے۔
میں نے آزادی کے وقت ایک سرد آہ بھری۔

نپولین بائرن نے یہ نظم نپولین بونا پارٹ کے قید ہونے کے موقع پر لکھی تھی۔ لیکن اس میں تعصب کا رنگ ہے کیونکہ دشمن جب شکست پا جائے تو اسے طنزاً اس طرح خطاب کرنا بائرن جیسے شاعر کی شان کے خلاف ہے۔

لیکن چونکہ یہ نظم ادبی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتی ہے اس لیے اس کا کچھ حصہ ذیل میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔

ہو چکی لیکن کل ہی تم بادشاہ تھے
اور زرہ پہنے ہوئے بادشاہوں کا مقابلہ کرتے تھے۔
اور اب تم ایک گمنام آدمی ہو
اس قدر ذلیل — مگر ابھی تک زندہ ہو
کیا یہ وہی آدمی ہے جو ہزاروں تختوں کا مالک تھا۔
جس نے ہماری سرزمین کو ہڈیوں سے بھر دیا تھا۔
اور کیا وہ باقی رہ سکتا ہے

فتح اور غرور

جنگ کی خوشی
نصرت کے آسمان شگاف نعرے
تمہارے لئے سرمایہ حیات تھے۔
تلوار، عصا اور حکومت
جن کی فرمانبرداری انسانی شیوہ ہے۔
جن کے بل بوتے پر تم مشہور ہوئے
غارتگری کے دیوتا تم نے دنیا کو تھرتھرا دیا۔
تمہارا دماغ کس قدر خراب ہوگا؟

تباہ کنندہ تباہ ہو گیا اور فاتح مفتوح۔
لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے! آج اپنے لئے ملتجی ہو۔

کیا اب بھی تمہارے دماغ میں شہنشاہیت کا خیال ہے۔ ۔ جو ایسے انقلاب کے بعد بھی تمہارے لئے تسکین کا باعث ہو سکے یا صرف موت کا خیال ہے
کیا تم شہزادوں کی موت مرنا چاہتے ہو یا غلامانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ جو کچھ بھی تمہارا فیصلہ ہوگا ایک نفرت انگیز جرات ہوگی۔

حیات جاوید۔ بائرن (یونان نہیں تو)

جاگ اے میری روح۔ سوچ اور غور کر جن کے ذریعے سے خون بحر حیات میں بہتا ہے۔ تازگی بخش جذبات کو پامال کر ڈالو۔ جوانی کی شان کے خلاف ہے۔ تمہارے لئے حسن کا غصہ اور مسکراہٹ (ہے)

اگر تم اپنی جوانی پر افسوس کرتے ہو تو کس لئے زندہ ہو؟ باعزت موت کی سرزمین نزدیک ہے — میدان کی طرف بڑھو اور جستجو کرو اس چیز کے پانے کی جس کی جستجو کم کی جاتی ہے۔

تمہارے لئے ایک سپاہی کا مرقد بہترین انجام ہے۔ اپنے ماحول کی طرف نظر کرو۔ اپنے لئے جگہ تلاش کرو۔ اور ہمیشہ کی نیند سو جاؤ۔

نیّر۔ امرتسری

غزل

از جناب جلال الدین صاحب اکبر

دنیا کا رنگ دیکھ کے بس آبدیدہ ہوں ! — انجام بیں نگاہ کا آفت رسیدہ ہوں !

صیادِ مرگ میری کمیں میں ہے رات دن — دشتِ عدم کا میں کوئی صیدِ رمیدہ ہوں

حسرت سے دیکھتا ہوں سوئے گردِ کارواں — ہستی کی رہ میں راہ روِ پا بریدہ ہوں

سنتا نہیں ہے کوئی مجھے گوشِ شوق سے — بزمِ جہاں میں حرفِ مکرر شنیدہ ہوں

دوشِ ہوائے شوق پہ ہر دم جو ہو خراب — میں گلشنِ وفا کی وہ بوئے رمیدہ ہوں

آفت رسیدہ دوست بھی آفت سے کم نہیں — اے دوست الحذر کہ میں آفت رسیدہ ہوں

اہل جہاں کے واسطے سربستہ راز ہوں ! — بالائے فہم ہوں میں طلسم آفریدہ ہوں

رَو میں بہائے جاتا ہوں ہر سنگ و خار و خس — میں وادیٔ حیات میں سیلِ رمیدہ ہوں

حسرت پرست گوشِ سخن آشنا ہوں میں — نغمہ ہوں دلنواز مگر ناشنیدہ ہوں

اکبر میں آشنا نہیں رنگِ بہار سے

باغِ جہاں میں نخلِ خزاں آفریدہ ہوں

سیکرٹریٹ ورکنگ سیزن کی کہانی

انتقام

ایک رومانی افسانہ

از جناب اوپندر ناتھ صاحب اشک بی۔ اے ایل ایل بی

—— ۱ ——

جس طرح بدلش کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی پہاڑی نالوں میں زندگی جاگ اٹھتی ہے اور وہ مسرت و انبساط سے اچھلتے کودتے دیوانہ وار بہہ نکلتے ہیں۔ اسی طرح شملہ کا موسم شروع ہوتے ہی پہاڑی پگڈنڈیوں میں جان سی آجاتی ہے۔ لمبی لمبی گھاس سے بھری ہوئی، برف باری سے مٹی ہوئی پگڈنڈیاں پھر زندہ ہو کر پہاڑوں پر ادھر ادھر نظر آنے لگتی ہیں اور پہاڑی لوگ جانی پہچانی پگڈنڈیوں کا سہارا لیتے ہوئے نئی راہیں نکالتے ہوئے شملہ میں وارد ہونے لگتے ہیں۔

ان دنوں شملہ پر جوبن آجاتا ہے۔ موسم سرما کا سکڑا ہوا شملہ اپریل اور مئی کی زندگی بخش دھوپ سے کھل جاتا ہے لیکن جہاں اس موسم میں شملہ مسرت و انبساط کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ وہاں پہاڑی دیہات پر اداسی چھا جاتی ہے۔ پہاڑی نوجوان روزی کمانے کی دھن میں شملہ کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ماں باپ بچوں سے۔ بھائی بہن سے۔ عاشق محبوب سے بچھڑ جاتا ہے۔ دیہات کی روح ان کے ساتھ ہی چلی جاتی ہے گویا شملہ کی زندگی دیہات کی موت بن جاتی ہے۔

اپریل کا آغاز تھا۔ میدان کی گرمی سے بچنے کے لئے شملہ کی ٹھنڈی اور فرحت بخش فضا میں پناہ لینے والے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ سرکاری دفتر یا آ گئے تھے یا آ رہے تھے۔ چاروں طرف سے زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ گویا مردے کے جسم میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔

شولی کے غریب پہاڑی بھی اپنے عزیز و اقربا سے جدا ہو کر آئندہ سردیوں کی گذر بسر کے لئے کچھ کمائی کرنے جا رہے تھے۔ لیکن سب یکسو ہو کر شملہ میں بال بچوں کو کیسے ساتھ لیجایا جا سکتا ہے۔ وہاں کا کرایہ اور دوسرے اخراجات کب اس بات کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ مرد تو خیر کسی نہ کسی جگہ پڑ کر گزارہ کر سکتے ہیں لیکن عورتیں اور بچے۔ ان کے لئے تو گھر چاہئے۔ دال روٹی چاہئے، کپڑا لتا چاہئے۔ اسی لئے سب بھرے دلوں کے ساتھ جدا ہو رہے تھے۔ باپ اپنے بچوں کو ہنس ہنس کر پیار کرتا تھا لیکن آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ خاوند اپنی بیوی سے مسکراتا ہوا الوداع کہہ رہا تھا لیکن سینے پر پتھر رکھے ہوئے۔ عاشق اپنے محبوب کو تسلی دیتا ہوا رخصت لے رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ اس تسلی کی حقیقت خود اس کے چہرے سے عیاں ہے۔

فرقت کے لمبے دنوں اور ہجر کی طویل راتوں کا تصور خود اس کے دل کو بیقرار کئے دیتا تھا۔

شولی خالی ہو رہا تھا۔ کل بر جو گیا آج پرتو گیا۔ سب جا رہے تھے صرف وہی گھر پر رہ گئے تھے جن کے جسم شب و روز کی محنت کے بعد اب تھک گئے تھے۔ یا وہ جن کی گھر پر ضرورت تھی۔ ورنہ سب پہلے پہلے اچھی جگہ حاصل کرنے کے خیال سے بھاگے جا رہے تھے ایک دوسرے سے پہلے پہنچ جانا چاہتے تھے۔ صرف بدری اب تک پہاڑی پگڈنڈیوں کے نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ یا نہیں گیا تھا کانشی۔ وہ بھی ابھی تک گاؤں میں مارا مارا پھرتا تھا۔

اپنے رشتہ داروں کی نظروں میں دونوں بیکار وقت ضائع کر رہے تھے لیکن وہ بیکار نہ تھے۔ محبت کے میدان میں گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ پچھلے سال بدری بازی لے گیا تھا اور اس دفعہ کانشی بدری چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اور کانشی فاتح سپاہی کی طرح جامے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ ایک کی دنیا جنت تھی دوسرے کی جہنم۔

—— ۲ ——

اونچی اونچی پہاڑیوں کے دامن میں نالہ شور کرتا ہوا بہہ رہا تھا گو

اپنے دیوتاؤں کے پاؤں دھوکر اپنا جنم سپھل کر رہا ہو۔ اوپر وادی میں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی جھونپڑیاں چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کی آنکھوں سے پانی کی اس شوخی چلبلی کا نظارہ کر رہی تھیں۔ شام نے ٹیسو کے رنگ کا دوپٹہ اوڑھ لیا تھا اور اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے چھوٹی چھوٹی پہاڑی گائیں بستیوں کو لوٹ رہی تھیں۔ دور کسی جگہ کوئی کمسن پہاڑی لڑکا اپنی بنسری کی میٹھی لیکن درد بھری آواز میں ان پہاڑوں کی طرح پرانا کسی فرقت کی ماری پہاڑی نازنین کا درد بھرا گیت الاپ رہا تھا۔ جس کا مطلب کچھ یوں تھا۔

"اے برہمن کے لڑکے شملے نہ جا

بے وفا

شملے نہ جا"

سورجو نالے کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔ اُس کا سر جھک کر گھٹنوں سے لگ چکا تھا۔ بے خودی میں وہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھا کر نالے میں پھینک رہی تھی۔ بنسری کی میٹھی پُرسوز آواز اس کے دل کو پانی سا کر آنکھوں کے راستے بہا رہی تھی۔ اور دھیرے دھیرے وہ اپنے دل میں دوہرا رہی تھی "شملے نہ جا۔ بے وفا۔ شملے نہ جا"

کانشی جھاڑی میں چھپا بیٹھا تھا۔ آج اسے جی بھر کر دیکھ لینا چاہتا تھا مدت سے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا لینا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی آنکھوں میں بٹھا لینا چاہتا تھا۔ اپنے دل میں چھپا لینا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے بعد آنکھوں کی بینائی ہی جاتی رہے۔ دل کی دھڑکن ہی بند ہو جائے۔ سورجو ایک بار سر اٹھائے تو وہ اس صورت کو۔ اس من موہنی صورت کو۔ جی بھر کر دیکھ لے۔ کون جانے پھر یہ دلفریب صورت کب دیکھنی نصیب ہو۔ ابھی دل کے ارمان نکال لے۔ من کی سادھ پوری کر لے۔ سورجو کے سامنے اس کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ وہ آنکھ اٹھا کر دیکھ نہ سکتا تھا۔ مالک کی موجودگی میں چوری کون کر سکتا ہے۔ چھپ کر سب کچھ لوٹا جا سکتا ہے۔

کتنی ہی دیر تک وہ اسی انتظار میں بیٹھا رہا۔ لیکن سورجو نے سر نہ اٹھایا۔ کانشی کی حسرت نہ پوری ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں نالے میں گرتی تھیں اور کسی آواز کے باعث پانی کے بہاؤ میں گم ہو جاتی تھیں۔ ان کمزور انسانوں کی طرح جو کسی آواز کے بغیر موت کے دریا میں بہہ جاتے ہیں)۔ آخر وہ آگے بڑھا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے

سورجو کے کندھے کو چھوا۔ روتے ہوئے چہرے نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی اپنی آنکھوں سے ندیاں رواں ہو گئیں۔

"تم رو رہی ہو سورجو؟"

"تم رو رہے ہو کانشی؟"

اور دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔
وہ کمسن لڑکے نے پھر گیت الاپا جس کا مطلب کچھ یہ تھا۔

"اے برہمن کے لڑکے شملے نہ جا

بے وفا

پردیس میں تو مجھے بھول جائیگا

بے وفا

شملے نہ جا"

سورجو نے کانشی کی طرف دیکھا۔ گویا اس کا جواب پوچھ رہی ہو اور بنسری والا لڑکا بنسری جیسی میٹھی آواز میں گا رہا تھا۔ کچھ اس طرح کے مطلب کا گیت۔

اے برہمن کی لڑکی گھبرا مت

میری جان

تجھے بھولنا جی سے گزر جانا ہے

میری جان

گھبرا مت؟

کانشی نے سورجو کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہے یہی میرا جواب ہے سورجو مسکرا اٹھی اور پھر دونوں بیساختہ لپٹ گئے۔ جدا ہوئے اور پھر لپٹ گئے۔ اور اس کے بعد چھوٹے چھوٹے پودوں اور جھاڑیوں سے الجھتے۔ کنکر پتھروں سے ٹھوکریں کھاتے۔ پہاڑ کی چوٹی پر بسے ہوئے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت عقب کی جھاڑی سے بدری نکلا۔ انتقام کی مجسم تصویر طیش کے مارے اس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ ... جسے ... سے اس نے اپنے دل کے مندر میں بٹھا رکھا تھا ... جسے وہ ... اگر کانشی درمیان میں نہ کود پڑتا۔ شملی کی ... چھن گئی تھی۔ وہ کانشی کی طرح ... [illegible]

کی حسینہ اس سے نفرت ہی کرے۔ وہ جانتا تھا کبھی سورجو کی محبت بھری نگاہیں اس کی طرف بھی اٹھا کرتی تھیں لیکن اس میں کانشی کی سی، جرأت نہ تھی۔ اور محبت میں جرأت اور حوصلہ ہی کامیابی کی پہلی شرط ہے جب وہ سورجو کی مہربان نگاہوں کو دیکھتا تھا تو اس کے دل میں ہلچل، مچ جاتی تھی لیکن وہ خاموش دیکھتا رہ جاتا تھا۔ سلسلۂ راہ و رسم کس طرح پیدا کرے۔ یہ اسے معلوم نہ تھا۔ پھر کانشی آیا۔ سورجو نے اسے بھی محبت سے دیکھا۔ کانشی نے ان محبت بھری نگاہوں کا جواب دیا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں آنکھوں والی کو جیت لیا۔ اب کہیں کانشی دل اسے سے ہٹ جائے اس پر بجلی گر پڑے۔ اسے موت آجائے تو وہ حوصلے سے کام لے وہ سورجو کو جتادے کہ وہ اس سے کس حد تک محبت کرتا ہے۔ ثابت کردے کہ وہ اس کے لئے آسماں کے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔ پاتال کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتا ہے۔

لیکن کانشی . . . کانشی۔ اس نے بگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور دانت پیستے ہوئے بڑھ کر اس جھاڑی کو اکھاڑ پھینکا جس کے پیچھے کانشی چھپا بیٹھا تھا۔ اور پھر اپنے مضبوط بازوؤں سے اس پتھر کو، دھکیل کر نالے میں پھینکنے کی کوشش کرنے لگا جس پر کچھ دیر پہلے وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

۳

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ صبح کا ہلکا اندھیرا ساری کائنات کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے تھا۔ مشرق میں روشنی اس طرح تاریکی میں مل رہی تھی جس طرح زہر کے پیالے میں امرت۔ سب سے آگے کانشی جا رہا تھا اس کے پیچھے ایک لڑکا جوگو اور پھر دس دس سال کے دو کمسن بچے تھے۔ سب لمبے ڈگ بھرتے جا رہے تھے۔ آج شام سے پہلے انہیں شملہ پہنچ جانا ہے اسلئے سب نور کے تڑکے ہی شولی سے چل پڑے تھے۔ اندھیرے ہی اندھیرے میں انھوں نے چار کوس کی منزل طے کی تھی پہاڑی پگڈنڈی کبھی کھڈ کی گہرائیوں میں گم ہو جاتی تھی اور کبھی پہاڑ کی چوٹی پر نظر آتی تھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاتال میں دھنس گئے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کیلاش پر جا پہنچے [illegible] سفر۔ جاتے جاتے سامنے پہاڑ آجاتا اور [illegible] بھی اس کے ساتھ مڑ جاتی لیکن پہاڑ کا طواف ختم ہوتے ہی پھر پگڈنڈی صاف دکھائی دیتی اور معلوم ہو جاتا کہ فاصلہ بہت زیادہ نہیں طے ہوا۔ آتما [illegible] ہی لگا۔

"ہوشیاری سے"۔۔۔ کانشی نے اپنے پیچھے آنے والوں سے کہا۔ اور اس پگڈنڈی پر ہولیا جو پہاڑ اور کھڈ کے درمیان ٹنگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایک آدمی ہی مشکل سے اس پر گذر سکتا تھا۔ سر پر پہاڑ جھکا ہوا [illegible] خوفناک گہرا کھڈ۔ یہ پگڈنڈی جو دور سے خوبصورت لکیر سی نظر آتی تھی، نزدیک آنے پر موت اور زندگی کی حد معلوم ہوتی تھی۔ اس خطرے کے باوجود مسافروں کو اس راستے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ دوسرے راستے سے چار میل کا فاصلہ زیادہ تھا۔

[illegible] کے پیچھے آنے والے لڑکے ایک لمحہ کے لئے رکے۔ انھوں نے ایک بار اس [illegible] سہمی [illegible] تیلی سی [illegible] پگڈنڈی پر نگاہ ڈالی، اور نیچے کھڈ کو دیکھا جو منہ کھولے اس طرح پڑی تھی جیسے ہر گذرنے والے کو نگل جائے گی۔ [illegible] جیسے وہ کھڈ کی طرف سے [illegible] اور صرف اتنا جانتا تھا کہ ایک بھگوان اس کے پاؤں میں بیٹھی رحم کی بھیک مانگ رہی ہے۔ [illegible] انتظار میں کانشی جڑی بوٹیوں کا سہارا لیتا ہوا پگڈنڈی پر کئی قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ دل مضبوط کر کے لڑکے بھی اس کے پیچھے ہو لئے۔

[illegible] کو پکڑ پکڑ کر چلنے لگے۔ کچھ ہی قدم بڑھے ہوں گے کہ ایک دم ایک آواز سنائی دی [illegible] دیکھا کانشی [illegible] ایک بڑا پتھر لڑھکتا آرہا تھا۔ لڑکے چیخ کر پیچھے ہٹے۔ کانشی بجلی کی سی سرعت سے پیچھے ہٹا۔ لیکن اس کا پاؤں پھسلا اور وہ پودے کو پکڑے ہوئے کھڈ میں لٹک گیا۔ ایک چیخ۔۔۔ اور پودے کی جڑ پتھر کی چوٹ سے ٹوٹ گئی۔ کانشی قلابازیاں کھاتا ہوا کھڈ میں جانے لگا اور اس کے پیچھے وہ پتھر جس طرح چوہے کے پیچھے بلی۔

لڑکے سہم گئے تھے اور روتے ہوئے احتیاط سے پیچھے کو ہٹنے جا رہے تھے۔ انھوں نے ایک اور بڑا پتھر دیکھا جو بڑے تیزی سے [illegible] میں لڑھکتا آرہا تھا لیکن اس بار وہ پیچھے نہیں وہ اس کی زد سے باہر تھے۔ جوں توں کر کے انھوں نے وہ موت کی پگڈنڈی فتح کی اور روتے ہوئے واپس شولی کی طرف بھاگ گئے۔ انھوں نے وہ قصہ

ہنسی سنا جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے لوہے نے بدری سے لگایا۔ اس وقت اگر اسے کوئی دیکھتا تو ڈر سے کانپ جاتا۔ اس کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ اور ڈراؤنی تھیں۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ اور اس کے چہرے پر آگ برس رہی تھی۔ اس نے سکھ کی سیج میں کھٹکنے والے کانٹے کو نکال دیا تھا۔ محبت کے اکھاڑے میں وہ بازی جیت گیا تھا۔ اور اپنے رقیب کو اس نے چاروں شانے چت گرا دیا تھا

کل ہی جب اسے معلوم ہوا تھا۔ کاشی علی الصبح ہی شملہ کو چل پڑے گا

تب اس نے اپنے اس عہد کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو اس نے ایک دن پہاڑ کی اسی چوٹی پر کیا تھا۔ اس دن وہ یہاں مرنے آیا تھا۔ سورجو کی بے التفاتی نے اسے اس حد تک مایوس کر دیا تھا کہ اپنی زندگی اسے ایک بار محسوس ہوتی تھی۔ اور وہ آیا تھا اس چوٹی سے اپنے آپ کو گرا کر اس خشک اور بے کیف زندگی ـــ اپنے اس سالوں کے قید خانے کو فنا کرنے۔ لیکن اچانک اس کے کانوں میں اس کے آباؤ اجداد کے کارنامے گونج اٹھے آخر کیا وہ انہی تہزور پہاڑی لوگوں کی اولاد نہ تھا جو مرنا نہ جانتے تھے۔ مارنا جانتے تھے جنہوں نے بیسیوں مسافروں کا مال و اسباب لوٹ کر انہیں ہمیشہ کے لئے کھڈ کی گہرائیوں میں گم ہونے کے لئے پھینک دیا تھا۔ اس وادی میں ایک بڑا خوبصورت آبشار تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے سیاح دور دور سے آتے تھے اور بارہا ان خوفناک پہاڑی ڈاکوؤں کے بنز چمکتے ہوئے خنجروں کا شکار ہو جاتے تھے۔ بدری کی نگاہِ تصور نے دیکھا۔ اس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی ڈاکو کسی مسافر کو آبشار دکھانے کی غرض سے رہبر کی حیثیت سے لایا۔ اور پھر سنسان جگہ میں اس کی پشت میں خنجر بھونک کر اس نے اس کا سب کچھ چھین کر اسے کھڈ میں گرا دیا۔ اس خونیں نظارہ کو دیکھتے ہی بدری کا ہاتھ بھی کمر پر گیا۔ لیکن وہاں خنجر نہیں تھا۔ انگریزوں کے سخت ہاتھ نے ان خونخوار ڈاکوؤں کو بزدل اور ڈرپوک "پہاڑیے" بنا دیا تھا لیکن اس دن بدری کے ڈرپوک جسم میں کہیں سے اس کے آباؤ اجداد کی بے خوف اور نڈر روح حلول کر گئی۔ اس دن وہ پھر بھیڑیے سے بھیڑیا بن گیا اور اس نے عہد کیا کہ وہ مرنے کے بدلے مارے گا۔ خود کھڈ میں گرنے کے بدلے اپنے رقیب کو کھڈ میں گرا کر اپنے انتقام کی پیاس بجھائے گا۔

رات بھر وہ سو نہ سکا تھا۔ علی الصبح ہی کاشی چل پڑے گا اس خیال سے وہ آدھی رات کو ہی بستر چھوڑ کر صرف ایک چادر اوڑھے ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا یہاں آ پہنچا تھا۔ اس رات تو خیر چاند کی کچھ مدھم روشنی بھی تھی۔ لیکن اگر گھٹا ٹوپ اندھیرا بھی ہوتا تو وہ کسی مشکل کے بغیر اس چوٹی پر پہنچ جاتا۔ انتقام کی آنکھیں اسے راستہ دکھا دیتیں۔

آج وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ آج اس کا عہد پورا ہوا تھا۔ وہ واپس تسولی کو مڑا کہ سورجو کے دل سے کاشی کی یاد کو نکال کر پھر سے اپنی محبت کے بیج بوئے۔ لیکن تھوڑی دور ہی جا کر وہ پھر شملہ کو جانے کے لئے واپس مڑا۔ اس نے سوچا کہ کاشی کی موت کی اندوہناک خبر سن کر سورجو اداس ہو گئی ہو گی اور اسے اس عالم میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ وہ شملہ جائے گا۔ وقت کو سورجو کے زخم خوردہ دل پر مرہم رکھنے کی اجازت دے گا۔ اور اس اثنا میں اتنا روپیہ اکٹھا کرے گا کہ سورجو پر تحائف کی بارش کر دے اور پھر اپنی دولت اور محبت کے جال میں اسے اس طرح جکڑے گا کہ اگر کاشی پھر زندہ ہو کر بھی آئے تو اسے اس سے چھین نہ سکے۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی حیوانیت سعید گی میں بدل گئی اور وہ آہستہ آہستہ شملہ کی طرف چل پڑا۔

اپریل ختم ہوا۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست گزر گئے اور ستمبر ختم ہونے کو آ گیا۔ شملہ کا موسم ختم ہو گیا۔ سرکاری دفاتر بھی دہلی اور لاہور جانے لگے۔ میدان کی گرمیوں سے تنگ آ کر شملہ میں پناہ لینے والے۔ شملہ کی سردی کے ڈر سے پھر واپس میدانوں کی طرف چلے گئے۔ بدری نے اس عرصہ میں خوب محنت سے کام کیا۔ وہ کچھ دیر سے شملہ پہنچا تھا اس لئے کسی مستقل جگہ کا ملنا مشکل تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ جہاں بھی کہیں مزدوروں کی ضرورت پڑی وہیں اس نے اپنی خدمات پیش کر دیں اور پھر اس دیانتداری سے [illegible] کام کیا کہ اسے امید سے زیادہ مزدوری ملی۔ کبھی وہ رکشا ڈرائیور بن جاتا کبھی کسی کا مزدور۔ کبھی اس نے محکمہ حفظانِ صحت میں کام کیا۔ کبھی بجلی کمپنی میں۔ اور جب کوئی کام نہ ملا تو سٹیشن کے باہر جا کھڑا ہوتا۔ اور آنے [illegible] سامان اٹھا کر اچھے پیسے لے آیا۔ آموں کے موسم میں اس نے [illegible] لگانی شروع کر دی۔ [illegible]

بھُول جا!

جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔ اے

خارزاروں میں شرابِ ارغوانی بھول جا
اب جوانی جاچکی ہے اب جوانی بھول جا

دل کی گہرائی سے اب اُٹھتی ہوئی فریاد سن
ہمنشینوں کا وہ ذوقِ نغمہ خوانی بھول جا

اپنے ومدوں کی حیاتِ مختصر پر غور کر
میرے دل کا اضطرابِ جاودانی بھول جا

جن کے سائے میں پناہیں لیں ہمارے عشق نے
اُن شباب انگیز راتوں کی کہانی بھول جا

اب کہاں وہ ابر کی چھاؤں میں پینے کے مزے
آہ، اے ہمدم! وہ دورِ خسروانی بھول جا

اب کسی سنسان صحرا میں مرا غمخانہ ڈھونڈھ
آہ، وہ پروازہائے لامکانی بھول جا

میری آنکھیں دیکھ جن سے جھانکتی ہے بےبسی
اب مری دھیمے سُروں میں شعرخوانی بھول جا

اب مری دُکھتی ہوئی نبضوں کو یوں آکر نہ چھیڑ
وہ جوانی کے دنوں کی سخت جانی بھول جا

اب تو خود ہستی مری اک مستقل افسانہ ہے
سرد راتوں میں مری افسانہ خوانی بھول جا

اب اُبھر آتا ہے ہر نقطے میں خونِ آرزو
اب ندیمِ خستہ کی جادو بیانی بھول جا

اطالیہ کی تحریک فسطائیت

فاشزم پر ایک معرکتہ الآرا مقالہ

از جناب عبدالرحیم صاحب شبلی۔ بی۔ کام

فاشزم کا مفہوم

بیسویں صدی نے متعدد سیاسی و معاشی تحریکات کو جنم دیا ہے جو آج کل باہمی پیکار ——— اور بین الاقوامی مناقشت اور مبازرت کا باعث بن رہی ہیں۔ ان تحریکات کا اصل مبدا تو وہ فطری رجحان طبع ہے جو انسان کو کمزوروں پر قبضہ کر لینے اور ضعیفوں پر اپنی قیادت و سیادت جتانے کی طرف مائل کرتا ہے لیکن اگر ان کے معروضی (   ) اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان گوناگوں تحریکات کے پس پشت تین آویزشیں کام کر رہی ہیں۔

۱۔ پہلی آویزش مطمئن اور غیر مطمئن اقوام کے درمیان ہے۔ جنگ عظیم کے بعد جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے امریکہ، فرانس، اور انگلستان نے بہت سے ممالک اپنے قبضہ میں کر لئے اور ایطالیہ، جرمنی اور جاپان وغیرہ کو بالکل تہیدست کر دیا اب موخر الذکر اس غیر منصفانہ تقسیم ممالک کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ دوسری آویزش سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان ہے۔ مزدور چاہتے ہیں کہ حکومت ان کے ہاتھ میں ہو تاکہ دنیا میں مساوات اخوت اور آزادی کا دور دورہ ہوسکے لیکن سرمایہ دار موجودہ طبقاتی مناقشت ہی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کے خیال میں مساوات غیر فطری اصول ہے۔

۳۔ تیسری آویزش حاکم اور محکوم قوموں کے درمیان ہے موخر الذکر کو سیاسی آزادی کا احساس ہو چکا ہے اس لئے وہ ملوکیت اور شاہی کے چنگل سے نکل کر شخصی آزادی اور جمہوریت کا جامہ پہننا چاہتے ہیں۔

ان میں سے جو تحریک سرمایہ داری اور ملوکیت خواہی کی حامی ہے اسے "فاشزم" کہتے ہیں اور موجودہ مضمون میں ہم اسی کے فلسفہ ارتقا اور ہیئت پر مفصل بحث کرنا چاہتے ہیں۔ فاشزم کی تعریف سکاٹ نیرنگ کے خیال میں یہ ہے۔

> "فاشزم، سرمایہ داروں اور حقوق یافتوں کی تحریک ہے، اس کے جاری کرنے والے "بورژوا" یا متوسط طبقہ کے لوگ ہیں۔ یہ تحریک پہلے پہل تو متوسط طبقہ کے ہاتھ میں رہتی ہے بعد ازاں اس حکمران طبقہ کی قیادت میں چلی جاتی ہے۔ جو جنگ عظیم، اقتصادی پستی اور محکوم اقوام کی بغاوت سے برباد شدہ سرمایہ اور شاہی سے متنفر ہو رہا ہو۔ اور مزدوروں کی بغاوت کے خطرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر سوچ رہا ہو۔ عموماً یہ لوگ قومی جذبے کی آڑ میں تحریک حزب المال کا قلع قمع کرنے کے لئے معاشی قومیت پر کاربند ہونے کی کوشش کیا کرتے ہیں"

فاشزم کے مقاصد

جیساکہ فاشزم کے مفہوم سے ظاہر ہے فاشزم کے مقاصد سراسر جارحانہ، ملوکیت پرستانہ اور سرمایہ دارانہ ہیں۔ مختصر طور سے ان کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اوّل، سرمایہ پرستی کو اشتراکیت اور مزدور تحریک کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے جمہوری اداروں اور تحریک حزب العمال کا قلع قمع کرنا۔

دوم۔ نوآبادیات اور مقبوضات حاصل کر کے دیگر اقوام سے معاشی طور پر آزاد ہونا۔

سوم۔ اپنے پروگرام کو ساحل کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے عوام کے جذبہ حب الوطنی اور نسلی امتیاز کو فروغ دینا۔

چہارم۔ مخالفت کو مٹانے کے لئے تمام دنیا کو اپنے ماتحت کرنے کا خواب دیکھنا۔

قبل اس کے کہ ہم فاشزم کے مختلف خدوخال نمایاں کریں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس تحریک اور سوشلزم، لبرلزم اور ڈیماکریسی وغیرہ کے درمیان کیا فرق ہے؟

فاشزم اور سوشلزم

سوشلزم مزدوروں کو ابھارنے کی ایک تحریک ہے۔ برخلاف اس کے فاشزم ان کو کچلنا چاہتا ہے اور سرمایہ پرستی ہی کو دنیا پر حکمراں کرنا چاہتا ہے۔

سوشلزم کی تعلیم یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے بنانے میں انسان کی مادی احتیاجات کو سب سے زیادہ دخل ہے اور دوسرے تمام موثرات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہماری گورنمنٹ' ہمارا مذہب' ہمارا آرٹ اور ہماری زندگی کا ہر شعبہ گزشتہ معاشی حالات کا پرتو ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں اس کو "تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ" کہتے ہیں۔ اس خیال کا بانی مبانی کارل مارکس تھا۔ اس کے برعکس فاشزم کا دعوی ہے کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے چنانچہ مسولینی نے اطالوی انسائیکلوپیڈیا کے لئے فاشزم پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں وہ رقمطراز ہے۔

"فاشزم اس نظریہ کا مخالف ہے جو نام نہاد علمی یا مارکسی اشتراکیت" کی بنیاد ہے یعنی تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ جس کی رو سے تہذیب انسانی کی تاریخ کی تشریح صرف مختلف جماعتی طبقات کے اغراض کے تصادم اور وسائل دولت آفرینی میں تغیر و ترقی سے ہو سکتی ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معاشی زندگی کے تغیرات مثلاً نئے اجناس خام اور انھیں کارآمد بنانے کے نئے طریقوں کی دریافت اور سائنس کے نت نئے اختراعات سے انسانی حیات پر گرانقدر اثر پڑتا ہے لیکن یہ کہنا کہ "تاریخ انسانیت کی تشریح ان سے ہو سکتی ہے اور دیگر تمام عناصر کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے محض ایک دھوکا ہے"۔

پھر اشتراکیت ایک مادی خوشحالی اور مسرت کی قائل [illegible] جو دولت کی منصفانہ تقسیم سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن فاشزم [illegible] کے خلاف ہے۔ چنانچہ مسولینی لکھتا ہے۔

"فاشزم معاشی مسرت کا جسے اشتراکیت معرض عمل میں لانا چاہتی ہے منکر ہے۔ وہ معاشی مسرت کے مادی تصور اور اس کے امکان سے بھی انکار کرتی ہے اور اسے اپنے مخترعین یعنی انیسویں صدی کے نصف اول کے معاشیین کیلئے چھوڑ دینا چاہتی ہے یعنی فاشزم اس حسابی مساوات کی منکر ہے جس کی رو سے مادی خوشحالی معاشی مسرت کے برابر ہوتی ہے کیونکہ اگر یہ صحیح ہو تو انسان حیوانوں کی سطح پہ اتر آئے جن میں صرف کھانے اور موٹے ہونے ہی کا خیال ہوتا ہے؟ اور انسانیت خالص جسمانی دیوی کی پستیوں میں پہنچ جاتی ہے"۔

مزید برآں جہاں اشتراکیت سرمایہ داروں اور مزدوروں کی [illegible] تفریق کو مٹانا چاہتی ہے وہاں فسطائیت اس کے برقرار رکھنے کی حمایت [illegible] کیونکہ اس کے خیال میں یہ مناقشت مین فطری اور لازمی ہے۔

فاشزم اور لبرلزم

لبرلزم میں شخصی آزادی [illegible] دیا جاتا ہے اور حکومت کی [illegible] اور دخل اندازی صرف بہت ضروری کاموں [illegible]

[illegible] امریکا، فرانس اور انگلستان کے جمہوری نظام اسی اصول پر وضع [illegible]ئے تھے۔ لیکن فاشزم شخصی آزادی کے بجائے ریاست یا حکومت [illegible]ں اندازی کا زبردست حامی ہے۔ چنانچہ سولینی اپنے مضمون میں [illegible] طرح لکھتا ہے۔

"اساکین فسطائیت کا تعلق سلطنت، اس کے نظام اس کے فرائض اور اس کے مقاصد سے ہے فاشزم کی رو سے سلطنت "کل" ہے اور افراد اور جماعتیں اس کا جزو ہیں۔ اس لئے سلطنت کو اس کے ہر معاملہ میں دخل اندازی کا حق حاصل ہے۔"

سولینی کے خیال میں تہذیب و تمدن اور ترقی و خوشحالی سب [...]ت کی کوششوں اور مساعی کی رہین منت ہے ——

[...]تا ہے۔

"حکومت یا سٹیٹ کی ایک علیحدہ "روح" اور "عقل" ہوتی ہے جو محض افراد کی روحوں یا عقلوں کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ ایک علیحدہ روحانی اور اخلاقی حقیقت رکھتی ہے حکومت اگر ایک طرف ملک کو خارجی حملوں سے محفوظ رکھتی ہے تو دوسری طرف وہ اپنی "اس روح" اور "آتما" کی بھی حفاظت رکھتی ہے جس کا اظہار صدیوں کی ترقی کے بعد ہماری زبان ہمارے رسم و رواج اور ہمارے مذہب وغیرہ کی شکل میں ہوتا رہتا ہے حکومت ہی ان سب چیزوں کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرتی ہے۔ حکومت صرف زمانہ حال کی حقیقت نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ زمانۂ قدیم سے بھی ہے اور زمانہ آئندہ سے بھی۔ جس قوم میں حقیقت کا خیال دھندلا پڑ جاتا ہے وہ بالآخر مٹ جاتی ہے۔"

سولینی کے خیال میں سلطنت ہی ایک ایسی طاقت ہے جو سرمایہ[...] ملکی قباحتوں کو دور کرتی ہے اور ہر قسم کے سیاسی اور اقتصادی عقدہ [...] کشائی کرتی ہے اس کا خیال ہے کہ اگر شخصی آزادی کے حامی آج [...]ہوتے تو وہ بھی حکومت کی دخل اندازی کی حمایت میں رطب اللسان ہو جاتے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہے۔

"کہاں ہیں، آج وہ شخصی آزادی کا دعویٰ کرنے والے جو کہا کرتے تھے کہ سٹیٹ افراد کے لئے ایک غیر ضروری بار ہے؟ کیا آج میکالک کا سایہ بھی کہیں نظر آتا ہے؟ کہاں ہے آج میکالک جو کہتا تھا کہ سٹیٹ کے لئے افراد کے معاملات میں دخل دینا خطرناک ہے؟ اگر آج بینتھم زندہ ہوتا تو اسے ہم دکھاتے کہ لوگ ہر جگہ اقتصادی معاملات میں حکومت کی امداد طلب کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ تجارت کو حکومت سے علیحدہ رکھنے میں ہی قوم کی بہتری سمجھتا تھا۔ اسی طرح ہمبولٹ جس کے خیال میں بہترین حکومت وہ ہے جو افراد کے کاروبار سے بے تعلق رہے دنیا کی موجودہ حالت دیکھتا تو کیا کہتا؟"

الغرض فاشزم میں حکومت افراد کی تمام اخلاقی، تعلیمی، معاشری اقتصادی اور سیاسی بہبودی کی ذمہ دار ہے۔ وہ سولینی کے الفاظ میں۔

"افراد کے جائز حقوق کے استعمال میں مزاحم نہیں ہوتی صرف ناجائز اور خطرناک اختیارات کو سلب کر لینا چاہتی ہے البتہ افراد کے جائز اور ناجائز اختیارات کا فیصلہ کرنے کی اہل حکومت ہے نہ کہ خود افراد۔"

خلاصہ کلام یہ کہ سولینی کے خیال میں اب لبرلزم یا شخصی آزادی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"فاشزم شخصی آزادی کی مخالفت پر کمربستہ ہے شخصی آزادی کو اس لئے اہمیت دینا کہ گزشتہ صدی میں اس نے تہذیب کے ارتقاء میں اہم حصہ لیا تھا معقولیت سے بعید ہے اگر اس تحریک کو کچھ عرصہ کے لئے فروغ حاصل ہوا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کی نجات ابدالآباد تک اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔"

شخصی آزادی کی تحریک کو صرف نصف صدی کیلئے فروغ حاصل ہوا تھا اس کی ابتدا سنہ ۱۸۳۰ء میں ہوئی اور [illegible] میں اس نے انتہائی عروج حاصل کر لیا۔

لی ددوی

اس مدت کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا ۱۸۴۹ء کے بعد اس کے تاریک ترین دور کا آغاز ہوتا ہے جب فرانس کی جمہوریت [illegible] کی ہمسایہ [illegible] کی آزادی پر کاری ضرب لگائی اسی سال مارکس نے اپنی اشتراکی لائحہ عمل کا اعلان کیا۔ ۱۸۵۱ء میں نپولین سوم نے فرانس میں اقتدار حاصل کر لیا اور ۱۸۷۰ء تک بادشاہی کرتا رہا۔ موخر الذکر سال اسکے زوال کا سال ہے اسی سال شخصی آزادی کی تحریک بھی ختم ہو گئی"

فاشزم اور جمہوریت

جمہوریت میں اکثریت حکومت کرتی ہے لیکن فاشزم کے خیال میں چونکہ عوام حکومت اور نظامت کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے اس لئے اصل اختیارات صرف "چند غیر ذمہ دار اشخاص" کے سپرد ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اس نظام کا مخالف ہے۔ چنانچہ وہ جملہ اختیارات کسی ایسے لائق اور قابل شخص کے حوالہ کر دینا چاہتا ہے جو اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سے سمجھنے کا اہل ہو اور ملک و ملت کی خوشحالی کے لئے تمام تر قوت صرف کر سکے۔ اسی نظریہ کو مسولینی نے بدیں الفاظ بیان کیا ہے۔

"فیسطائیت یہ کبھی تسلیم نہیں کریگی کہ اکثریت محض تعداد کی بنا پر حکومت کرنے کی اہل ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ قدرت نے انسانوں کو غیر مساوی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور یہ فرق ہر خاص و عام کو حق رائے دہندگی دینے سے نہیں مٹ سکتا۔ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ وہ انتخاب کے موقع پر عوام کو دھوکا دیکر یقین دلاتی ہے کہ حکومت انہی کے ہاتھوں کے ہاتھوں میں ہو گی حالانکہ جمہوریت کی باگ ڈور غیر ذمہ دار اشخاص یا جماعتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

جمہوریت ایسی حکومت ہے جس میں کہنے کو تو کوئی بادشاہ نہیں لیکن در اصل ایک کی جگہ کئی خفیہ بادشاہ ہوتے ہیں جن میں ہر ایک بڑے سے بڑے بادشاہ سے زیادہ مطلق العنان اور ظالم سے ظالم بادشاہ سے زیادہ سخت گیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاشزم جس کا رجحان ۱۹۲۲ء میں جمہوریت کی طرف تھا اب اس سے متنفر ہے۔

گذشتہ اور موجودہ جمہوریتوں اور سلطنتوں کے حالات پر غور کرنے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ آج کل جمہوری طرز حکومت کو زیادہ اہمیت دینے کی کوئی وجہ نہیں آج کل کی حکومتیں مختلف توموں کے سیاسی تاریخی یا ذہنی ارتقاء کی مظاہر ہیں، فاشزم ملوکیت اور جمہوریت کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ موجودہ زمانہ میں بعض جمہوریتیں حد درجہ رجعت پسند واقع ہوئی ہیں حالانکہ بعض ملوکیت کی طرز کی حکومتیں ترقی کی طرف گامزن ہیں۔"

فاشزم اور مطلق العنانیت

فاشزم مطلق العنانیت کا قائل بھی نہیں ہے چنانچہ مسولینی نے اپنے مضمون میں اعلان کیا کہ

"مطلق العنان بادشاہوں کا دور گذر چکا ہے اور اب ہم اس کی واپسی کے خواہشمند نہیں ہیں۔"

آج کل اطالیہ میں فاشزم اپنی اصلی شکل میں نافذ ہے بادشاہ بھی موجود ہے لیکن اس کے اختیارات بالکل صفر کے برابر ہیں۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ اٹلی کے تمام سیاہ و سفید کا مالک آج کل مسولینی ہے اس لئے اسے "مطلق العنان فرمانروا" کہنا جائز ہوگا۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ مسولینی محض ایک آمر ہے اور آمر مطلق العنان نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی پارٹی کی خواہش کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ اگر پارٹی چاہے تو اس کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر سکتی ہے اور اس صورت میں اسے اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑیگا۔

یہ صحیح ہے کہ آمر مستبد ہوتا ہے اور اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ہر قسم کی سختیاں اور مظالم روا رکھنے سے بھی دریغ نہیں کرتا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے جملہ مشاغل اور اقدامات محض قوم کے بھلے اور فائدے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی جرمنی گیا

ہر ہٹلر، ایطالیہ میں مسولینی اور روس میں سٹالین نہ ہوتے تو کون کہہ سکتا تھا کہ ان ممالک کی حالت آج بھی وہی ہوتی جو لبرلزم کے زمانہ میں ہو سکتی تھی۔ یقیناً ان میں سے بعض ممالک کا نام بھی مشہور نہ ہوتا کجا یہ کہ اب بڑی بڑی حکومتیں ان سے پناہ مانگ رہی ہیں۔

پھر چونکہ آمر عوام سے مشورہ کرنے کا بھی قائل نہیں ہوتا اس لئے خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید وہ مطلق العنان ہوگا۔ لیکن اس کے لئے بھی یہ خیال رہے کہ گو آمر رائے عامہ لینے کا حامی نہیں لیکن وہ اپنی پارٹی سے مشورہ ضرور لیتا ہے۔

فاشزم اور پرانی تحریکات

فاشزم نے تذکرۃ الصدر تمام پرانی تحریکات سے اچھے اچھے اصولوں پر اپنے لائحہ عمل کی بنیاد رکھی ہے۔ چنانچہ مسولینی رقمطراز ہے۔

"فاشزم نے اشتراکیت، جمہوریت، اور شخصی آزادی کے عقائد میں سے صرف وہ اصول منتخب کر لئے ہیں جو اس زمانہ میں بھی عملی طور پر مستفید ہیں لیکن وہ اس خیال کا حامی نہیں کہ کوئی اصول ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ اگر انیسویں صدی میں اشتراکیت، جمہوریت اور لبرلزم کی تحریکات کو عروج حاصل ہوا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ بیسویں صدی میں بھی انہی اصول کی حکومت ہوگی۔ سیاسی عقاید مُردہ ہو جاتے ہیں لیکن دنیا کا کاروبار اسی طرح چلتا رہتا ہے، نئے اصول پرانے اصولوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔"

اسی اصول کی بنا پر فاشزم نے جمہوریت، اشتراکیت اور شخصی آزادی وغیرہ کے بہترین اور قابل عمل عقاید اخذ کر لئے اور انہی کی بنا پر فاشزم کو مرتب کیا اس اعتقادہ کی حمایت میں مسولینی لکھتا ہے۔

"کوئی عقیدہ ایسا نہیں جو شروع سے ہی مکمل ہو اور جس کے لئے پہلے عقیدوں سے کچھ اخذ نہ کیا گیا ہو۔ کوئی عقیدہ معرض ظہور میں آتے ہی مکمل تصور نہیں کیا جاتا اس لئے پہلے عقیدوں سے استمداد کرنا پڑتی ہے اور آئندہ تحریکوں سے بھی اس میں ضرور ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اشتراکیت کو لے لیجئے، کیا کارل مارکس نے اس کے قواعد وضوابط میں فوریئے اووِن اور سینٹ سائمن کے ناقابل عمل فلسفہ سے امداد نہیں لی ہے، کیا اٹھارویں صدی کی شخصی آزادی کی تحریک سترہویں صدی کی تحریکات کا نتیجہ نہ تھی؟ کیا جمہوریت کے اصول وضع کرنے والے اپنے پیشروؤں کے زیر بار احسان نہیں ہیں؟

ہر عقیدہ انسانی جدوجہد کو کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے تیار کرتا ہے لیکن انسانی جدوجہد سے بھی عقاید میں ترمیم ہوتی رہتی ہے اور زمانہ انہیں اپنی ضروریات کے مطابق بنانے کے لئے ان میں ردوبدل کرتا رہتا ہے ایک عقیدہ محض لفاظی نہیں بلکہ زندہ کارنامہ ہے۔ فاشزم کی فوقیت کا راز یہ ہے کہ اس کے اصول عملی ہیں اور ان میں ضروریات زمانہ کے مطابق اصلاح کی گنجائش بھی ہے۔"

فاشزم اور عالمگیر امن پسندی

فاشزم "عالمگیر امن پسندی" یا بین الاقوامی معانقہ کا قائل نہیں ہے۔ وہ جنگ اور آویزش کا حامی ہے کیونکہ اس کے خیال میں جہاں امن ترقی کو مسدود کر دیتا ہے وہاں جنگ قوم کی خفیہ قوتوں کو بیدار کر دیتی ہے۔ اور لوگوں کے اندر کام کرنے کی ایک خواہش اور مسابقت کا جذبہ بھڑکانے میں ازحد مفید ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنے اس خیال کی تائید میں مسولینی لکھتا ہے۔

"فاشزم جس قدر انسانیت کے مستقبل اور اس کی نشو ونما پر نگاہ ڈالتا ہے اسی قدر نہ تو امن عامہ کا فائدہ سمجھ میں آتا ہے اور نہ اس کے امکان پر کوئی یقین ہوتا ہے۔ لہذا فاشزم امن پرستی کے مسلک کو رد کرتا ہے کیونکہ یہ ترک سعی کا مسلک ہے اور قربانی یا ایثار کے مقابلہ میں بزدلی کا مظاہرہ۔

جنگ ہی انسانی قوت کو بلند ترین درجہ تک پہنچا سکتی ہے
اور جن قوموں میں اس کی صلاحیت ہے ان پر
شرافت اور مردانگی کی مہر ثبت کر دیتی ہے باقی سب
ابتلا اور امتحانات صرف بدل اور قائم مقام ہیں
جن سے آدمی کبھی اس حالت سے دوچار نہیں ہوتا
جہاں زندگی اور موت کا عظیم الشان فیصلہ کرنا ضروری
ہوتا ہے۔ لہذا جو مسلک امن کے اس مضر نظریہ پر مبنی
ہو وہ فاشزم کا مخالف ہے"۔

مسولینی عالمگیر اتحاد کے لئے کسی جمعیتہ اقوام یا لیگ آف نیشنز وغیرہ کا قایل نہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"تمام بین الاقوامی انجمنیں فاشزم کی روح کے منافی ہیں
ہر چند کہ مخصوص سیاسی حالات کی وجہ سے کبھی انھیں
تسلیم ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن تاریخ بتا دیگی کہ اگر ایک
مرتبہ بھی کسی محرک سے قومی جذبہ پیدا ہو گیا تو
وہ جذباتی محرک ہو یا خیالی یا عملی یہ سب جمعیتیں اور
انجمنیں منتشر ہو کر ہوا میں اڑتی پھریں گی"۔

چنانچہ مسولینی نے ۱۹۳۷ء کے اواخر میں لیگ آف نیشنز سے اپنے قطع تعلق کا اعلان کر دیا تھا۔ اور اب ایک علیحدہ فسطائی لیگ بنانے کی فکر میں ہے۔

فاشزم اپنے ہمسایوں سے بھی محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے مسولینی لکھتا ہے۔

"اگرچہ فاشزم ہمیں اپنے ہمسایہ سے محبت کی تعلیم
دیتا ہے لیکن ضرورت کے وقت ہمسائیوں پر سختی کرنے
سے بھی نہیں روکتا۔ جب ہم انھیں حفظ مراتب پر
توجہ دلانا چاہتے ہیں تو یہ ہمارے لئے سد راہ نہیں
بنتا۔ ہمیں مہذب قوموں کی آبادی میں اپنے ہمسایوں
سے محتاط ہو کر رہنا چاہیئے ان کی متغیر حالتوں کا مطالعہ
[illegible] ان کی عارضی اور [illegible] دوستی
[illegible] ہیئے"۔

لوگ کہتے ہیں کہ آج کل مسولینی اور ہٹلر میں گاڑھی چھن رہی ہے، لیکن جس شخص کی تعلیم یہ ہو کہ اپنے ہمسایوں کو مشکوک نظروں سے دیکھے اس پر کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

فاشزم اور مذہب

فاشزم اگرچہ خالص قومی اور اقتصادی تحریک ہے لیکن بولشوزم کی طرح، مذہب کی طرف سے غافل نہیں ہے بلکہ اس میں افراد کو ایک حد تک مذہبی آزادی بھی حاصل ہوتی ہے۔ مسولینی لکھتا ہے۔

"فاسسٹ حکومت مذہب اور علی الخصوص رومن
کیتھولک مذہب سے غافل نہیں۔ اگرچہ حکومت کے لئے
کسی خاص مذہب کی پیروی لازمی نہیں اور اس کے
لئے صرف اخلاق کی پابندی کافی ہے لیکن ہم مذہب
کو انسانی ضمیر کا مظہر قرار دیکر اس کا احترام کرتے ہیں
اور اس کے ناموس اور حفاظت کیلئے ہر وقت کمر بستہ ہیں
ہم نے کبھی ایک نیا بُت تراشنے کی کوشش نہیں
کی جس طرح انقلاب فرانس کے رہنماؤں نے ایک نئے
خدا کی پرستش کا عندیہ کیا تھا اور نہ ہم بولشویکوں
کی طرح مذہب کو مٹا دینے کے درپے ہیں۔ ہم اس
خدا کا احترام کرتے ہیں جس پر ایمان لانے کی تلقین
پیغمبر اور اولیا کرتے رہے ہیں۔ اور جس کی ہستی
کو معمولی سے معمولی انسان بھی جانتا اور پوجتا ہے"۔

اطالیہ میں فسطائیت کا نفاذ

فاشزم کے دور دورہ سے قبل اٹلی میں تقریباً اسی قسم کی حکومت مروج تھی جس طرح کہ آج کل انگلستان میں ہے۔ یعنی بادشاہ برائے نام ہوتا تھا اور سب اختیارات وزیر اعظم یا اس کی مجلس منتظمہ کو حاصل تھے۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کا انتخاب عوام کی رائے سے عمل میں آتا اور انھیں کے سپرد قانون سازی وغیرہ کا کام رہتا تھا۔

جنگ عظیم کے بعد پارلیمنٹ میں اشتراکی زیادہ تعداد میں آ گئے اور ۱۹۲۰ء میں اطالیہ کی بہت سی فیکٹریوں پر مزدوروں کا قبضہ ہو گیا جسے حکومت نے بھی تسلیم کر لیا۔

مزدوروں کی طاقت کو کم کرنے کے لئے فاشسٹی جماعت بنی اور اگرچہ اس وقت ان کی تعداد صرف بیس کے قریب تھی لیکن انھوں نے غیر سرکاری طور پر مزدوروں کو ڈرانا، دھمکانا اور قتل کرنا شروع کردیا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے اٹلی کے بادشاہ کو اپنا طرفدار بنالیا۔ جس کے نتیجہ میں اس پارٹی کا لیڈر مسولینی وزیر اعظم مقرر ہوا۔

مسولینی نے برسر اقتدار آتے ہی نیابت کے قوانین میں اس طور سے تبدیلی کی کہ ۱۹۲۴ء میں جب انتخاب ہوا تو پارلیمنٹ میں اکثریت اس کے حامیوں کی منتخب ہو کر آئی۔

پھر ۱۹۲۵ء میں ایک اہم قانون مسولینی نے یہ نافذ کیا کہ وزیر اعظم حکومت کا اعلیٰ افسر کہلائے گا اور اگرچہ قانون کی رو سے بادشاہ کو وزیر اعظم کے تقرر اور برخواستگی کا پورا حق حاصل ہوگا لیکن جب تک وہ سیاسی، معاشی اور اخلاقی قوتیں" برسر اقتدار رہیں گی جنھوں نے مسولینی کو وزیر اعظم بنایا ہے بادشاہ مسولینی کو وزیر اعظم کے عہدہ سے برطرف نہیں کرسکتا۔ اسی قانون کی رو سے قرار پایا کہ پارلیمنٹ وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس نہیں کرسکتی۔ مزید براں جب تک وزیر اعظم سے اجازت حاصل نہ کرلی جائے کوئی تجویز پارلیمنٹ میں پیش نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص وزیر اعظم کو برا بھلا کہے گا۔ تو اُسے تیس ماہ تک سزا دی جاسکتی ہے۔

۱۹۲۶ء میں ایک اور قانون یہ پاس ہوا کہ فوری ضرورت کے وقت بلا رضامندی پارلیمنٹ حکومت ایک شاہی اعلان کے ذریعہ جو جی چاہے قانون نافذ کرسکتی ہے ایسے قوانین دو سال تک جاری رہیں گے اس کے بعد پارلیمنٹ کی منظوری درکار ہوگی لیکن اگر وہ نامنظور کردے تو شاہی اعلان کے ذریعہ قانون کو توسیع دی جاسکتی ہے۔

۱۹۲۷ء میں "لیبر چارٹر" شایع ہوا جس کی رو سے مزدوروں سے ہڑتال کرنے کا حق چھین لیا گیا۔ اور شرح و بسط کے ساتھ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے علیحدہ علیحدہ فرائض بیان کئے گئے۔ مثلاً سرمایہ داروں سے کہا گیا کہ وہ ذاتی ملکیت کو مقدس امانت سمجھیں اور مزدوروں سے کہا گیا کہ وہ اپنے آپ کو قوم کا سپاہی سمجھیں اور جس طرح سپاہی قوم کیلئے ہر طرح سے قربانی کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے اسی طرح وہ بھی قوم کی دولت بڑھانے کیلئے ہر قسم کی قربانی پر تیار رہیں۔

ستمبر ۱۹۲۸ء کے قانون کے ذریعہ ایطالیہ کی "Fascist Grand Council" (فاشسٹ گرینڈ کونسل) کو بھی جو پہلے ایک غیر سرکاری پارٹی تھی دستور میں جگہ مل گئی جس سے فاشزم نہایت مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوگیا۔

الغرض قوانین کے ذریعہ سے مسولینی نے اپنی پوزیشن نہایت مضبوط بنالی اور اب تمام سیاہ و سفید کا مالک وہی ہے۔ پارلیمنٹ عوام کے ہاتھوں میں نہیں رہی بلکہ جن کو فاشسٹ پارٹی پسند کرتی ہے وہی ممبر بنتے ہیں۔ نیز ہر قسم کے قوانین بنانے کا حق مسولینی ہے تہ کہ وزیر اعظم کو ہم اس کو "ڈکٹیٹر" یا "آمر" کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتا۔

فاشسٹ نظام حکومت

اب میں ایطالیہ کے دستور اساسی کے بعض جزئیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں تاکہ ظاہر ہوسکے کہ فاشسٹ نظام حکومت کیسا ہوتا ہے۔

(۱) فاشسٹ دستور اساسی کا سب سے پہلا جز بادشاہ ہے جس کو کوئی سیاسی اختیار حاصل نہیں ہے۔ قانون کی رو سے وہ وزیر اعظم کا تقرر کرتا ہے لیکن مسولینی نے ۱۹۲۵ء کے قانون کے ذریعہ اپنا مقام ایسا محفوظ کرلیا ہے کہ اس کے برطرف ہونے کی کوئی امید نہیں۔

(۲) اس کے بعد اٹلی میں ایک مجلس ہے جس کو "گرینڈ فاشسٹ کونسل" کہتے ہیں۔ اس کے ارکان مختلف صنعتی اور تمدنی اداروں سے لئے جاتے ہیں اس کونسل کے اختیارات بہت وسیع ہیں

(۳) اس کے بعد وزیر اعظم ہے جو تمام دیگر وزراء مقرر کرتا ہے تمام وزیر اپنے اپنے محکموں کے لئے وزیر اعظم کے سامنے جوابدہ ہیں ان وزیروں میں سے Minister of Interior یعنی وزیر داخلہ اور Minister of Corporations یعنی صنعتی انجمنوں کا وزیر اہم ہیں۔ وزیر داخلہ کے ماتحت صوبوں کے حاکم یعنی Prefects, (پریفکٹ) ہوتے ہیں اور پریفکٹ کے ماتحت Podesta یعنی ضلع کے حاکم۔

کارپوریشن مزدوروں اور سرمایہ داروں کی ایک مشترکہ مجلس ہوتی ہے جو وزیر صنعت کے ماتحت رہتی ہے۔ یہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے جھگڑوں کا تصفیہ کرتی اور دونوں کے مفاد کا خیال رکھتی ہے۔

(۴) اس کے بعد عدالت آتی ہے جس میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کے جھگڑے پیش کئے جاتے ہیں۔ اور جس کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے ہیں۔

(۵) پھر Senate یا مجلس قانون ساز اور Chamber of Deputies (چیمبر آف ڈیپوٹیز) دو ایوان ہیں جن کا تعلق عوام کے بجائے براہ راست حکومت سے ہے۔ ان ایوانوں کی منظوری کے بغیر کوئی نیا قانون منظور نہیں کیا جاتا۔ ان میں بحث پر بھی بحث ہوتی ہے۔ لیکن انھیں وزارت تبدیل کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے

فاشزم کا علمبردار مسولینی

فاشزم پر مضمون مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ مختصر طور پر فاشزم کے علمبردار سائنر مسولینی کے ذاتی حالات کے متعلق بھی کچھ واقفیت قارئین کو بہم نہ پہنچائی جائے۔

مسولینی ایک غریب لوہار کے یہاں پیدا ہوا۔ وہ بچپن میں بہت شریر اور جنگجو تھا۔ ذرا ذراسی بات پر لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اسی لئے وہ اکثر سر پھٹول کر کے گھر واپس آیا کرتا تھا۔

بوجہ غربت کے مسولینی کی تعلیم رک گئی۔ حکومت وقت سے وظیفہ بھی منظور نہ ہوسکا۔ آخر دوڑ دھوپ کے بعد اسے بیس بائیس روپے ماہوار پر ایک ٹیچری کی اسامی مل گئی لیکن مسولینی کی اولوالعزمیوں کا تقاضا کچھ اور تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ نہایت مفلسی کی حالت میں ادھر ادھر پھرنے کے بعد اسے ایک مزدور اور بعد ازاں چپڑاسی کا کام مل گیا۔ اس دوران میں چونکہ وہ اشتعال انگیز مضامین لکھا کرتا تھا اس لئے کئی بار قید ہوا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں اسے ایک اشتراکی اخبار کی ادارت کا کام مل گیا

سنہ ۱۹۱۴ء میں اس نے ایطالیہ کے رویہ کی موافقت میں بہت سے مضامین لکھے اور خود بھی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ جس سے اس کی اشتراکی پارٹی ناراض ہوگئی اور اسے وہاں سے خارج کر دیا گیا۔

مسولینی نے بعد ازاں اپنا ذاتی اخبار "ال پوپولو دی ایطالیہ" جاری کر لیا۔ یہی اخبار اس کے مقام کو مستحکم بنانے میں ممد ثابت ہوا۔

مسولینی نہایت محنتی شخص ہے وہ آرام کرسی اور سلیپر استعمال نہیں کرتا کیونکہ اس کے خیال میں یہ چیزیں عیاشوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اسی طرح وہ سگریٹ اور مٹھائی سے سخت متنفر ہے۔ وہ ہر وقت پوری وردی میں ملبوس رہتا ہے۔ قید رہنے کی وجہ سے اس میں صبر و تحمل کا ایک زبردست مادہ پیدا ہوگیا ہے۔ اور یہی اس کو کامیاب بنانے کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اس وقت مسولینی اطالوی حکومت کا سردار ہے اور حال ہی میں اسے "مارشل" کا خطاب عطا کیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اب فوجوں کی نقل و حرکت کلی اس کے اختیار میں ہوگی۔ وہ اپنی حکومت کا وزیر اعظم بھی ہے اور وزیر الحرب اور وزیر البحر بھی۔ وہ فیسطائیت کا Il Duce ال ڈوچے یعنی صدر بھی ہے۔

فاشزم دیگر ممالک میں

میں نے شروع میں بتایا ہے کہ فاشزم کا ایک مقصد اپنے ملک کے لئے نو آبادیات کا حصول اور دیگر ممالک کو اپنا مطیع بنانا ہے چنانچہ اس تحریک کا علمبردار مسولینی رقمطراز ہے۔

"فاسسٹک حکومت نے یہ عزم راسخ کر لیا ہے کہ روما الکبریٰ کی طرح تمام حکومتوں کو اپنی طاقت کا لوہا منوا کر رہیگی۔ وہ محض اپنے عساکر اور مملکت کی وسعت سے ہی دنیا کو مرعوب نہیں کریگی۔ بلکہ اسے اخلاقی برتری کا احترام کرنے پر بھی مائل کریگی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اطالوی قوم بلا واسطہ یا بالواسطہ دنیا کے ہر خطہ کی حکمران ہو لیکن اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ ہم تمام دنیا کو بزور شمشیر فتح کریں۔ البتہ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مملکت کی وسعت ایک قوم کے عروج کی دلیل ہے اور اس کی قلت اس کے زوال کی نشانی۔ فاشزم ہی ایک ایسی تحریک ہے جو ایطالوی قوم کے بلند نصب العین کی طرف دنیا کو توجہ دلاتی ہے فاشزم ہی ایطالوی قوم کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

دنیا میں ایطالوی سیادت قائم کرنے کے لئے تمام قوتوں کے اتحاد کی ضرورت ہے۔ فرض شناسی کے جذبہ کی ضرورت ہے۔ ایثار کی ضرورت ہے اور جو افراد ایطالوی قوم کی ترقی میں حارج ہیں انہیں کچل دینا بھی ضروری ہے بیسویں صدی میں فاشزم ہی کامیاب ہو سکتا ہے فاشزم ایک عالمگیر مذہب ہے اور جس طرح ہر صدی میں ایک مذہب دوسرے مذاہب پر غالب آکر تمام دنیا پر چھا جاتا ہے اسی طرح اس صدی میں فاشزم تمام مذاہب وملل کو اپنے جھنڈے تلے جمع کریگی"

انھیں الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسولینی نے اب دیگر ممالک پر بھی ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں۔ پہلے اس نے حبشہ پر ہاتھ ڈالا اور اسے اپنا مطیع ومحکوم کر لیا۔ اس علاقہ کی فتح سے ایطالیہ کا مسئلہ آبادی۔ مواد خام۔ منڈی اور فوج وغیرہ کے اہم مسائل بخوبی حل ہوگئے ہیں اُدھر وہ اسپین کے باغیوں کو بھی امداد پہنچا رہا ہے۔ فتح کی صورت میں جو یقینی ہے فاشزم کو بہت تقویت پہنچے گی۔

حال ہی میں مسولینی نے اپنی ایک تقریر میں اشارہ کیا ہے کہ مارشل کا خطاب لینے کے بعد میری بھاری ذمہ داریوں میں ایک گرانقدر اضافہ ہوگیا ہے اور اب میں ایک تیسری مہم کی تیاری میں مصروف ہوں۔ دیکھئے نزلہ کس ضعیف پر گرتا ہے۔

فاشزم نہایت سرعت کے ساتھ یورپ میں فروغ پا رہا ہے۔ جرمنی تو پہلے ہی سے اپنے مقاصد کے لحاظ سے فاشسٹ تھا اس کے بعد ہنگری۔ یگوسلاویہ۔ رومانیہ اور پولینڈ بھی قریباً قریباً فاشسٹ بن چکے ہیں رہ گئے زیکوسلواکیا اور سوئٹزرلینڈ سو ان کی حالت بھی نازک ہے، زیکوسلواکیا چاروں طرف سے مخالفوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اس کے اردگرد جرمنی۔ پولینڈ۔ رومانیہ۔ ہنگری اور آسٹریا ہیں اور چونکہ یہ سب فاشسٹ ہو چکے ہیں اس لئے اب زیکوسلواکیا کا اس یورش سے بچنا آسان نہیں ہے۔

دوسرا ملک سوئٹزرلینڈ ہے۔ یہ ملک اب تک غیر جانبدار رہا ہے لیکن اب اس کا الگ رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ اگر جرمنی (مع آسٹریا) اور اٹلی ایک دشمن فرانس پر دھاوا بول دیں تو سوئٹزرلینڈ کا درمیان میں آ نا بلکہ تباہ ہو جانا ناگزیر ہے۔ وہ بچ صرف اسی صورت سے سکتا ہے کہ فاشسٹ ممالک کے ساتھ مل جائے بس اس ملک میں بھی فاشزم کی اشاعت کوئی بعید امر نہیں ہے۔

یورپ کے علاوہ فاشزم جاپان میں بھی پھیل رہا ہے وہاں سرمایہ داروں کی ایک پارٹی ہے جس کو "بلیک ڈریگن سوسائٹی" (کالے ناگوں کی مجلس) کہتے ہیں اس نے اعلان کر دیا ہے کہ جاپان میں بھی فاشزم کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

اُدھر برازیل میں پریذیڈنٹ ڈاکٹر درگاس نے جو انٹیگرلسٹ یعنی وہاں کی فاشسٹ جماعت کا سرا ہے پارلیمنٹ کو معطل کر کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں اور خود مسولینی اور ہٹلر کی طرح وہاں کا ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہے۔

ان سب سے حیرت خیز امر یہ ہے کہ فاشزم کا درخود کناڈا میں بھی ہو رہا ہے۔ وہاں ایک خفیہ سوسائٹی ملی ہے جس کا نام "نیشنل کرسچین سوشلسٹ پارٹی" ہے۔ اس کے کئی لاکھ ممبر ہیں۔ وہ نیلی قمیص پہنتے ہیں ان کا لیڈر اڈرین ارکاندی Adrian Arcand ہے اس نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ کناڈا میں فاشسٹ حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ پھر فاشزم انگلستان میں بھی پھیل رہا ہے اور اس کے حامیوں نے وہاں کئی بار پبلک مظاہرے کئے ہیں۔

مسولینی کی نظر ہندوستان پر بھی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہاں بھی وسیع پیمانے پر فاشزم کا پروپیگنڈا شروع ہونے والا ہے اور اس مقصد کے لئے بمبئی کی ایک پارٹی مضمون نویسی شروع کریگی۔

مصر میں بھی فسطائی پارٹیاں بن چکی تھیں لیکن اب حکومت مصر نے انھیں قانوناً ممنوع قرار دیدیا ہے۔

الغرض فاشزم نہایت سرعت کے ساتھ تمام دنیا میں پھیل رہا ہے اور مسولینی کی وہ پیشگوئی کہ فاشزم ایک عالمگیر مذہب ہے اور وہ تمام مذاہب اور اقوام پر غالب آجائیگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وقت پر بکمال تمام پوری ہو جائیگی اب جمہوریت اور شخصی آزادی فقت کی آخری ہچکیاں لے رہی ہے اور فاشزم اور آمریت کا طوطی بولنے کا زمانہ قریب آرہا ہے۔

فاشزم کا مستقبل

فاشزم کا مستقبل نہایت شاندار ہے نہ صرف یہ کہ وہ دیگر ممالک میں پھیل رہا ہے بلکہ اپنے ملک میں بھی شاندار بنیادوں پر مستحکم کیا جا رہا ہے۔ مسولینی نے ایک چار سالہ پروگرام شروع کر رکھا ہے جو ۱۹۴۰ء میں ختم ہوگا۔ اس عرصہ میں ایطالیہ کی جنگی اور اقتصادی حالت کو انتہا تک پہنچانے کے ارادے کئے جا رہے ہیں۔ جنگی وزیر کا عہدہ بجائے چار سال کے پانچ سال تک کر دیا گیا ہے اور ۱۸ و ۵۵ سال کے درمیان ہر شخص کے لئے فوجی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ ہوائی فوج کو ترقی دینے کے لئے پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ... کوسٹ۔ سارڈینیا اور ... میں پندرہ لاکھ پونڈ کے صرف سے ہوائی مستقر بنائے جائینگے۔ پنٹلیریا کا جزیرہ جو سسلی کے دوسری طرف ہے آہن پوش کیا جا رہا ہے۔ ہوائی جہازوں کی کئی فیکٹریاں جاری کی گئی ہیں۔ اور نئے بم انداز جہاز تیار کئے جا رہے ہیں۔ بحری طاقت کو بڑھانے کے لئے بہت سے نئے جنگی جہاز زیر ساخت ہیں۔

لیکن سوال سارا روپے کا ہے اس وقت اٹلی کی مالی حالت نہایت کمزور ہو رہی ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ برطانیہ سے سمجھوتہ کر لیا جائے تاکہ کم از کم تین کروڑ روپے بطور قرض مل سکیں۔ برطانیہ نے بھی اندازہ کر لیا ہے کہ فاشزم کی بے پناہ یورش سے محفوظ رہنا ممکن نہیں اس لئے بہتر ہے کہ اس دشمن کو ملائمت سے رام کر لیا جائے چنانچہ مسٹر چمبرلین وزیر اعظم برطانیہ نے مسولینی سے فی الحال مفاہمت کر لی ہے۔

شبلی۔ بی۔ کام

لوٹ لیا!

از مسیح الحسن صاحب نقوی بسیرڈوی!

نقاب چہرۂ زیبا اُٹھا کے لوٹ لیا — عجب طرح کا تماشا دکھا کے لوٹ لیا

کرم سے لطف سے اپنا بنا کے لوٹ لیا — نصیب سوئے ہوئے تھے جگا کے لوٹ لیا

شراب عشق و محبت پلا کے لوٹ لیا — دُہائی ہے مجھے بیخود بنا کے لوٹ لیا

نشہ سے اپنی محبت کے کر دیا بے خود — مرے خیال کی دنیا پہ چھا کے لوٹ لیا

کبھی نظر کو کبھی دل کو کر دیا آباد — قریب آ کے کبھی دور جا کے لوٹ لیا

اُدھر ہے موت ادھر دل میں سخت حیراں ہوں — عجب طرح کے دوراہے پہ لا کے لوٹ لیا

یہ حکم ہے کہ نہ اب آستاں سے سر اُٹھے — کمال ہے مجھے گھر پر بلا کے لوٹ لیا

بہار پر تھی جوانی چمن کے پھولوں کی — سہاگ باد مخالف نے آ کے لوٹ لیا

مسیح ان کی شکایت کو کیا زباں کھولوں — میں لُٹ گیا مجھے اپنا بنا کے لوٹ لیا

غلاموں کی بغاوت

جناب چودھری عبدالرشید صاحب تبسم بی-اے

وقت اک ایسا بھی آتا ہی جہاں پر ہمنشیں! جب کسی کو امتیازِ نیک و بد رہتا نہیں

پھول مرجھاتے ہیں خار و خس سی پُر ہوتا ہے باغ بلبلیں گلشن سی اڑ جاتی ہیں آ بستے ہیں زاغ

چوس لیتے ہیں لہو مزدور کا سرمایہ دار اور ٹھکراتے ہیں اُن کی ہڈیوں کو بار بار

"تنگ ظرفی، بدمزاجی، ظلم، اہلِ دل سی جنگ کھلتے ہیں ہر طرۂ دستارِ ثروت پر یہ رنگ

نسلِ انسانی کے دشمن، رہزنِ امن و سکوں تنگِ دنیا، تنگِ دیں، تنگِ خرد، تنگ جنوں

بھیڑئیے انساں کی صورت میں درندوں کا مزاج چیرہ دستی اور خونخواری کو دیتے ہیں رواج

دوڑتی ہے انکی رگ رگ میں ہوس بن کر لہو دل میں ہوتی ہے جواں غارت گری کی آرزو

فطرتِ انساں پہ چڑھتا ہے سیہ کاری کا زنگ خنجرِ ہمت کو لگ جاتا ہے نامردی کا زنگ

گھورتے ہیں اس طرح مزدور کو سرمایہ دار جیسے ہو غربت منہ کھولے قطار اندر قطار

خونِ ناحق کو سمجھ کر وہ شرابِ لالہ گوں محفلِ عشرت میں پیتے ہیں بچنگ و ارغوں

ناخلف وہ مادرِ گیتی کے زر کے لاڈلے کھیلتے ہیں بندۂ مجبور کے جذبات سے

تازیانے ذلت و خواری کے برساتے ہیں وہ معنیِ لفظِ ضعیفی اس کو سمجھاتے ہیں وہ

اِس کی خودداری کو ڈستے ہیں وہ کج رفتار زاد — دیکھ کر اسکی جوانمرگی کو پھر ہوتے ہیں شاد

اس طرح جینا ہے اہلِ زر کا دھتکارا ہوا — دست سینہ کوب، لب پر زندگی کا مرثیہ

ناتوانی، بے بسی، درماندگی، افلاس، غم — ڈگمگاتے پاؤں، تن پر چیتھڑے اور پشت خم

زجر و دشنام و تمسخر اس کی محنت کا صلہ — سرفروشی، جاں نثاری کے عوض جور و جفا

فطرت ان سفاکیوں کی تاب لا سکتی نہیں
آسماں کھاتا ہے چکّر اور سمٹتی ہے زمیں

سہم جاتے ہیں ستارے ماہ کا اُڑتا ہے رنگ — خون روتی ہے شفق خورشید رہ جاتا ہے دنگ

سینۂ دریا میں چھالے بن کے اٹھتے ہیں حباب — موجِ مضطر کروٹیں لیتی ہے کھا کر پیچ و تاب

معتدل رہتا نہیں اک دم عناصر کا مزاج، — شدّتِ آشفتگی بنتی ہے وجہِ اختلاج

فرطِ غم سے مضمحل ہوتے ہیں فطرت کے قوا، — جس سے ہوتا ہے دو عالم میں تعطّل رونما

اس طرح ہو جب خدائی میں بپا اختلال — دیکھتا ہے جھانک کر دنیا کو ربِّ ذوالجلال

پیش کرتی ہے زمیں اک بربریّت کا سماں — ہر طرف جبر و تشدّد خون کی دریا رواں

ایک جانب معصیت کوشی، قدح، ساقی، سرور — خودستائی، زعمِ ثروت، ذوقِ خونریزی، غرور

جا بجا ابلیس زادے دام پھیلائے ہوئے — نسلِ آدم کو مٹانے کی قسم کھائے ہوئے

دوسری جانب متاعِ زندگی لٹتی ہوئی، — آسماں کی سمت رو رو کر نظر اٹھتی ہوئی

طوقِ مجبوری گلے میں پشت پر بارِ گراں — مسخ صورت، اکھڑا اکھڑا دم، چٹختی ہڈیاں

اس طرف جب صانعِ قدرت کی اٹھتی ہے نظر — کانپ اٹھتا ہے وہ اس شہکار کی تخریب پر

گونجتی ہے یک بیک قہارِ مطلق کی صدا — اور سناٹے میں آجاتے ہیں یہ ارض و سما

حکم دیتا ہے خدا پھر کاتبِ تقدیر کو — از سرِ نو سر نوشتِ ہر بشر تحریر ہو

آج سے مردود لکھے جائیں موذی کلہم — ثبت کر دو مہرِ لعنت ان کی پیشانی پہ تم

فطرت ان سے لیگی اک بندے کے خوں کا انتقام — ان کی اولادیں لکھی جائیں غلام ابن غلام

خونِ فاسد سے دماغِ اہلِ ثروت چل گیا — نشترِ فصاد بن جائے عصا مزدور کا

ہے مشیت ذریتِ شیطان کی برباد ہو — اور دنیا اک نئے آدم سے پھر آباد ہو

اے فرشتو چھوڑ دو دنیا کو اس کے حال پر — خود نپٹ لینے دو اہلِ دہر کو باہم دگر

بند کر دو جنتِ ماوا کے دروازے تمام — اور جہنم کے دہانے کھول دو بالالتزام

آسماں کو لوٹ جاتے ہیں کراماً کاتبیں

پرسشِ اعمال کا انساں کو ڈر رہتا نہیں

آنکھ مل کر اس طرح لیتا ہے انگڑائی غلام — ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتا ہے زنجیریں تمام

تیغِ ہمت ٹیک کر اٹھتا ہے صدیوں کا اسیر — دیکھتا ہے گھوم کر حیرت سے اس کو چرخِ پیر

اس کی چشمِ خشمگیں میں بجلیوں کا پیچ و تاب — اور نفس میں سینکڑوں شعلوں کا پنہاں التہاب

کوہ کا زہرہ پگھل جاتا ہے مارے خوف کے — بہ نکلتا ہے لہو رگہائے سنگ و خشت سے

اس کی ہیبت سے لرز اٹھتے ہیں دشت و کوہسار — دیوِ استبداد کو چڑھتا ہے لرزے سے بخار

آسماں پر آتشِ دوزخ فضا میں بجلیاں
عرصۂ ہستی میں ہر سو آگ کا دریا رواں

دیدنی ہوتی ہے اس ردِّ عمل کی ابتدا
گوشے گوشے سے ستمگاری کی آتی ہے صدا

متحد ہو کر بہم راندے ہوئے تقدیر کے
دام پھیلاتے ہیں ہر سو مکر اور تزویر کے

سامنے حق کے سیاست بارور ہوتی نہیں
تیرگی کو نور پر حاصل ظفر ہوتی نہیں

غیظ کا اظہار یوں کرتے ہیں تن کر اہلِ زر
جس طرح پھنکارتا ہے سانپ زر پہ بیٹھ کر

راہ میں آتے ہیں گو خاشاک کے بندِ گراں
آتشِ سیّال کا تھمتا نہیں سیلِ رواں

جھونکتی ہے موت اِن میں نیستی کی خاک جب
آنکھ سے چربی کے پردے دور ہو جاتے ہیں سب

بند ہو جاتے ہیں ان قسمت کے ہیٹوں پر مفر
بیڑیاں بن کر جکڑ لیتے ہیں ان کو سیم و زر

گھیر لیتی ہے قضا ہر موذیٔ ناکام کو
چھوڑ دیتی ہیں نجس روحیں خبیث اجسام کو

عمر بھر مزدور کا نوچا جنھوں نے جسمِ زار
نوچتے ہیں اُنکی لاشوں کو سگانِ مُردہ خوار

دہر سے مٹتا ہے اس خُبثِ مجسّم کا نشاں
سینۂ گیتی سے ٹل جاتا ہے اک بارِ گراں

توڑ دیتا ہے وہ جب ہر گردنِ مغرور کو
مردِ حُر کہتی ہے دُنیا بندۂ مجبور کو

ایک ہی جھٹکے میں دیتا ہے وہ سب کس بل نکال
ذہنِ انساں سے نکل جاتے ہیں ژولیدہ خیال

تیغ سے ہوتا ہے قائم آدمیّت کا وقار
کر نہیں سکتا کوئی انسان، انساں کو شکار

ٹھیک ہو جاتی ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
جلوہ گر ہوتی ہے پھر باغِ عناصر میں بہار

مرگ محبوب

ایک دلگداز افسانہ

حضرت سلیم - ایم - اسلم مصنف "مرزاجی" کے قلم سے

ڈاکٹر اور میں دونوں برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جاڑوں کے دن تھے اور کوئی پونے پانچ بجے کا وقت۔ کچھ پھیکی پھیکی دھوپ بھی تھی۔ ہوا بند تھی اور مارسلیز کی بیلوں میں جو برآمدے کی دیواروں کی ستر پوشی کرتی تھیں۔ پھول آئے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی چڑیا شاخ گل پر بیٹھی پروں کو سنوار رہی تھی اور شہد کی ایک موٹی سی مکھی ایک پھول پر بیٹھی پولن میں سے شہد چوس رہی تھی۔ ڈاکٹر اپنی محرم راز کے مرنے کے بعد اکثر خاموش سا رہتا وہ پہلی سی زندہ دلی اور وہ بات بات پر مذاق اب مفقود تھا۔ اتنے میں ایک لکہ ابر چشم آفتاب کے سامنے حائل ہو گیا۔

"یہ ہے زندگی کی مثال۔" ڈاکٹر نے پیالی منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔"

"کچھ فلسفی ہو گئے ہو تم۔" میں نے اپنے لئے ایک اور پیالی بناتے ہوئے کہا

"زندگی جینے کا نام ہے۔" ڈاکٹر نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"جی تو تم بھی رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی کوئی جینا ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کون کہتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ چھ سات سو روپے ماہوار کی پریکٹس بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟"

"اگر اسی کا نام زندگی ہے۔" ڈاکٹر پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تو پھر وہ تو ہوئی ختم۔"

"تو کیا آج کل مفت مریض دیکھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مفت کیوں دیکھوں" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا محنت کرتا ہوں اور روپیہ کماتا ہوں۔"

"تو پھر یہ پیش از مرگ واویلا سے کیا مطلب تمھارا؟" میں نے پوچھا۔

"تم سچے ہو بھئی۔" ڈاکٹر سر ہلا کر بولا۔ "تم کیا جانو گھر کی ویرانی کیسے کہتے ہیں؟"

"تمھیں بھی تو دوسری شادی کر لینے سے کوئی روکتا نہیں" میں نے کہا

"چلو چھوڑو اس قصہ کو۔" ڈاکٹر نے ایک ٹکڑا مٹھائی کا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ تو کہو تم نے آج کل قوت ارادی پر بھی کوئی کتاب دیکھی ہے؟"

"کوئی خاص کتاب تو نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"روحانیت کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"وہی" میں نے مسکرا کر کہا۔ "جو ہر ذی شعور کا ہوتا ہے۔"

"تو گویا تم ذی شعور بھی ہو۔" ڈاکٹر نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"شکر ہے۔" میں نے کہا۔ "آخر تم اپنی اصلیت پر تو آئے۔"

"محبت کے متعلق تمھارا خیال کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"محض دیوانگی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"دیوانگی؟" ڈاکٹر نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے یار" میں نے کہا۔ "تم اسے حماقت کہہ لو۔"

"اور تمھیں اگر احمق کہہ دیا جائے تو کوئی ڈر تو نہیں۔" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔ "خیر معلوم ہوتا ہے کہ تم اس نام سے واقف ہی نہیں ہو۔"

"بالکل نہیں" میں نے کہا۔" اور تم؟"
"مجھے اس کا بہت تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔
"کسی نرس نے بیوفائی کی ہوگی۔" میں نے ہنسکر کہا۔
ڈاکٹر ہنسنے لگا۔
"ہائے لا استاد کیوں کیسی کہی؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
بالکل غلط ——! "ڈاکٹر بولا۔ "لو میں تمھیں اپنی زندگی کا ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں۔"
"کوئی سرجیکل کارنامہ ہوگا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کوئی مردہ زندہ کیا ہوگا تم نے؟"
"نہیں" ڈاکٹر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تم ایک خانہ برباد چمن کی داستاں تو سنو۔"
"ارے" میں نے مسکرا کر کہا۔ "شاعری بھی کرنے لگے تم؟"
"شاعری نہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "بلکہ اپنی خانہ بربادی کا قصہ تمھیں سناتا ہوں۔ سنوگے؟"
"ضرور" میں نے تولیہ سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔
ڈاکٹر کہنے لگا۔

"زبیدہ سے جب میری شادی ہوئی۔ میں ہاؤس سرجن تھا، مرحومہ ہر نقطہ نظر سے ایک محبوب بیوی بننے کے قابل تھی۔ لیکن میں جو ان دنوں محبت کے رومان خیز خواب دیکھا کرتا تھا اس شادی سے کچھ کچھ خوش نہ تھا۔ مجھے ایک ایسی بیوی کی تمنا تھی جسے میں دل سے چاہوں اور وہ بھی مجھے دل سے چاہتی ہو۔ میں اکثر دل میں سوچا کرتا کہ بھلا زبیدہ کو جس سے میری جان نہ پہچان مجھ سے محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ امور خانہ داری کو خوب سمجھتی ہو۔ اسے بچوں کو کھلانے پلانے اور پرورش کرنے کا سلیقہ بھی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے میرے دکھ درد کا احساس بھی ہونے لگے اور میری عزت اور گھر کی عزت کی بھی دھن لگی رہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے مجھ سے وہ محبت ہو جس کی ایک جوان مرد کے دل میں تمنا ہوا کرتی ہے۔ یوں تو ہر عورت اپنے شوہر سے محبت کرتی ہی ہے لیکن میں زن و شو والی محبت کا قائل نہ تھا۔ میری نگاہ میں اس محبت کی ایک مقدس معاہدے سے زیادہ کچھ وقعت نہ تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میری بیوی مجھے محض میرے لئے چاہے تم جانو جس شخص کو ایسے خیالات پریشان کرتے رہتے ہوں وہ بھلا عورت کو اپنی زندگی کا ایک ضروری اور لازمی جزو ہونے کے سواء اور کیا سمجھ سکتا ہے۔ تم اُسے بیٹر ہاف تو کہتے ہو اور جہاں تک امور خانہ داری کا تعلق ہے میں بھی اسے اپنی زندگی کا بیٹر ہاف ہی سمجھتا ہوں لیکن محبت کسی اور ہی چیز کا نام ہے۔ عام طور پر عورت محبت کا اظہار بہت کم کیا کرتی ہے۔ کیونکہ مرد کی نسبت اسے اپنے جذبات پر بہت زیادہ قابو ہوتا ہے۔ اور وہ اکثر اسی خیال میں خوش رہتی ہے کہ اُسے کسی سے محبت ہے۔ وہ کسی کو دل سے چاہتی ہے یعنی؎

رہی مجھکو عیش دوام ہے جو کرے تو ایک نظر سے خوش

خیر —! کچھ زمانہ اسی طرح گذر گیا۔ ایک تو میری ملازمت ایسی کہ بہت سا وقت ہسپتال میں گذرتا اور جو گھڑی دو گھڑی کو گھر آبھی جاتا تو بس ادھر کھانا کھایا اور اُدھر مردانے میں آبیٹھا۔ بہت ہوا تو گھر ہی میں پڑے پڑے اونگھ لیا۔ گو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ زبیدہ غریب تو آنکھیں فرش راہ کئے رہتی۔ میرے گھر میں قدم رکھتے ہی اس غریب کی دنیا پلٹ جاتی۔ سو سو طرح سے میری خاطر و مدارات کرتی۔ ذرا ذرا سی بات پر مسکرا دیتی اور جن نظروں سے مجھے دیکھا کرتی .. . افسوس! آج کوئی مجھ سے ان کی کیفیت پوچھے بہرکیف اس کے یہ انداز دیکھ کر مجھے بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ زبیدہ کو واقعی مجھ سے محبت ہے۔ اور وہ میری محبت کی متمنی بھی ہے لیکن ہم لوگوں کا تمدن ہی کچھ ایسا ہے کہ ایک بھرے گھر میں میاں بیوی جوان تو رہے ایک طرف بوڑھے ہو کر بھی کبھی آپس میں ہنسی مذاق نہیں کر سکتے۔ اسی اثناء میں میری تبدیلی ہو گئی۔ اور میں ایک ڈسٹرکٹ ہسپتال کا انچارج ہو گیا۔ مجھے اس نئی جگہ آئے ایک دو مہینے ہو چکے تھے ہسپتال کا کام بھی اچھا تھا اور پریکٹس بھی اچھی خاصی تھی لیکن طبیعت کچھ اداس سی رہتی۔ جب کام سے فارغ ہو کر گھر آتا تو وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس جگہ آکر مجھے پہلی بار یہ احساس ہونے لگا کہ مجھے زبیدہ سے محبت ہے چنانچہ جلد ہی میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہی گھر جو مجھے پہلے سونا سونا نظر آتا تھا زبیدہ کے

میکدس نظر بن گیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اب جب حجاب اٹھا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ ازدواجی زندگی کی لذتیں اور راحتیں کیا ہوتی ہیں اور جو گھر میں سکھ اور چین ہو تو امور خانہ داری کتنے دلچسپ مشاغل بن جاتے ہیں۔

زبیدہ کی حالت یہ کہ وہ بات بات پر جان چھڑکتی۔ میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے زبیدہ کی محبت کا تم کچھ اندازہ لگا سکو گے،

یہی جاڑے کے دن تھے اور شام کا وقت میں اور زبیدہ برآمدے میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں دو آدمی موٹر لے کر آئے اور مجھے ایک مریض کو جو شہر سے کچھ فاصلے پر کسی قصبہ میں رہتا تھا دیکھنے کو کہا۔ یہ قصبہ کوئی پندرہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں کھانے کے وقت تک آجاؤں گا۔ خیر جب میں مریض کے مکان پر پہنچا تو اس کی حالت بہت خراب تھی اور مجھے خلاف توقع بہت وقت تک رکنا پڑا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر کہیں ٹیلیفون قریب ہوتا تو میں زبیدہ سے کہہ دیتا کہ میں گیارہ بجے تک واپس آسکوں گا۔ اب تم اسے محض اتفاق ہی سمجھو کہ جب میں مکان پر پہنچا تو اس وقت گیارہ ہی بج رہے تھے۔ موٹر سے اتر کر جب میں اندر گیا تو زبیدہ کھانے والے کمرے میں کھڑی ملازمہ سے کھانا لانے کو کہہ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ "آگئے آپ،" اس نے کہا۔

"ہاں" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں تو آگیا لیکن تم ابھی تک سوئیں کیوں نہیں۔ اس شدت کی سردی میں اتنی دیر تک کیوں بیٹھی رہیں؟"

"آپ ہی نے تو کہا تھا" زبیدہ مسکرا کر بولی۔ "کہ میں گیارہ بجے تک آؤں گا۔ کہا تھا نا؟"

میں تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ،" اس نے پھر ہنس کر کہا۔ "جھوٹ تو نہیں کہا تھا میں نے"

"زبیدہ ــــ؟"

"جی ــــ!"

پھر ہنس کر "کچھ کہئے تو سہی آپ سوچ کیا رہے ہیں؟"

اتنے میں ماما کھانا لے آئی، ہم دونوں بیٹھ کر کھانے لگے۔

میں نے کہا۔ "زبیدہ مجھے خیال تو آیا تھا کہ اگر کہیں ٹیلیفون قریب ہو تو تمہیں کہہ دوں کہ گیارہ بجے تک آؤں گا۔ لیکن ....."

"لیکن" وہ ہنس کر بولی۔ "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" پھر میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر۔ "ٹھیک ہے نا؟"

"اب اس کا تم خود ہی اندازہ کرلو" ڈاکٹر کہنے لگا۔ "کہ زبیدہ کو مجھ سے کتنی محبت تھی۔ خدا کی قسم تم چاہو تو میں تمہیں ایسے بیسیوں واقعات سنا سکتا ہوں۔ ادھر میں نے کسی بات کا ارادہ کیا اور ادھر زبیدہ کو اس کا احساس ہوگیا۔ صرف احساس ہی نہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کیلئے تیار ہوں کہ میرے خیالات اس کے دل پر نقش ہوجاتے تھے لیکن آخر محض میری حماقت سے اس غریب کو اتنا صدمہ پہنچا کہ اس نے اس دنیا ہی سے منہ موڑ لیا۔ کچھ دنوں سے ہسپتال میں ایک نئی نرس آئی تھی۔ یہی کوئی ۲۰ یا ۲۱ سال کی ہوگی لیکن تھی حسین اور شوخ وطرار۔ اور۔۔"

"اور" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تم اس پر لٹو ہوگئے"۔

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "کبھی مذاق چھوڑو گے تم بھی"

"اچھا پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "لو اب نہ بولوں گا۔"

"تو خیر" ڈاکٹر کہنے لگا۔ "یہ نئی نرس بہت محنت سے کام کرتی تھی اور سرجیکل اپریشن میں مجھے بہت مدد دیتی تھی۔ ایک روز ایک بچہ اپریشن کے دوران میں مرگیا۔ اس کے والدین ہسپتال میں موجود تھے مامتا کی ماری ماں کی گریہ وزاری دیکھ کر دل پھٹا جاتا تھا اور باوجود ہزار ضبط کے میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ میں کام کاج چھوڑ کر باغیچہ میں آبیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نرس بھی آگئی اور میرے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔"

"تم رو رہی تھیں نرس؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر" وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "ان بچوں کو موت کیوں آتی ہے؟"

"تقدیر" میں نے جواب دیا۔

"میں تقدیر کی قائل نہیں" نرس بولی۔

پھر ایک آہ بھر کر کہنے لگی۔ "اس مامتا کی ماری کی حالت تو مجھ سے

دیکھی نہ جاتی تھی۔ تو بہ ہے کس طرح بھینچ بھینچ کر بچے کی لاش کو گلے سے لگاتی اور منہ پر منہ رکھکر آوازیں دیتی تھی۔ اور۔۔۔۔۔"

"نرس" میں نے کہا۔ "چھوڑو اس قصے کو۔"

"ڈاکٹر! تمہارا بھی کوئی بچہ ہے؟"

"نہیں" میں نے کہا۔ "اگر بچوں کا داغ دیکھنا قسمت میں ہو تو پھر اس سے بے اولاد رہنا ہی بہتر ہے۔"

"شادی ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟" نرس نے پوچھا۔

"کوئی دو سال" میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں اور وہ جو افسری اور ماتحتی کا ایک حجاب سا تھا آج وہ بھی اٹھ گیا۔ اور اس روز سے فرصت کے اوقات میں ہم دونوں کسی پیڑ کے سائے میں جا بیٹھتے۔ باتوں کی ابتداء تو ہسپتال کے کام کاج سے ہوتی لیکن جب اٹھتے تو محبت کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے۔ مجھے نرس کی باتوں میں بہت لطف آتا اور وہ بھی مجھ سے خوب خوب ہنس کر باتیں کیا کرتی۔

اب ایک روز کا واقعہ سنو۔ ہم باغ میں بیٹھے تھے آج نرس نے ایک ہلکے زرد رنگ کی ساڑی پہنی تھی اور ہم سے ذرا فاصلے پر ایک ما ریلبز کا پودا اپنے جوبن پر اترا رہا تھا۔ نرس اٹھ کر ایک پھول توڑ لائی اور میرے کوٹ کے بٹن ہول میں لگا دیا۔

"نرس" میں نے کہا۔ "بڑی سنگدل ہو تم۔"

"میں سنگدل ہوں یا آپ؟" اس نے ذرا جھجک کر کہا۔

"میں کیسے ۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیسے ۔۔۔؟" وہ بولی۔ "ڈاکٹر پانچ سات آدمی ہر روز چیر پھاڑ ڈالنے کون کہتا ہے کہ سنگدلی ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ موت کے منہ سے بچا لیتا ہوں۔"

"اچھا" نرس نے یہ 'اچھا' لمبا کر کے کہا۔ "تو میں کیسے سنگدل ہوں؟"

میں نے پھول بٹن ہول سے نکالتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس کی رگ حیات جو کاٹ ڈالی۔"

"ڈاکٹر!" نرس ذرا سر ہلا کر کہنے لگی۔ "پھول کی قدر و منزلت شاخ سے ٹوٹ کر ہی ہوا کرتی ہے۔"

"تم بھی تو ایک پھول ہی ہو" میں نے ہنس کر کہا۔ "جو تمہیں کاٹ ڈالے تو ۔۔۔؟"

"تو پھر کیا ہو؟" نرس نے پوچھا۔

"کیا ہو؟" میں نے کہا۔ "نہ یہ رنگ رہے اور نہ یہ بو۔"

"ڈاکٹر!" نرس ہنس کر کہنے لگی "عورت کا رنگ بو اسی وقت کھلتا ہے جب وہ کسی قدردان کے پلے پڑے۔"

"قدردان کا ملنا تو کچھ مشکل نہیں" میں نے کہا۔ "لیکن قدر کرانی کچھ آسان نہیں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں" نرس نے جواب دیا۔ "اب اٹھئے آپ کی بیگم صاحبہ آپ کی راہ دیکھتی ہونگی۔"

"تم نے کیسے جانا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ ہی تو کہا کرتے ہیں" نرس ہنس کر کہنے لگی۔ "کہ آپ کی بیگم صاحبہ آپ کے ساتھ کھانا کھایا کرتی ہیں۔"

"خیر" میں نے ہنس کر کہا۔ "آج اکیلی ہی کھالینگی لیکن ایک بات کی داد میں بھی دونگا۔"

"داد؟" نرس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے! کیسی؟"

"اس آزاد خیالی کی" میں نے کہا۔

نرس ہنس کر بولی۔ "آخر میں بھی تعلیم یافتہ ہوں۔"

"تعلیم کا رنگ تو تم پر خوب چڑھا۔"

اس وقت ہوا تیز چلنے لگی تھی اور نرس کی کالی کالی زلفیں کچھ اس طرح لہرا رہی تھیں جیسے سپیرے کی بین سے ناگ مست ہو کر جھومنے لگتا ہے اور نرس بار بار انھیں اپنے خوبصورت ہاتھوں سے پیچھے ہٹاتی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ کالے ناگ تو تم نے خوب پال رکھے ہیں۔"

اور وہ ذرا آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "ان کا کاٹا پانی نہیں مانگا کرتا۔"

"لیکن" میں نے کہا۔ "ناگ والے کے پاس ناگ کے کاٹے کا تریاق بھی ضرور ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہوگا" نرس بولی۔ "میرے پاس تو نہیں۔"

"ہے کیوں نہیں" میں نے کہا۔

"کہاں ہے؟" نرس نے میری [illegible]

"یہ جو ہیں" میں نے اس کے سُرخ سُرخ ہونٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ زہر چوس لیتے ہیں"۔
"کیسے ۔۔۔؟" نرس نے پوچھا۔
"یوں!" میں نے اس کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے کہا۔
اس نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے مُنہ ڈھانپ لیا۔

جب میں گھر پہنچا تو زبیدہ ایک صوفے پر لیٹی کتاب دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں جب ذرا کبھی دیر سے آتا تو سب سے پہلے وہ یہی پوچھا کرتی کہ "کہاں رہے آپ اتنی دیر؟" لیکن آج اس نے نہیں پوچھا اور کچھ یوں ہی گم سم سی لیٹی رہی۔
"لیٹ رہی ہو" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
"بس ایسے ہی"۔ اس نے کچھ افسردگی سے جواب دیا۔
"اٹھو نا!" میں نے کہا۔ "کھانا منگواؤ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے"۔
"آپ کھائیے"۔
"اور تم ۔۔۔؟"
"مجھے بھوک نہیں"۔
"بھوک نہیں" میں نے پوچھا۔ "کیوں طبیعت تو اچھی ہے؟"
"جی ہاں! اچھی ہے"۔
پھر میں نے اکیلے ہی کھانا کھا لیا۔
اس واقعہ کو بہت روز ہو چکے تھے۔ اور نرس مجھ سے کچھ زیادہ بے تکلف ہوتی چلی جاتی تھی۔ لیکن زبیدہ اب وہ پہلی سی زبیدہ نہ تھی، نہ وہ بات بات پر ہنسنا۔ نہ میری ہر بات پر مسکرا دینا اور ہر کام میں دلچسپی لینا۔ یہ باتیں اب بہت کم ہو گئی تھیں۔ میرے آرام اور گھر کے انتظام کا تو اسے اب بھی خیال ہوتا تھا لیکن اب وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی کچھ پریشان سی، کچھ اداس اداس سی۔ تفکرات میں ڈوبی ہوئی۔ میں جو کبھی پوچھتا تو وہ ٹال جاتی۔ ابتدا میں تو میں نے کچھ زیادہ خیال نہ کیا لیکن جب وہ زیادہ نڈھال رہنے لگی تو ایک دن میں نے کہا۔
"زبیدہ تم کہو تو ہم اپنے عزیزوں میں سے کسی کا بچہ لے لیں"۔
"کیوں؟" اس نے تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اسی لئے تو تم اداس اداس رہتی ہو"۔ میں نے کہا۔
"نہیں" "جب خدا نے ہمیں نہیں دیا تو کسی اور کا لیکر کیا پالنا۔" وہ افسردگی کے ساتھ بولی۔
"تمہارا جی تو بہلا رہے گا"۔ میں نے کہا۔
"بہل چکا"۔ اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔
"زبیدہ!" میں نے ہنسکر کہا۔ "اب تم وہ پہلی سی زبیدہ نہیں رہی ہو نہ کبھی ہنس کر بات کرتی ہو۔ نہ کبھی پیار نہ محبت"۔
"جب آپ ہی مجھے بھول گئے تو پھر آپ کو میرے ہنسنے کھیلنے سے کیا واسطہ؟" یہ کہتے ہوئے اس نے دوپٹہ سے مُنہ ڈھانپ لیا۔
"میں تمھیں بھول گیا"۔ میں نے اس کے مُنہ پر سے دوپٹہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "کیا کہہ رہی ہو زبیدہ؟"
"جھوٹ تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں" اس نے جواب دیا۔
"سمجھ گیا"۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "میں جو دیر سے آتا ہوں تو تمھیں اس سے ملال ہوتا ہے"۔
یہ سن کر وہ میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھنے لگی کہ میری آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ لیکن میں نے ایک قہقہہ لگایا اور اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔
"اچھا بھول ہو گئی زبیدہ مجھے معاف کر دو زبیدہ"۔
"کیا معاف کر دوں؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"وہی جو تم خیال کر رہی ہو؟"
"خیال" اس نے خیال کو ذرا لمبا کر کے کہا۔ "یا حقیقت"۔
"حقیقت" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیسی حقیقت"۔
"کہہ دوں؟" وہ ذرا مسکرا کر بولی۔
"تمھیں میرے ہی سر کی قسم ہے" میں نے کہا۔ "سچ کہہ دو"۔
"آپ کا دل کہاں ہے؟" اس نے کہا۔
"میرا دل؟" میں نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا "میری زبیدہ کے پاس"۔
"جھوٹ کہتے شرم تو نہیں آتی" وہ بولی۔ "نرس کے پاس کہئے"۔
یہ سن کر میں بہت تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کس نے کہا تم سے ؟" میں نے پوچھا۔

"دل نے" اس نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

میں یہ سن کر کچھ چپ سا ہو گیا۔

"اب بولتے کیوں نہیں ؟"

میں کھسیانہ ہو کر ذرا مسکرا دیا۔

"زبیدہ !" میں نے کہا۔ "تمھیں تو الہام ہونے لگا۔"

"نہیں" وہ سر ہلا کر بولی۔ "افسوس آپ نے کبھی عورت کی محبت اور اس کی فطرت کا کبھی مطالعہ نہیں کیا۔"

میں یہ سن کر چپ ہو گیا۔

اس گفتگو کو کئی روز ہو چکے تھے۔ سچ جانو یہ دیکھ کر کہ میری بیہودگی سے زبیدہ کا دل دکھا ہے مجھے نرس سے کچھ نفرت سی ہونے لگی اور میں اول تو وقت پر اور کبھی وقت سے پہلے ہی گھر واپس آ جاتا لیکن زبیدہ کی طبیعت بگڑتی ہی چلی گئی اور اسے اب کچھ بخار سا بھی رہنے لگا۔ سب کچھ ہوتے ہوتے اس بخار نے بھی ایک تشویشناک صورت اختیار کر لی۔ شہر کے دو مشہور معالج میں نے اس کے علاج پر مقرر کر رکھے تھے لیکن ہوا وہی جس کا مجھے کھٹکا تھا۔ زبیدہ غریب دو اڑھائی مہینے کی مسلسل بیماری کے بعد گوشہ قبر میں جا سوئی۔"

سورج ڈوب رہا تھا اور شفق لال چندریا اوڑھے پہلی شب کی دلہن بن کر بام و در پر مجلس جما رہی تھی۔ سارسلیز کی بیلوں پر بھی اداسی چھا رہی تھی۔ اب نہ تو وہ چڑیا ہی کہیں نظر آتی اور نہ وہ شہد کی مکھی جو کسی آشفتہ مزاج کی طرح پھولوں پر فریفتہ ہو رہی تھی۔ ہاں زرد رنگ کی ایک تیتری کہیں سے آ گئی تھی اور پتیوں کی چادر میں رات بسر کرنے کے لئے منہ چھپا رہی تھی۔

ایم۔ اسلم

بادۂ الست

از جناب حمید صاحب دہلوی

ساری دنیا گوش بر آواز ہو کر رہ گئی — راز میں جو گفتگو تھی راز ہو کر رہ گئی

اللہ اللہ سرکشیدہ حسن کا اوج غرور — ہر بلندی فرش پا انداز ہو کر رہ گئی

وہ ستم کیا جو توجہ سے نہ بر سر آ سکے — وہ نظر کیا جو غلط انداز ہو کر رہ گئی

اک نشیمن پر پہنچنی تھی قفس کی زندگی — کیوں طبیعت مائل پرواز ہو کر رہ گئی

اپنی غم انجام قسمت کا کہاں ماتم کروں — داستان آرزو آغاز ہو کر رہ گئی

معنی و مفہوم سے قاصر رہا ہر ذہن و فہم — میری ہستی غیب کی آواز ہو کر رہ گئی

پھونک دی روح جنوں حمید تن پژمردہ میں
ہر کلی گویا لب اعجاز ہو کر رہ گئی!

ترنّمات

از جناب محشر عابدی ایم۔ ایس۔ سی

وہ آج بزمِ غیر میں یوں بے نقاب ہے — کانٹوں میں جیسے کوئی شگفتہ گلاب ہے

یہ کون رشکِ مہر ہوا رونقِ چمن — ہر ذرہ عکسِ حسن سے اک آفتاب ہے

اک برق کوندنے لگی آنکھوں میں دیکھکر — کافر ترا شباب غضب کا شباب ہے

مجھ سے نگاہِ یار یہ افسانہ کہہ گئی — اس حسن کی بہار بھی اک نقشِ خواب ہے

ہے داستانِ حسن و شباب اتنی مختصر — اک موجِ بادہ ایک خمارِ شراب ہے

تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا — اک انقلاب باعثِ صد انقلاب ہے

تو جانتا ہے میرے گناہوں کی حد نہیں — میں جانتا ہوں لطف ترا بیحساب ہے

محشرؔ ہے چاندنی بھی چمن بھی شراب بھی
ساقی نہیں تو ہیچ شراب و کباب ہے

ہندوستان[1] کے متعلق بابر کی رائے

از جناب سید یوسف صاحب بخاری دہلوی

علمِ تاریخ کا جغرافیہ سے بہت بڑا تعلق ہے۔ کسی ملک کے تاریخی حالات جاننے اور سمجھنے کے لئے اس ملک کا جغرافیہ جاننا ضروری ہے کیونکہ اس کی قدرتی تقسیم اور آب و ہوا کا اثر اس کے باشندوں کے طریق معاش، ان کی ترقی تنزل اور تمدن و معاشرت پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ کا شوق روز بروز بڑھ رہا ہے، گذشتہ دس سال کے عرصہ میں مورخوں نے ہندوستان کی تاریخ قدیم و جدید کی تحقیقات کر کے علمِ تاریخ میں ناقابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اس وقت بھی ہماری گفتگو کا موضوع ہندوستان ہی کے متعلق ہے۔ اس مختصر تقریر میں یہ بتانا ہے کہ ہمارے ہندوستان جنت نشان کے بارے میں بابر بادشاہ نے کیا رائے قائم کی اور وہ ٹھیک تھی یا غلط۔

بابر نے ہندوستان کا مفصل بیان اپنی مشہور اور ہر دلعزیز کتاب تزک بابری میں لکھا ہے۔ ہندوستان کے جغرافیہ کے علاوہ اس میں اس کے ۸۹۹ سے ۹۳۶ ہجری تک کے تقریباً تمام سوانح حیات موجود ہے۔ بابر نے اس کو اپنی مادری زبان ترکی میں لکھا اور اکبر کے سن جلوس ۳۴ مطابق ۹۹۸ ہجری موافق ۱۵۹۰ عیسوی میں مرزا خان خاناں نے ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ بابر کا طرز ادا اور انداز بیان اس غضب کا ہے کہ اگر مطالعہ کیجئے تو کہیں افسانہ کا مزہ آتا ہے کہیں تاریخ کا لطف، کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے کسی بڑے محقق جغرافیہ داں کا جغرافیہ پڑھ رہے ہیں جن ملکوں میں وہ رہا لڑا بھڑا، وہاں کے رزم و بزم کے نقشے اس طرح کھینچے ہیں گویا آپ ان واقعات کو بچشم خود ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ پہاڑوں کا نقشہ، برف گرنے کا منظر، سبزہ کا لہلہانا، دریاؤں اور نہروں کا بہنا۔ باغوں کی بہار جنگلوں کی کیفیت۔ نباتات اور حیوانات کے متعلق مفصل حالات اور ان کے واسطے حکمتیں اور ترکیبیں لکھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو قدرتی اشیا کے بیان کرنے کی ایک قدرتِ خداداد حاصل تھی آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ ہندوستان کے متعلق بابر کی رائے ہماری آپ کی رائے سے زیادہ اچھی نہیں لیکن اس سے ہم کو بدظن ہونا نہیں چاہئے کیونکہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا اور جو کچھ اس کے تجربہ میں آیا وہی اس نے لکھا اور وہ بھی اپنے اہل ملک کی فہمائش کے لئے جن کو اس نے اپنا جانشین چھوڑا۔

جن لوگوں نے ہند مغلیہ کی تاریخ اور بالخصوص بابر کا حال پڑھا ہے ان کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ بابر نے صرف ۴۸ برس کی عمر پائی اور ۳۶ سال حکومت کی۔ لیکن ابتدائے حکومت کا بیشتر حصہ لڑائی اور خانہ بدوشی کی حالت میں گزرا۔ کبھی وہ اپنا آبائی دارالسلطنت سمرقند فتح کر لیتا ہے تو کبھی اپنے باپ کے ملک فرغانہ سے بھی محروم ہو کر اپنی جان عزیز بچانے کے لئے پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں اور چٹانوں پر بھاگتا نظر آتا ہے۔ کبھی وہ کابل کے مرغزاروں اور باغوں میں مزے اڑاتا دکھائی دیتا ہے تو کبھی برف کاٹ کر فوج کے لئے راستہ بناتا نظر آتا ہے۔ کبھی سر پر تاج کبھی ہاتھ میں مٹی کا کاسہ، کبھی تخت اور کبھی بوریا بھی نہیں۔ اگر اس کو کھانے اور سونے کا موقع مل گیا تو وہ کہتا ہے۔ آج میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور نیند بھر کر سویا۔ سچ پوچھو تو رنج و مصیبت [illegible]

---

۱ - یہ مضمون ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کو بدھ کے دن آل انڈیا دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا اور بعد حصول اجازت شائع کیا جاتا ہے

عیش و عشرت کرنا صرف بابر ہی کا کام تھا۔

اُس کی اس غیر مستقل اور ہر گھڑی اور ہر آن میں بدلنے والی زندگی سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کو ہندوستان میں رہنے اور ہندوستانیوں سے ملنے جلنے، اُن کے ملت و اخلاق پرکھنے اور رسم و رواج کو معلوم کرنے کا بہت ہی کم موقعہ ملا۔ اگر اس کو مفصل واقعات اور حالات کا علم ہوتا تو یقیناً اس کے دل و دماغ پر ہرگز ایسا نقش نہ بیٹھتا جس کو ہم آج پڑھ کر حسرت اور افسوس کرتے ہیں۔ بہر حال اب ہمیں اس ضروری تمہید اور تبصرہ کے بعد یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اس نے اپنے اُس پُر آشوب اور مختصر زمانے میں کیا کیا دیکھا وہ لکھتا ہے۔

"ہندوستان نہایت وسیع آباد اور سیر حاصل ملک ہے اور ایک عجب جگہ واقع ہوا ہے۔ اس کا کچھ حصہ اقلیم اول میں شامل ہے اور کچھ حصہ اقلیم دوم اور سوم میں۔ ہندوستان ہماری ولایت سے بالکل جدا حیثیت رکھتا ہے۔ پہاڑ دریا۔ جنگل۔ جانور۔ نباتات۔ آدمی۔ زبان ہوا۔ اور یہ سب چیزیں مختلف ہیں۔ کوہستان کشمیر میں جو لوگ آباد ہیں ان کو "کس" کہتے ہیں "میر" سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی پہاڑ کے ہیں۔ لہذا "کس" اور "میر" مل کر "کسمیر" ہو گیا چونکہ اہل ہند ش کو شاید سین بولتے ہیں اس لئے کشمیر سے کسمیر ہو گیا ورنہ فی الاصل کشمیر ہی ہے۔ اس پہاڑ کی اجناس مشک نافہ۔ غرناس بکری۔ زعفران سیسہ اور تانبہ ہیں۔ ہندو اس کو "سوالک پربت" بھی کہتے ہیں یعنی سوا لاکھ پہاڑوں والا پہاڑ۔ اس پہاڑ پر بارہ مہینے برف رہتی ہے اس کے علاوہ اور پہاڑوں اور دریاؤں کا بیان اس نے ایسا ہی لکھا ہے جیسا کہ آجکل جغرافیوں میں لکھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں متعدد شہر ہیں لیکن ایک دوسرے سے بالکل مختلف۔ اتنے زیادہ شہر اور ایسا نمایاں اختلاف جو ہندوستان کے شہروں میں ہے کسی اور ولایت میں نہیں۔ اس ملک میں یہ عیب ہے کہ سوائے دریاؤں کے اور آب رواں کہیں نہریں نہیں ہیں لیکن جہاں نہر جاری ہے وہاں کی زراعت اور باغات سرسبز ہیں۔ بڑے بڑے درختوں کی پود کو برس دو برس رہٹ یا چرس سے پانی دیا جاتا ہے جہاں وہ بڑے ہو گئے پھر پانی دینے کی ضرورت نہیں البتہ ترکاریوں وغیرہ کو پانی دیتے رہتے ہیں۔

ہندوستان کے شہر بہت غلیظ ہیں۔ تمام زمینیں ایک وضع کی ہیں۔ اکثر باغات میدان میں بغیر دیوار کے ہوتے ہیں۔ اکثر دریاؤں اور ندیوں کے کنارے اور جہاں گھاس ہوتی ہے برسات میں دلدل ہو جاتی ہے۔ کہیں کہیں کنوئیں اور تالاب ہیں جن میں پانی بھرا رہتا ہے اور برسات میں اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ تمام شہروں کی گذر اوقات اسی پانی پر ہے۔

ہندوستان میں شہروں اور دیہاتوں کا آباد ہونا اور اجڑنا بھی ایک معمولی کھیل ہے۔ بڑے سے بڑے شہر میں جہاں لوگ برسوں سے آباد ہوں اگر اس کو چھوڑ دیں اور وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوں تو ایک آدھ ہی روز میں اس طرح غائب ہو جاتے ہیں کہ ان کی بود و باش کا کوئی آثار اور نشان باقی نہیں رہتا اور اگر آباد ہونا چاہیں تو ان کو نہ نہر کھودنے کی ضرورت ہے نہ بند باندھنے کی نہ مکان بنانے کی اور نہ دیوار چننے کی۔ بس لوگ جمع ہو گئے ایک معمولی سا حوض یا کنواں کھود لیا۔ گھاس پھوس اور درختوں کی لکڑیوں سے جھونپڑیاں بنالیں اور زراعت پائی۔ آن کی آن میں ایک گاؤں یا چھوٹا سا ایک شہر آباد ہو گیا۔

ہندوستان کے مخصوص جانوروں یعنی چرندوں پرندوں اور درندوں میں ہاتھی۔ گینڈا۔ نیل گائے۔ کوتہ پا۔ کلہرہ یا کالا ہرن۔ بارہ سنگھا بندر۔ لنگور۔ نیولا یا موش خرما۔ گلہری۔ مور۔ طوطی۔ مینا۔ لوحیا یا بطموں شر کہل۔ پل کار۔ شام۔ لودہ۔ چرخل۔ حرتر۔ باغری خرا۔ وتنگ سارس۔ سنکسار۔ ککلک۔ ڈیک کلاں۔ مرغابی۔ زرمج۔ بسار اور الہ فرخ سیراغ۔ چمگادڑ۔ عکہ یا مسیا۔ ممولہ۔ ککرکرچہ۔ کوئل اور آبی جانوروں میں تیسرابی۔ بیسار۔ دریائی سور۔ کلستہ۔ تیہ۔ گھڑیال۔ کلکہ ماہی مینڈک کا احوال نہایت مفصل اور خوب واضح لکھا ہے۔ اس وقت ان کا حال معلوم کرنا بیکار ہے۔ کیونکہ ہم میں سے اکثر لوگوں کو ان کی بابت بہت کچھ معلوم ہے۔

ہرن۔ تیتر۔ کبک دری۔ بودنہ۔ حرتر۔ مرغابی اور مچھلی کے گوشت کو نہایت عمدہ اور مزیدار بتایا ہے۔ مور کے گوشت کو بھی لذیذ لکھا ہے لیکن اس کے بارے میں کہتا ہے کہ اونٹ کے گوشت کی

طرح سور کا گوشت بھی ذرا کراہت سے کھایا جاتا ہے۔

نباتات میں آم۔ کیلا۔ املی یا خسانی ہزری۔ مہوبہ۔ کھرنی۔ جامن۔ کمرک۔ کٹھل۔ بڑھل۔ بیر۔ کروندہ۔ نسالہ۔ گولر۔ آملہ۔ چرونجی۔ کھجور۔ ناریل۔ تاڑ۔ نارنج۔ لیمو۔ ترنج۔ سنترہ۔ کلکل۔ امل بید۔ نارنگی وغیرہ کا ذکر تحریر میں لایا ہے۔ پھلوں میں اس نے سب پھلوں پر آم کو ترجیح دی ہے۔ آم کے علاوہ باندے کے بیر۔ کلکتے کے کیلے۔ حاجی پور کی نارنگی اور ترنج کے شربت کو نہایت عمدہ اور میٹھا بتاتا ہے۔ نارنج۔ کمرک۔ نیسالہ۔ کلکل امل بید کو بہت رسیلا اور لذیذ۔ آملہ کے مربّہ کو مفید اور نیبو کے عرق کو زہر کا تریاق لکھا ہے۔ املی کے درخت کو خوبصورت مہوہ کی لکڑی کو مکانوں کے لئے کار آمد۔ کٹھل کو اوجھڑی کی مانند بدصورت اور بڑھل کو صرف بدمزہ بتایا ہے۔ تاڑ کے پتّوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ ان کی لمبائی تقریباً گز بھر ہوتی ہے۔ ہندی تحریریں اکثر انہی پتوں پر لکھی جاتی ہیں۔ اور انہی پتّوں کے بلے بنا کر کانوں میں بھی پہنے جاتے ہیں۔

پھولوں میں جاسوں ماکربل۔ کینر۔ کیوڑا۔ کیتکی۔ چنبیلی۔ چمپا۔ گلاب اور نرگس کو بیان کیا ہے۔ کہتا ہے کینر کی بو نہایت بھینی بھینی۔ چمپا کی بہت مست اور چنبیلی کی بہت تیز ہے۔ کیوڑے کی بو بھی نہایت لطیف ہے لیکن صورت عجب طرح کی ہے۔ کربل کی کلی ایک بار کھلتی ہے پھر اس میں سے ایک چیز دل کی ہم شکل نکلتی ہے پھر اس کی پتیاں کھل کر پھول ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب بات ہے۔

ہندوستان میں تین فصلیں ہوتی ہیں۔ چار مہینے گرمی۔ چار مہینے برسات اور چار مہینے جاڑا۔ مہینوں کے نام یہ ہیں۔ چیت۔ بیساکھ۔ جیٹھ۔ اساڑھ۔ ساون۔ بھادوں۔ کوار۔ کاتک۔ اگہن۔ پوس۔ ماہ۔ پھاگن۔ دنوں کے نام یہ ہیں۔ اتوار۔ سنیچر یا سومتوار۔ منگلوار۔ بدھوار۔ برسپتوار۔ سکروار۔

اہل ہند نے رات دن کے ساٹھ حصّے کئے ہیں۔ ہر حصّہ کو گھڑی کہتے ہیں۔ پھر رات اور دن کے چار چار حصّے کئے ہیں اور ہر حصّہ کو "پہر" کہتے ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں لوگ مقرر ہیں ان کو "گھڑیالی" کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا کام صرف یہ ہے کہ وقت مقررہ پر گھڑیال بجا کر لوگوں کو وقت سے مطلع کرتے ہیں کہ اس وقت دن یا رات کی کونسی گھڑی اور پہر ہوئی۔

ہندیوں نے اپنے وزن بھی آپ مقرر کئے ہیں۔ جو رتی سے سو من یعنی ایک "مینا" سے "ٹنک" پہنچتے ہیں۔ موتیوں اور جواہرات کو "ٹانک" سے تولتے ہیں۔ اسی طرح عدد کی مقدار بھی خوب مقرر کی ہے جو سینکڑہ سے سو پدم یعنی ایک سنکھ تک پہنچتی ہے۔ عددوں کا اس تعداد پر مقرر کرنا اہل ہند کے مالدار ہونے کی دلیل ہے۔

ہندوستانی اکثر بُت پرست ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہندو کہلاتے ہیں۔ اکثر مسئلۂ تناسخ کے قائل ہیں اور اپنے اپنے قبیلہ کا نام جدا جدا رکھتے ہیں۔ اہل حرفہ اپنا آبائی پیشہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں حسن و لطافت بہت کم ہے۔ عقل و فہم بھی زیادہ نہیں رکھتے۔ میل جول کی خوبُو۔ ادب اور لحاظ۔ مروّت و مہربانی جیسی کہ ہونی اور برتنی چاہیئے وہ نہیں پائی جاتی۔ اپنے ہنر اور پیشے کی ترکیبوں سے بھی زیادہ واقف نہیں۔ اچھا گھوڑا اور عمدہ گوشت نہیں ملتا۔ انگور خربوزے اور میوے خراب ہوتے ہیں۔ نہ برف ہے نہ ٹھنڈا پانی۔ بازاروں میں جو کھانے اور روٹیاں بکتی ہیں وہ سب خراب۔ حمام۔ مدرسہ۔ شمع۔ مشعل اور شمعدان کا نام نہیں۔ ان کی بجائے ایک دیوٹ ہوتا ہے اس کو چراغدان بھی کہتے ہیں کپّی سے تیل ڈال کر بتی جلائی جاتی ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں دیوٹ ہوتے ہیں۔ بادشاہوں اور امیروں کو اگر رات کے وقت شمع کی ضرورت ہو تو یہی دقیانوسی چیکٹ بھرا ہوا آتا ہے۔ بڑے دریاؤں اور ندیوں کے علاوہ تمام نالے گرمی اور جاڑے میں خشک پڑے رہتے ہیں۔ باغوں اور مکانوں میں نہریں نہیں ہوتیں اور نہ عمارتوں میں کوئی ہوا کا انتظام اور نہ کوئی حسن و خوبصورتی۔ عوام لنگوٹہ باندھتے ہیں اور ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ عورتیں دھوتی باندھتی ہیں آدھی کمر میں اور آدھی سر پر ڈال لیتی ہیں۔ غرض ہندوستان میں اگر کوئی خوبی ہے تو یہ کہ ایک وسیع ملک ہے۔ سونا چاندی بہت ہے۔ برسات میں بارش خوب ہوتی ہے۔ جہاں پانی کی بو تد نہ ہو وہاں ایک مرتبہ دریا بہنے لگتا ہے۔ بارش کے بعد ہوا نہایت ٹھنڈی اور لطیف ہوتی ہے۔ لیکن وہ بھی نہایت مرطوب۔ بارش کے زمانے میں ہمارے ملک کی کمانیں [illegible]

نہیں ہو سکتی۔ ایک کمان ہی کا یہ حال نہیں ہوتا بلکہ تمام چیزوں میں سیل دوڑ جاتی ہے۔ برسات کے علاوہ گرمی جاڑے میں بھی خوب ہوائیں چلتی ہیں اور آندھیاں بھی اس غضب کی آتی ہیں کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا۔

دوسری خوبی ہندوستان میں یہ ہے کہ یہاں ہر قوم ہر مذہب ہر ملت اور ہر پیشے کا آدمی بکثرت پایا جاتا ہے۔ اور ہر کام اور ہر صنعت کے لئے ہزاروں آدمی موجود ہیں لیکن ہر صاحب حرفہ وہی کام کرے گا جو اس کے باپ اور دادا کے وقت سے ہوتا آیا ہے

ہے وہ مختصر اور جامع جغرافیہ اور ہندوستان کے باشندوں اور مقامات وغیرہ کے حالات جو بابر نے تزک بابری میں لکھے۔ اب اہل نظر اور اہل انصاف یہ خود فیصلہ کریں کہ بابر نے جو کچھ مشاہدہ کیا اور جو کچھ اس کے تجربہ میں آیا اور اس کی بنا پر اس نے جو رائے ہندوستان کے لئے قائم کی اور اسے لطیفے پیش کیا وہ اس میں حق بجانب تھا یا نہیں۔ بابر کو ہندوستان کی گرمی۔ آندھی اور نہروں کے نہ ہونے کی شکایت تھی اسلئے اس نے آگرہ میں چار باغ لگائے اور کئی نہریں جاری کیں جو مدتوں تک اس کی یاد دلاتی رہیں گی۔

غزل

از جناب سید مقبول حسین صاحب بی۔ اے احمد پوری

بلغ عالم میں تجھی کو ہر طرف ڈھونڈا کیا
گر کسی صورت پہ دھوکا ہو گیا، دیکھا کیا

آہ اس خواب خودی میں ڈال کر رسوا کیا
اور پھر احساس بیداری کا بھی شکوا کیا

دل میں باقی تھی ابھی لذت وفور شوق کی
خواب سا دیکھا تھا اک دن عمر بھر رویا کیا

بیخودی اور بیکسی میں جب ہوئی ان بن بہت
جذبۂ وحشت ملا یا اور مجھے پیدا کیا

یاد ہیں مجھکو ابھی تک وہ جنوں کے مشغلے
عقل کے الجھاؤ میں پڑ کر یہ تو نے کیا کیا

ان جوانا مرگ امیدوں کو دل بھولا نہیں
حسرت و حرماں سے ناحق کیف غم الجھا کیا

تھی یہ دنیا جانے والوں کے لئے اجڑا دیار
وہ مسافر چل بسے میں راہ میں بھٹکا کیا

اُن کو میں دیکھوں یہ جرأت اور یہ تاب مجال
پر نگاہوں نے نہ مانا غیر کو دیکھا کیا

اس ادا پر کیوں نہ اک عالم کے دل کا خون ہو
نامہ بر کو دیکے اک سادہ ورق چلتا کیا

مکتب غم میں کیا مقبول نے پھر داخلہ
خاک اتنے دن خدا جانے کہاں چھانا کیا

وجدانیات!

از حضرت کوکب شاہجہانپوری

وہ تو کب ملتے ہیں لیکن آپ کھو جاتا ہوں میں — بس اسی منزل میں کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں!

حالِ دل، دل کھول کر کب ان سے کہہ پاتا ہوں میں — جی اُمنڈتا ہے مگر گھٹ گھٹ کے رہ جاتا ہوں میں

خندۂ اہلِ جہاں پر اشک بھر لاتا ہوں میں — اپنے پیماں توڑتے ہیں آپ شرماتا ہوں میں

اپنے دل کو دے رہا ہوں آپ ہی کیا کیا فریب — آہ اک بیکس کو کس کس طرح بہکاتا ہوں میں

اب مری جمعیّتِ خاطر پریشانی میں ہے — یعنی خود اپنے تصوّر سے بھی گھبراتا ہوں میں

میں نہیں ملتا اگر وہ مل بھی جاتے ہیں کبھی! — مجھکو ترساتے ہیں وہ اور ان کو ترساتا ہوں میں

آ رہے ہیں یاد رہ رہ کر گذشتہ سانحات — خود بخود بھولا ہوا افسانہ دُہراتا ہوں میں

ضبط کرنے سے جو پھر دل میں اتر آتے ہیں اشک — سرد آہوں سے انھیں شعلوں کو بھڑکاتا ہوں میں

مجھ سا بے تاب و تواں اور امتحانِ عاشقی! — ذکر بھی کرتے ہوئے اس دل کا تھراتا ہوں میں

مجھ کو ترکِ آرزو سے جان دینا سہل تھا! — لیکن ان کے واسطے اس کو بھی ٹھکراتا ہوں میں

مجھکو سودا ہی سہی، لیکن اسے کیا ہوگیا؟ — ناصحِ مشفق کو سو سو طرح سمجھاتا ہوں میں!

ہمنوائے دہر ہو سکتا نہیں خود آشنا! — طنزِ اہلِ دہر کو خاطر میں کب لاتا ہوں میں

دیکھئے مشکل ہوا جاتا ہے خود ضبطِ جنوں، — آپ کو معلوم ہے دیوانہ کہلاتا ہوں میں

آرزو مشکل نہیں مشکل ہے ترکِ آرزو — اپنے دل پر آپ ہی یہ کیا ستم ڈھاتا ہوں میں

خود گرفتار اور آزادی یہ ممکن ہی نہیں — ڈگمگا جاتا ہے دل جس راہ پر لاتا ہوں میں

حسرتِ عرضِ تمنا ہے کہ چھپتی ہی نہیں! — بند کرتا ہوں زباں کو دل کو ٹھیراتا ہوں میں

پھر انھیں قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں ہمنشیں — روکنا پھر مجھ کو۔ پھر بیخود ہوا جاتا ہوں میں

ہر قدم پر اور ہو جاتا ہے اندازِ خرام — ہر نفس پر آپ کو بدلا ہوا پاتا ہوں میں

اب سے نامِ آرزو بھی لب پہ آ سکتا نہیں — لے زباں دیتا ہوں ظالم، لے قسم کھاتا ہوں میں

دیدہ و دل کا اب اس کے بعد جو انجام ہو — آخری آنسو ترے قدموں پہ بکھراتا ہوں میں

کوکب! امیدِ وفا رکھتا ہے دل احباب سے — ہائے انگاروں پہ کیا کیا پھول برساتا ہوں میں

صحرائے عرب کی ایک داستان جمیل

از جناب قاضی زاہد علی صاحب بلہوری

صحرائے عرب میں ایک چاندنی رات تھی جب چاندنی کی ہر کرن ریت کے ذروں میں جذب ہو جانا چاہتی تھی اس طرح وہ ذرے ہیرے کے ننھے ننھے ٹکڑے معلوم ہو رہے تھے جنھیں کسی نے زمین پر بکھیر دیا ہو۔ دن بھر کی تپی ہوئی ریت اس وقت برف کی مانند ہو رہی تھی۔ اس سیلاب نور میں ایک شخص ریت پر بیٹھا ہوا کچھ گنگنا رہا تھا۔ تھا "احوص" سر زمین عرب کا مشہور شاعر۔

احوص کی راتیں آج کل "مجسم شعریت" ہو کر رہ گئی تھیں اور اس کی شعریت "رعنائی لطیف" میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی معلوم نہیں کتنی راتوں نے اسے سونے کے بعد گنگناتے ہوئے دیکھا اور پھر اس گنگناہٹ کا ماحصل سلامتہ بن کر رہ جاتا تھا۔

سلامتہ مدینہ کی ایک نوجوان عورت تھی۔ وہ عورت تھی اور مکمل عورت، اس کا حسن اس کے شباب سے مستغنی اور اس کا شباب اس کے حسن سے لاپروا تھا۔ اگر اس سے شباب نکال لیا جاتا تو وہ چاندنی معلوم ہونے لگتی اور اگر اس کا حسن کھینچ لیا جاتا تو وہ سمندر کے عکس میں تبدیل ہو جاتی۔ یہ تھا اس کا حسن و شباب ——— پھر ان دونوں کا امتزاج عرب کی سرزمین پر۔

بہرحال اس شعلہ رنگ و بو سے احوص نہ بچ سکا۔ وہ سلامتہ کو چاہنے لگا اس کی دنیا سمٹ کر اس کی شاعری وسیع ہو کر سلامتہ ہو گئی تھی اس نے سلامتہ کی تعریف میں بہت اشعار کہے ——— [illegible] کی حقیقت سے عجیب صورت دے دی۔ پھر ان اشعار کو وہ خود ہی پڑھتا پورے جوش و خروش کے ساتھ، جب فضا اس کے دلی جذبات سے معمور ہو کر مرتعش ہو جاتی۔

عورت شعریت کاملہ ہے اور جذبات لطیف کی حامل۔ اس کے سینے کا ہر قطرہ اپنی جگہ رقصاں ہوتا ہے۔ پھر جب وہ کوئی لطیف جذبہ محسوس کرتی ہے تو ہر قطرہ تڑپنے لگتا ہے اور اس تڑپ کی گرمی سے چند بوندیں اس کے رخساروں پر جھلکنے لگتی ہیں۔ سلامتہ بھی عورت تھی احوص کے اشعار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ احوص بارگاہ حسن میں آتا اس کی تعریف و توصیف کے گیت گاتا۔ اس کے سینے میں طوفان اور رخساروں پر نمی پیدا کر کے واپس چلا جاتا۔

آخر ایک دن سلامہ نے بھی تحفہ محبت پیش کر دیا۔ پھر مدینہ کی بہت سی رومانی راتوں نے دیکھا کہ احوص کی آغوش تنگ سے تنگ تر ہوتی جاتی تھی ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔ محبت ترقی کرتی رہی حتیٰ کہ ایک لمحہ کی جدائی ان کے لئے بارگراں ہو گئی۔ پھر سوچا گیا کہ اس رشتے کو ہمیشہ کے لئے مضبوط کر دیا جائے۔ قدرت اس ارادہ پر مسکرا دی

اسی دوران میں سلامتہ کے حسن نے ایک اور سینے میں تڑپ پیدا کر دی۔ عرب کا دوسرا مشہور شاعر "ابن حسان" تھا۔ اب ایک شمع اور دو پروانے تھے۔ دونوں ہی چاہتے تھے کہ صرف وہی شمع کے گرد گھومیں۔ دو شاعروں کے درمیان کشمکش تھی۔ ابن حسان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ احوص سلامہ پر دل و جان سے فدا ہے۔ اور پھر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سلامہ بھی اپنے دل میں اس کی عزت سمجھتی ہے۔ یہ چیز اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ انسان سب کچھ سہہ سکتا ہے لیکن یہ نہیں کہ اس کا محبوب کسی دوسرے سے محبت کرے۔

ابن حسان بھی سلامتہ کی بارگاہ میں آیا۔ اس نے بھی اس کی تعریف کے گیت الاپے ——— لیکن عورت صرف ایک مرتبہ محبت

کرتی ہے۔ سلامتہ احوص کی تھی اور اسی کی رہی۔

ابن حسان سلامتہ کے پاس جاتا لیکن اس کے اشعار سلامتہ کی حسین آنکھوں میں نفرت وحقارت پیدا کردیتے۔ وہ اس سے ذرا بھی ملتفت نہ ہوتی۔ لیکن جب احوص آجاتا وہ جوشِ مسرت سے کھڑی ہوجاتی اس کی نگاہیں شوخ سے شوخ تر ہوجاتیں سلامتہ کے یہ افعال ابن حسان کے دماغ کو پراگندہ اور اس کی روح کو مجروح کر رہے تھے۔ یہ اذیت ایسی تھی جو اس کی برداشت سے قطعی باہر تھی۔

ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ آج وہ اپنے اور سلامتہ کے درمیان کوئی تصفیہ کرکے آئیگا۔ وہ سلامتہ سے ملا لیکن حسب معمول وہی بیرخی اور بے التفاتی رہی اسے بیحد رنج ہوا کہنے لگا ؎

خلیلی لاتلمھا فی ھواھا
الذ العیش ماتھوی القلوب

"اے میرے دوست! مجھے اس کی محبت میں ملامت نہ کر، بہترین عیش وہی ہے جو دل پسند کرے۔"

اس نے اپنی ناکامی پر بہت ہی پیچ وتاب کھایا۔ اس کی ساری کوششیں رائگاں ہوچکی تھیں۔ سارے منصوبے خاک میں مل چکے تھے اسے اب اپنی ناکامی اور اپنے رقیب کی کامیابی کا پورا یقین ہوگیا تھا اس کی حسرتوں کا خون ہوچکا تھا۔ ایک بلی بھی جب مایوس ہوجاتی ہے تو کتے پر حملہ کردیتی ہے۔ ابن حسان بھی بالکل مجروح ہوچکا تھا اس کی محبت نے اب ایک خوفناک پہلو بدلا۔

وہ احوص کے مقابلے میں اپنی ذلت محسوس کرچکا تھا۔ اُف ایک شاعر کی ذلت ایک شاعر کے مقابلے میں شاعروں کی رقابت الاماں

ابن حسان نے احوص سے انتقام لینے کا پکا ارادہ کرلیا۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا اس کا ہر رونگٹا کانپ کانپ کر انتقام انتقام پکار رہا تھا۔ اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دنیا کی ہر چیز اسے ذلیل سمجھ رہی ہے اس نے احوص وسلامتہ سے بدلہ لینے کی ایک تدبیر سوچی اور اس کے بعد دیوانہ وار اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

اس وقت دنیائے اسلام ساری کی ساری معاویہ کے بیٹے یزید کے ہاتھ میں تھی۔ بڑے بڑے جلیل القدر انسان شام کے تخت کے سامنے سرنگوں ہوگئے تھے۔ شراب کے کیف آور جام اور دنیا کی سکر آور مسکراہٹیں دنیا پر چھارہی تھیں۔ اسلام میں سب سے پہلے قیصر وکسریٰ کے طرز پر حکومت ہوئی۔ اسلامی تاریخ سب سے پہلی مرتبہ رنگین یا داغدار بنائی گئی۔

ابن حسان یزید کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس نے ایک قصیدہ یزید کی شان میں پڑھا۔ وہ بہت خوش ہوا اور ابن حسان کو بہت کچھ انعام واکرام دیا۔ رفتہ رفتہ ابن حسان کو دربار میں رسوخ حاصل ہونے لگا۔ یزید اس سے بہت خوش رہتا تھا۔

ایک دن اس نے یزید کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا۔ قصیدہ کیا تھا ایک حسین وجمیل تصویر تھی جس میں سلامتہ کی غزالیں آنکھیں بادہ فشانی کرتی ہوئی نظر آتی تھیں اور اس کے ہونٹ شہد کے قطرے ٹپکاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

یزید نے سنا۔ ہر ہر شعر کی تعریف کی اور پھر ابن حسان سے سلامتہ کا پورا حال معلوم کیا۔ ابن حسان انتقام کے جوش میں سب کچھ بتاتا رہا۔ وہ خوش ہو رہا تھا کہ اس طرح وہ احوص سے بدلہ لے رہا ہے۔ حالانکہ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ ایک اور رقیب پیدا کر رہا ہے۔ یزید نے حالات سننے کے بعد فوراً سلامتہ کی طلبی کا حکم دیدیا۔ ابن حسان اپنی کامیابی پر بہت ہی مسرور ہوا۔ اس کی آنکھیں کبھی یہ منظر نہیں دیکھنا چاہتی تھیں کہ سلامتہ احوص کی آغوش میں پہنچ جائے۔ وہ ان کی دائمی جدائی کا خواہشمند تھا۔ وہ خوش تھا کہ سلامتہ یزید کی آغوش میں آجائے اور اس طرح مجھے ذلیل کرنے کی سزا پائے۔

یزید کا حکم کون روک سکتا تھا۔ کس میں طاقت تھی کہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتا اور اس کے شوق میں حائل ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ حسن وعشق میں بڑی طاقت ہے لیکن یزید کا حکم سلامتہ کے حسین سینوں کے رقیق سوتی اور احوص کے خونیں آنسو بھی نہ [illegible] سلامتہ روتی ہوئی یزید کے حرم میں داخل ہوئی۔

احوص کی دنیا اب ویران ہوچکی تھی۔ اس کا قافلہ منزل کے قریب لٹ چکا تھا۔ شربت کا بھرا ہوا پیالہ لبوں تک پاس سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس کی حالت اس [illegible]

شہنشاہ دیکھا اور تخت پر ایک عجیب شان سے بیٹھا ہو۔ ہزاروں انسان اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلے تو وہی ٹوٹا سا جھونپڑا اور پھٹا سا بوریا نظر آئے۔ احوص کا خواب محبت بھی بیدار کر دیا گیا تھا اور وہ بھکاری کا بھکاری رہ گیا۔

ابن حسان کو اب تسکین ہو گئی تھی۔ وہ مدینہ واپس آیا۔ اس نے چاہا کہ احوص کو جلائے اور اس کے جذبات محبت سے کھیلے۔ اس نے احوص کو سنانے کیلئے چند طنزیہ اشعار بھی پڑھے لیکن جلتی ہوئی شمع پر انگاروں کا کیا اثر۔ وہ خود ہی مر رہا تھا۔ ابن حسان پڑھتا رہا وہ سنتا رہا، آخر ابن حسان خفیف ہو کر خود ہی چلا گیا۔

دن گذرتے رہے ابن حسان کی محبت رقابت میں تبدیل ہو کر فنا ہو چکی تھی، لیکن احوص بدستور سلامتہ کی یاد میں خون کے آنسو روتا رہا۔ ادھر سلامتہ بھی احوص کو یزید کی آغوش میں پہنچکر بھی فراموش نہ کر سکی۔ محبت کا دیوتا اپنے نقوش اس قدر گہرے بناتا ہے کہ اس کا مٹانا زمانے کے لئے ناممکن ہے۔ دنیا کی ہر چیز کو ممکن جاننے والا نپولین بھی جوزیفائن کو مرتے وقت نہ بھول سکا۔

سلامتہ کو یزید کے حرم میں رہتے ہوئے ایک مدت گذر گئی لیکن احوص کی محبت ویسی کی ویسی ہی رہی وہ دن رات اسی کوشش میں رہتا کہ سلامتہ سے نامہ و پیام کا کوئی سلسلہ نکالے۔ اس نے بارہا کوشش کی لیکن ہر مرتبہ ناکامیاب رہا۔ آخر اس نے سوچا کہ خود ہی یزید کے دربار میں حاضر ہو۔ شاید وہاں سلامتہ کو دیکھنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

وہ ایک قصیدہ لے کر یزید کے دربار میں پہنچا۔ یزید کو اس کے متعلق کچھ نہ معلوم تھا۔ قصیدہ کے صلے میں اس نے احوص کو بہت کچھ انعام واکرام دیا اس کی آمد کی اطلاع سلامتہ کو بھی ہو گئی۔ اس نے ایک خادم کو انعام دینے کا وعدہ کیا اور اس سے خواہش کی کہ وہ اسے احوص سے ملا دے۔ خادم نے مزید انعام کی لالچ میں تمام واقعات یزید سے بیان کر دیئے اس نے خادم کو حکم دیا کہ وہ ان کی ملاقات کا موقع بہم پہنچائے اور وقت و مقام ملاقات سے یزید کو مطلع کر دے۔

خادم نے حسب ہدایت احوص کو سلامتہ کا پیغام پہنچایا اور اسی رات وقت مقررہ پر اسے سلامتہ کے محل میں لے گیا۔ ادھر اس نے یزید کو اطلاع کر دی۔ وہ ایک پردے کی آڑ میں چھپکر دونوں کی گفتگو سننے لگا۔ سلامتہ نے احوص کا نہایت محبت سے استقبال کیا۔ دونوں طالب و مطلوب ایک جگہ بیٹھ کر داستان غم دہرانے لگے۔ وہ رات بھر ایک دوسرے کی جدائی پر آنسو بہاتے رہے حتیٰ کہ اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ احوص نامراد و ناشاد سلامتہ سے رخصت ہونے لگا۔ سلامتہ نے اس وقت کہا ؎

وَاللہ واللہ لا انساك باسکنی

حتیٰ تفارق منی الروح اوصالی

"اللہ کی قسم! خدا کی قسم! اے میرے دل کی تسکین! میں تجھے نہیں بھولوں گی یہاں تک کہ میری روح میرے جسم سے جدا ہو جائے"

احوص نے جواب دیا ؎

واللہ خاب من امسی وانت لہٗ

یا قرۃ العین فی اھل وفی مال

"اللہ کی قسم وہ شخص خسارے میں نہیں ہے اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک جس کے اہل و مال میں تو ہے"۔ اور جانے کے لئے قدم بڑھایا کہ سامنے سے پردہ ہٹا یزید نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ تھرا گیا۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ سلامتہ کے قدم جیسے زمیں نے پکڑ لئے ہوں۔ اس کا سر جھک گیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے یونان سے وینس کا مجسمہ اٹھا کر یزید کے محلات میں رکھ دیا ہو۔

اس وقت دو مہجوران محبت ایک باجبروت شہنشاہ کے حضور میں کھڑے تھے۔ ایک طرف شام کا سارا جاہ و حشم تھا اور دوسری طرف مملکت عشق کی بے دست و پائی! —— لیکن دیکھنا یہ تھا کہ فتح کس کی ہوتی ہے۔

یزید نے یکے بعد دیگرے دونوں سے دریافت کیا کہ رات بھر ان کے درمیان کیا گفتگو ہوتی رہی۔ احوص کس طرح اور کیوں محل میں آیا؟ محبت میں انسان دلیر ہو جاتا ہے۔ احوص جان پر کھیل کر محل میں آیا تھا اس کو اگر کچھ فکر تھی تو سلامتہ کی تھی کہ وہ رسوا اور بدنام ہو جائیگی۔ سلامتہ کو اگر کچھ خیال تھا تو وہ احوص کا تھا کہ مقید یا قتل کر دیا جائیگا۔ لیکن دونوں نے غیر معمولی جرات سے کام لیتے ہوئے ساری

ساری داستان محبت من وعن بیان کردی۔ انھوں نے پوری طرح ظاہر کردیا کہ ان کے دلوں کی آواز حکومت کے نقارے سے دبادی گئی۔

یزید نے سب کچھ بغور سُنا اور احوص سے پوچھا۔ "تو سلامتہ سے محبت کرتا ہے؟" احوص نے جواب دیا۔ "امیر المسلمین! محبت ایک طوفان ہے جس کی لہریں میرے رگ وریشہ میں بہہ رہی ہیں"۔ اس نے سلامتہ سے بھی دریافت کیا۔ "کیا تو احوص کو چاہتی ہے؟"۔ سلامتہ نے کہا۔ "نجدا! وہ میری روح ہے۔ پھر کیا روح جسم سے علیحدہ رہتی ہے"۔ یزید رات بھر دونوں کی گریہ وزاری دیکھ چکا تھا۔ عشق صادق کی چند لرزوں نے اس کے پتھر دل کو بھی گداز کردیا تھا اس نے سوچا کہ سلامتہ مجھ سے محبت نہیں کرسکتی تو بجبر اس کو اپنے پہلو میں رکھنا بے۔ اس کی پھیکی مسکراہٹ اور نمائشی بناؤ سنگار میرے لئے [illegible] زیادہ دلکش نہ ہوگا۔ میرے یہاں کے سارے عیش وآرام مل کر بھی [illegible] حقیقی مسرت نہ دے سکیں گے۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے یزید نے سلامتہ کو طلاق دیدی۔

احوص اپنی وفا شعار محبوبہ کے ساتھ کافی دولت لے کر شام سے مدینہ واپس آیا۔ اور یہاں ان کا جشن شادی بڑے [illegible] سے منایا گیا۔

(ترجمہ از عربی)

چکور

جب ستارہ مشرق تیروں کی بارش کرتا ہوا . پردہ فلک میں روپوش ہوا . . میں اپنے مسکن سے باہر آیا۔ اس وقت کس بلا کی خاموشی تھی۔ ساری [illegible] بستی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ ہر چرند وپرند بے حس پڑا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ حسین پھولوں کی نازک نازک پنکھڑیوں میں بھی جنبش نہ تھی۔ . . . . اے چندا . . اس وقت . . . . میں تیری تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا . . . . تاروں کی محفل میں اپنی جستجو آمیز نظریں دوڑائیں . . . . جو ادھر ادھر بھٹک کر واپس آگئیں . . . . مشتری سے تیرا پتہ پوچھا۔ تو وہ ہنس کر خاموش ہوگئی . . . . حسین زہرہ سے تیری جائے قیام دریافت کی . . . . تو اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے بغور دیکھا . . . پھر زیر لب مسکرا کر نظریں جھکالیں . . . . میرا پرحسرت دل بیٹھنے لگا . . . . آہ! . . . . شاید اہل مجلس پاگل سمجھ کر میرا مضحکہ اڑا رہے تھے . . . . لیکن . اے غم! . . . یہ پریم پجاری پھر بھی ناامید نہ ہوا۔ اور تیری جستجو میں برابر سرگرداں رہا یک بیک تیرے حسن کی ایک شعاع مجھ پر پڑی . . جس نے میری محبت کی خاموش چنگاریوں کو یکبارگی شعلہ ریز کردیا . . . . میرے دریائے محبت میں ایک بلا کا تلاطم پیدا کردیا . . . . میں دیوانہ وار تیری طرف دوڑا . . . . مگر آہ! . . . . میں جوں . . . . جوں . . . . تیرے قریب جاتا تھا۔ تو . . . . اتنا ہی پیچھے ہٹتا جاتا تھا . میں اس عالم وارفتگی میں نہ معلوم کب تک اڑتا رہا . . . . یہانتک کہ میرے بازوؤں میں قوت پرواز باقی نہ رہی . . . . اے! . . . . میرے دیوتا! . . . . سچ بتا . . . . کیا تو بھی مجھے مخبوط الحواس سمجھتا ہے . . . . [illegible] سے اس قدر گریز کرتا ہے . . . . بس . . . . رحم . . . . اے میرے مالک رحم . . . . اب میں اپنے اس ننھے سے جسم کو تیرے اس مسند روپ پر نثار کردینا چاہتا ہوں . . . . !

دیکھ! . . . . دیکھ! . . . . اے حسن کے دیوتا! . . . . میری آس نہ توڑ . . . . میں پیاسا ہوں . . . . تیرے درشن کا . . . . مجھے مایوس نہ کر . . . . اے! . . . . رات کے راجا! . . . . اپنے حسن کی شعاؤں کو حکم دے۔ کہ وہ میرے کمزور بازوؤں میں قوت پرواز پھونک دیں . . . . تاکہ میں تجھ تک پہنچ سکوں . . . . !

صداقت بیگم سیوہاروی

فردوس جاودانی

حضرت اختر صہبائی ایم۔ اے ایل ایل بی

عجیب کیف سے لبریز زندگانی ہے
بہشتِ زیست محبت کی کامرانی ہے

ہر اک سرور فنا آشنا خمار انجام
فقط سرورِ محبت ہی جاودانی ہے

خزاں کا خوف نہ اندیشۂ فنا ہے اسے
سدا بہار محبت کی گلفشانی ہے

شباب روحِ حیات اور عشق روحِ شباب
عجیب چیز محبت بھری جوانی ہے

ہر ایک نقش تری جلوہ گاہ حسن و جمال،
ہر ایک نغمہ ترے نور کی کہانی ہے

مرا خیال ہے یا اک بہشتِ کیف و سرور
ترا جمال ہے یا خلدِ شادمانی ہے

ہر ایک سانس ہے افسانہ خلوص و وفا
ہر اک نگاہ محبت کی اک کہانی ہے

یہ میرا دل ہے کہ خمخانۂ سرور و نشاط
یہ میری روح ہے یا بحرِ شادمانی ہے

ہوا ہوں محرم اسرارِ انجم و مہ و مہر
یہ نورِ عشق ہے یا نورِ آسمانی ہے

نشاطِ روح ہے الفت کا کیف سوز و گداز
سرور و نور کا فردوسِ جاودانی ہے

چین کی صحافت

جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ناصح کریوی عظیم آبادی

آج ممالک مغربی فن صحافت نگاری میں معراج کمال اور اوج ترقی پر پہنچ جانے کے جس قدر بھی مدعی ہوں، اور آج وہ اس میدان وسیع میں کوس لمن الملکی بجانے کی جیسی بھی ڈینگیں ماریں بجا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس فن کے بانی اول ہونے کا شرف صرف مشرق کو حاصل ہوا ہے۔ اسے فخر ہے کہ دوسرے بے شمار فنون علیہ کی طرح اس فن خاص میں بھی ایجاد اس کا حصہ ہے اور تقلید و تتبع دوسروں کا۔ یہ اسی سرزمین کا ایک نمایاں خطہ ہے۔ جسے جغرافیہ عالم میں کشور چین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہاں پہلے پہل ایک اخبار کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اس وقت ممالک متمدنہ مغرب جہالت و توحش اور توہم پرستی و پست خیالی کی تاریکی میں گم تھا۔

دی السٹریٹڈ چیمبرس انسائکلوپیڈیا کے مصنفین نے صحافت نگاری کی ایجاد کا طرۂ امتیاز اطالیہ کے کلاہ تمدن میں اڑسنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ ان کی تصریحات کے مطابق اس کی بنا اس طرح پڑی کہ ابتداً رومی عساکر شاہی کے حالات مختلف صوبوں کے سپہ سالاروں کے پاس ان کی واقفیت کے لئے بھیجتے تھے۔ لیکن اگر یہ بیان صحیح بھی ہو جب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ اس معاملے میں سبقت کرنے کا سہرا اطالیہ کے سر ہے۔ اول تو اس کو چین کی طرز صحافت سے کوئی نسبت نہیں جس کی تشریح آگے آئے گی دوسرے ممکن ہے کہ اس کا عہد چین کے مابعد ہو۔

چینی صحافت کی قدامت کا اعتراف بعض اکابر یورپین نے بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر موائز ڈیس ہولا اپنی ہیں نیوز میں "پیکنگ گزٹ" کو دنیا کا قدیم ترین پرچہ قرار دیتے ہیں۔ ملکو کی ایک مشہور سیاح خاتون میڈ موائزل امنیس نے بھی چین کے متعلق اپنے ایک مقالہ میں اس حقیقت کبریٰ کا اعتراف کیا ہے۔ کہ چین پہلی سلطنت ہے۔ جہاں سے ایک روزنامہ کا اجراء عمل میں آیا ہے۔ اگرچہ اس کے اجراء کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔

تقسیم ادوار

ابتدائے عہد سے لے کر عہد حاضر تک کی چینی صحافت کی تاریخ پر اگر غائر نظر ڈالی جائے۔ تو اسے بلحاظ اصلاح و ترقی چار ادوار پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور سرکاری گزٹ کا ہے جبکہ اخبار صرف حکومت کی سرپرستی و نگرانی میں نکلتا تھا اور اس میں سرکاری خبریں اور فرامین خصوصیت سے شائع ہوتے تھے جس طرح آج کل سرکاری گزٹ شائع ہوتے ہیں۔ دور ثانی غیر ملکی صحافت نگاری کا ہے۔ کیونکہ موجودہ طرز کی اخبار نویسی کی بنیاد غیر ملکیوں ہی نے چین میں ڈالی تھی۔ اور عرصہ تک وہی اس میدان میں یکہ تازی کرتے رہے۔ دور ثالث دیسی صحافت کے عروج کا ہے۔ اس زمانہ میں غیر ملکیوں کے شائع کردہ اخبارات کے مطالعہ سے ملک کے خواص و عوام ہر دو طبقہ میں اخبار بینی کا خاصہ مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ جس کو دیکھ کر بعض ملکی ارباب ہمت اور اصحاب ذوق نے اپنے اخبارات جاری کرنا شروع کئے۔ اور دور رابع موجودہ دور صحافت نگاری ہے جبکہ یہاں دیگر ترقی یافتہ ممالک کے نمونہ و اصول پر اخبارات نکل رہے ہیں اور ملکی و قومی نہضت اور سیاسی و اقتصادی ترقی میں زبردست حصہ لے رہے ہیں۔

دورِ اوّل

اس دور کی ابتدا آغاز سن عیسوی کے پیشتر سے ہوتی ہے اور ۱۸۲۲ء پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس عہد میں سرکاری خبریں بلیٹن کی شکل میں شائع کی جاتی تھیں چین میں ٹائپ کی ایجاد غالباً اس زمانہ میں عمل میں آ چکی تھی۔ اس عہد کا مشہور ترین اخبار "تی چاؤ" ہے۔ جسے آجکل کی اخباری اصطلاح میں پیکن گزٹ یعنی "مرکز پایۂ تخت" کہا جا سکتا ہے یہی اخبار ہے جسے دنیا کا قدیم ترین اخبار قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ ۱۱ سال سے زیادہ پرانی ہے۔ مگر وائی پی۔ وانگ ایڈیٹر شہباز شنگھائی کی جو ایک بلند پایہ محقق اور اہل قلم ہیں۔ یہ رائے ہے کہ پیکن گزٹ کے اجرا سے بھی بہت پیشتر ایک اور اخبار نکل چکا تھا اس کا نام تسگپاؤ تھا اس کی نسبت ایسی کونسل سعدہ کینٹن الم ہوارٹ کا خیال ہے۔ کہ اس کی اشاعت چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا میں عمل میں آئی تھی۔

تی چاؤ

تی چاؤ کا اجرا خاندان ہانگ کے ایام فرمانروائی یعنی ۶۲ء سے لیکر ۹۰۵ء کے دوران میں باقاعدہ طور پر ہوا تھا یہ اخبار روزنامہ کی قسم کا تھا۔ اس میں کس نوع کے مضامین درج ہوتے تھے۔ اس کا انکشاف خود اس کے نام ہی سے ہوتا ہے۔ "تی" کے معنی ایسی قیامگاہ کے ہیں۔ جو جاگیرداروں کے لئے پایۂ تخت میں بنائے جائیں۔ اس قسم کی قیامگاہ پہلے شہر سیانسو صوبہ شینسی اور بعدہٗ لوبیانگ صوبہ ہونان میں بنی تھی۔ جب کبھی یہ جاگیردار پایۂ تخت میں دربار میں مجتمع ہوتے تو اسی میں ٹھیرا کرتے۔ گویا وہ آجکل کا گوارہ یعنی "چاؤ" ایسے نوٹ کو کہتے ہیں جس میں پڑھنے کی چیز مندرج ہو! الحاصل ایسی ہی قیامگاہوں سے یہ خاص قسم کا اخبار "تی چاؤ" نکلتا تھا! اور اسے ہر جاگیردار کی رسیدداری میں اس کے پاس بھیجا جاتا تھا۔

صوری و معنوی خصوصیات!

اس سلسلہ میں تی چاؤ کی صوری و معنوی خصوصیات کو بیان کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اخبار کے اوراق ایک زرد رنگ کے سرپوش میں لپٹے ہوئے ہوتے تھے جس سے یہ آشکار کرنا مقصود تھا کہ وہ حکومت کا آرگن اور ترجمان ہے۔ پورے صحیفہ میں دس یا بارہ اوراق ہوتے تھے۔ ان کی لمبائی ½۷ انچ اور چوڑائی ½۳ انچ تھی۔ کاغذ پتلے اور مٹیالے رنگ کے استعمال کئے جاتے تھے۔ اور بطور سرورق یا جلد بندی کے۔ دونوں طرف شوخ زرد رنگ کے کاغذ لگائے جاتے تھے پھر ان ورقوں کے کناروں کو دو دو کرکے کاغذ کی چیپیوں سے باہم وصل کر دیا جاتا۔ اور سرورق سمیت ڈھیلا ڈھالا سی دیا جاتا اندرونی اوراق معمولی چینی طرز پر دوہرا کرکے موڑ دیئے جاتے تھے جس سے بیس یا زیادہ اوراق سجاتے تھے طباعت کی کیفیت یہ تھی کہ ہر ورق میں سرخ روشنائی سے سات کالم بنا دیئے جاتے تھے جن میں سے ہر ایک میں اوپر سے لے کر نیچے تک چودہ الفاظ درج ہوتے تھے۔ بالائی حصہ میں بقدر چار حروف کے جگہ خالی چھوڑ دی جاتی تھی۔

مضامین کے لحاظ سے تی چاؤ یا بالفاظ دیگر پیکن گزٹ تین ابواب پر مشتمل تھا باب اوّل کا لقب "کنگ من چئی" یعنی باب عالی کا نسخہ تھا۔ اس میں تمام درباری خبریں اور مراسلات درج ہوتے تھے باب دوم "شانگ یو" یعنی فرامین شاہی تھا۔ اس حصہ میں صرف بادشاہ کے احکام و فرامین شائع کئے جاتے تھے۔ باب سوم "توڑ پاؤ" کہلاتا تھا اس میں سلطنت کے سرداروں کی عرضیاں اور ان کے متعلق حکمنامے درج ہوا کرتے تھے۔

شہرت و اہمیّت

اس اخبار سے عوام بہت دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ان کی

یہی بڑھی ہوئی دلچسپی تھی جس کی وجہ سے یہ صحیفہ سینکڑوں تعلیمیافتہ لوگوں کے حق میں وجہ کفاف بنا ہؤا تھا۔ چونکہ پرچہ کی قیمت زیادہ تھی۔ اس لئے ہر شخص فرداً فرداً اس کی خریداری سے قاصر تھا۔ لہذا اس کے مضامین کا خلاصہ عوام تک پہنچانے کے لئے ہر صوبے میں متعدد اشخاص نے اس کی تلخیص کو اپنا مخصوص پیشہ قرار دے رکھا تھا۔ اور اس طرح وہ لوگ کافی رقم شائقین سے حاصل کر لیا کرتے تھے شہروں میں تعلیم یافتہ اصحاب بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس اخبار کے ذریعہ رعایا اپنے فرمانرواؤں اور حاکموں کی سیرت اور ان کی کارگذاریوں کی حقیقت سے بخوبی واقف ہو جاتی تھی اس قدر کہ رومی بھی اپنے بادشاہوں اور مجلس شوریٰ کے حالات اتنے باخبر نہ رہتے ہوں گے۔

تی چاؤ یا پیکن گزٹ کی طباعت ٹائپ کے حروف میں ہؤا کرتی تھی۔ یہ ٹائپ یا تو چوبی ہوتے تھے۔ یا چینی مٹی سے بنائے جاتے تھے۔ اوّل الذکر قسم کے ٹائپ بید ما چار کی لکڑیوں کے بنتے تھے۔ اس بات سے چینیوں کی ترقی یافتہ تہذیب کی قدامت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے صاف مترشح ہوتا ہے۔ کہ گوٹنبرک کی ایجاد سے صدیوں پیشتر اہل چین فن طباعت سے آشنا ہو چکے تھے اور کیا عجب کہ یہ طباع جرمن بھی اپنی یہ تاریخی ایجاد انہیں چینیوں سے سیکھ کر یا ان کے ٹائپ اور طریق طباعت کو دیکھ کر عمل میں لایا ہو۔ بہر حال اس اخبار کا خاتمہ ۱۹۱۱ئہ میں خاندان مانچو کے تاج و تخت سے کنارہ کشی پر ہؤا۔

دورِ ثانی

مدت دراز تک یہی تی چاؤ اخبار چین کے میدان صحافت میں کوس لمن الملکی بجاتا رہا۔ ۱۸۲۷ئہ میں ہالینڈ کے ایک تاجر نے "پاسٹ چائنا" کے نام سے ایک ماہانہ جریدہ جاری کیا۔ اور اسی سال سے چینی صحافت کی تاریخ میں دورِ ثانی کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد عرصہ تک یہاں کی صحافت پر غیر ملکی لوگ قابض رہے۔ اس ہالینڈی تاجر کی دیکھا دیکھی انگریزوں نے بھی جو اس وقت چین میں

اپنا کافی سیاسی و تجارتی اقتدار جما چکے تھے۔ ہانگ کانگ کینٹن شنگھائی وغیرہ میں تجارتی اخبارات جاری کرنے شروع کر دیئے یہ اخبارات آگے چل کر ذی اقتدار اور کثیر الاشاعت ہو گئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور سب سے با اثر اخبار نارتھ چائنا ہیرلڈ تھا۔ یہ ۱۸۵۰ئہ میں جاری ہؤا تھا جو اسی دفتر سے نکلتا تھا۔ لیکن میڈ مائیل اینیس کی تحقیق کے مطابق یہ پہلا روزنامہ نہ تھا۔ بلکہ اس کے اجرا سے پیشتر ۱۸۶۱ئہ میں ایک روزنامہ اور شائع ہو چکا تھا۔ یہ اخبار رفتہ رفتہ ہر لحاظ سے بہت ترقی یافتہ ہو گیا۔ اور آج بھی وہ چین میں برطانوی قوم کا نہایت با اثر اور معتدبہ پرچہ ہے۔ انگریزی اخبارات کے اجرا کے بعد امریکیوں، فرانسیسیوں اور دیگر غیر ملکی اقوام نے بھی اپنے اپنے اخبارات مملکت چین میں جاری کئے۔

دورِ ثالث

ان غیر ملکی اخبارات نے اہل چین کے اندر اخبار بینی کا زبردست مذاق پیدا کر دیا۔ چین کا طبقہ خواص اخبارات کی قدر و قیمت سے واقف ہونے لگا۔ اخبار بینی کی طرف اہل ملک کا یہ عام رجحان اور ذوق و شوق دیکھ کر اکثر ملکی اہل علم کے دل میں اپنا خاص اخبار جاری کرنے کا خیال پیدا ہؤا۔ چنانچہ متعدد ارباب ہمم نے جا بجا مطابع کھولنے اور اخبارات نکالنے شروع کر دیئے۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا اخبار "شن پاؤ" ہے۔ جو خاص ملکی اہل قلم کے زیر ارادت و اہتمام ۱۸۷۲ئہ میں شنگھائی سے شائع ہؤا۔ بعد کے واقعات و حوادثات جن میں ۱۸۹۶ئہ والی چین و جاپان کی جنگ ۱۹۰۰ئہ والا فتنہ و فساد، ڈاک کے رسل و رسائل کی اصلاح و ترقی اور انقلاب ملوکیت خاص کر قابل ذکر ہیں۔ اخبارات کی کثرت اجرا کے مقتضی ہوئے۔ اور دھڑا دھڑ اخبارات جاری ہونے لگے یہ اخبارات خود تو بلند معیار کے نہ تھے۔ مگر انہوں نے دوسرے معیاری جرائد کے اجرا کی خاطر رستہ صاف کر دیا۔ اور ان کی جگہ پیدا کر دی۔ ان اخبارات کے اجرا میں غیر ملکی جرائد نے بھی بہت کچھ سہولتیں بہم پہنچائیں۔ یہی اخبارات دیسی ہ چل کو [illegible]

اور چلانے میں نمونہ کا کام دیتے تھے۔ خبریں بھی اکثر و بیشتر ابتداً انہیں سے مقتبس ہوتی تھیں۔ اس طرح غیر ملکی جرائد نے چینی صحافت پر بہت کچھ اثر ڈالا۔ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ چینی صحافت اپنے موجودہ نشوونما کے لئے غیر ملکی اخبارات کی بڑی حد تک احسان مند ہے۔

دورِ رابع!

اس دور میں چینی اخبارات بکثرت اشاعت پذیر ہونے لگے۔ اس وقت بھی کہ ملک مسلسل جنگ و جدل کے گوناگوں مصائب و نوائب میں مبتلا ہے۔ اور ہر طرف سے ہلاکت و تباہی کا سیلاب امڈا چلا آتا ہے کم و بیش ایک ہزار اخبارات ملک کے مختلف گوشوں سے نکل رہے ہیں۔ حالانکہ اب سے محض تیس چالیس سال پیشتر مشکل دو درجن دیسی اخبارات کا وجود تھا۔ اس عہد کے تمام مضامین اور ظاہری شکل و شباہت اور ٹیپ ٹاپ میں کسی غیر ملکی اخبار سے ہرگز مشابہ نہیں۔ روزنامہ شن پاؤ جس کا اجرا ۱۸۷۲ء میں ہوا تھا۔ گوناگوں دقتیں اٹھانے کے بعد بالآخر ۱۹۱۱ء میں مسٹر لیانگ سے کی ملک میں آیا۔ اس کے ایڈیٹر ایل چینگ نے اپنے ادارتی مسلک کا اعلان ان الفاظ میں کیا تھا۔

> "ابتدائی دس سالوں میں اخبار کے متعلق میرا یہ
> خیال تھا۔ کہ ایسی چیزیں پیش کی جائیں جن
> کے لئے عوام کی طلب ہو مگر اب پچھلے دس سال
> سے میرا خیال بدل گیا ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ ایسی
> چیزیں کی جائیں جن کی عوام کو حاجت ہو"

شنگھائی کا تیسرا قدیم ترین اخبار شی پاؤ یعنی دی ایسٹرن ٹائمز ہے۔ یہ اخبار نہایت ہر دلعزیز ہے۔ اور طلبہ کے طبقہ میں خصوصیت سے مقبول ہے چین کے موجودہ بہترین دیسی روزناموں میں شی پاؤ، سنواں پاؤ اور شیہہ پاؤ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ سی پاؤ میں قدامت کی جھلک نمایاں ہے۔ شیہہ پاؤ آزاد خیالی کا حامی ہے۔ اور سنواں متوسط طرز کی وکالت کرتا ہے۔ یعنی ہر دو مذکورہ انواع کے بین بین ہے۔ بایں ہمہ یہ سب اخبارات آزاد اور غیر جماعتی ہیں۔ نیز مصارف کے معاملے میں کسی کے دست نگر نہیں۔

زبان کی دقتیں

چینی اخبارات کی ترقی و عروج میں زبان کی دقتیں بری طرح حارج رہی ہیں یہ دقتیں تقریر کی بھی ہیں اور تحریر کی بھی یعنی انشا اور املا، دونوں کی۔ جہاں تک بولی کا تعلق ہے۔ وہ دو نوعوں پر منقسم ہے ایک علمی ہے۔ جو تصنیف و تالیف کے کام میں آتی ہے اور وہ خواص کی زبان ہے۔ دوسری عوام کی بول چال ہے۔ اول الذکر کی حیثیت ہندوستان قدیم کی سنسکرت کی ہے۔ اور ثانی الذکر کی پراکرت یا بھاشا کی سی۔ پھر یہ بھاشا بھی پورے ملک کی کوئی ایک نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ جیسے ہندوستان میں ہر صوبہ کی بولی جداگانہ ہے۔ خاص پایۂ تخت پیکن کی بولی کہ جس میں ہم حروف بر مستعمل ہے۔ لیکن یہ بولیاں اس قدر پیچیدہ ہیں۔ کہ ان پر حاوی ہونا سخت دشوار ہے۔ اس لئے کہ ایک ہی کے لفظ کے بیک وقت کئی معنی پیدا ہوتے ہیں جن کے تعین کے لئے لہجہ و تلفظ پر مہارت حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس بنا پر ان کو ضبط تحریر میں لانا نہایت دشوار ہے۔ علمی زبان کی بھی کیفیت یہ ہے۔ کہ عربی کی طرح وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا صرف و نحو بھی ناقابل فہم ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ بخلاف اور زبانوں کے قواعد یا گرامر کی ضرورت سے یہ زبان مستغنی ہے اس لئے کہ نہ تو اس کے اسماء میں جمع و واحد اور تذکیر و تانیث کا پتہ چلتا ہے۔ اور نہ افعال کے اشتقاق ہی ہیں۔ صرف اشارات و تلفظ سے ان ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے

املا یا تحریر کی دقتیں ان سے بھی کئی گنا بڑھی ہوئی ہیں۔ چینی حروف ہیرو گلیفی اور آرامی خطوط کی ایک قسم ہیں۔ وہ دنیا کی علمی زبانوں کے خلاف حروف میں نہیں لکھے جاتے بلکہ ہر حرف بجائے خود بنا بنایا اور رستا ترستایا ایک مستقل لفظ ہے۔ جو ایک خاص معنی کے لئے وضع کیا ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب العلم کو تمام الفاظ جو سر بو ست کرے پڑھی پچیس چھبیس ہزار سے کم نہیں ہوتے از بر کرنے

پڑھتے ہیں۔ اس میں خرابی یہ ہے۔ کہ غیر زبان کے الفاظ کو تحریر میں بآسانی لکھا یا نہیں جاسکتا۔ چونکہ اکثر تعلیمیافتہ چینی اصحاب غیر ملکی اخبارات اور یورپین تعلیم کے ذریعہ لاطینی حروف سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس کے استعمال کئے جانے کی تحریک نشوونما پارہی ہے۔ چنانچہ اس خیال کے لوگوں نے ایک اخبار شنگھائی کیپٹر یس نامی ۱۹۲۵ء سے نکالنا بھی شروع کر دیا ہے۔ اس اخبار کی زبان تو چینی ہے۔ مگر وہ لاطینی خط میں طبع ہوتا ہے۔ اس اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم ہے۔ کہ اس کے ایک لاکھ نسخے روزانہ چھپتے اور فروخت ہوتے ہیں۔ حالانکہ اسی زبان کے اور اخبارات ہیں۔ جو چینی حروف میں طبع ہوتے ہیں مگر ان کی اشاعت چند ہزار سے بیش نہیں۔

بہرحال ۱۹۱۱ء والے انقلاب کے بعد چینی زبان کی املاء اور انشاء دونوں میں بہت کچھ اصلاح کر دی گئی ہے۔ اور تعلیم بھی عام ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اخبارات کی طباعت واشاعت میں پیشتر کی نسبت بہت سہولت ہوگئی ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ یکایک اخبارات کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا۔ یعنی چند ہی سال کے عرصہ میں وہ بیس پچیس سے بڑھ کر ۳۰۰ کی تعداد میں نکلنے لگے۔ اور تو صرف دیسی زبان کے اخبارات ۹۰۰ کی تعداد میں اشاعت پذیر ہیں

موجودہ رفتار صحافت

چین کی موجودہ قومی بیداری، ملی عصبیت، اشاعت تعلیم، اہل قلم کی کثرت اور اس قسم کے دوسرے اسباب و عوامل ہیں جن سے توقع ہوتی ہے۔ کہ یہاں کی صحافت کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا۔ موجودہ صورت حال بھی ٹھیک اطمینان بخش ہے۔ فی الحال کئی کئی بلند پایہ اور کثیر الاشاعت روزنامے چین کے اکثر بڑے بڑے شہروں مثلاً شنگھائی، تائنتسین، پیکن، کینٹن اور ہنکاؤ سے نکل رہے ہیں۔ شنگھائی میں مذکورہ بالا ہر سہ جرائد کے علاوہ دس اور اخبار شائع ہوتے ہیں۔ اسی طرح تائنتسین سے بارہ یا تیرہ پیکن سے ۲۰ سے زائد کینٹن سے ۳۰ یا ۴۰ اور ہنکاؤ سے ۱۴ یا ۱۵ جرائد نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ اندرون صوبوں کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں شائع ہوتے ہیں۔ لیکن ان صفوں پر چھپنے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔ لیکن ان کثیر التعداد جرائد میں تھوڑے ہی ایسے ہیں۔ جو معتمد اور باوقار کہے جا سکتے ہیں۔ بیشتر اخبار کسی نہ کسی سیاسی جماعت یا فرد کے دامن سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے معدودے چند اخبارات ہیں۔ جن کا ملک پر خاص اثر ہے اور لوگوں میں مخصوص وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں چند مشہور و معروف اخبارات و رسائل کی فہرست مع قیمت اور دیگر ضروری تشریحات کے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ جس سے حاجتمندوں کو استفادہ کرنے کا موقع مل سکے گا۔

برٹش چیمبر آف کامرس جرنل:۔ یہ پرچہ مہینہ میں ایک بار شنگھائی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ بیرون ملک کے خریداروں سے ایک شلنگ ہے۔

چائنا کریٹک:۔ یہ ہفتہ وار اخبار ہے۔ اور شنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ہے۔

چائنا میل:۔ یہ روزنامہ ہے اور ہانگ کانگ سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ۴ پاؤنڈ ۴ شلنگ ہے۔ اس کا ایک ہفتہ وار ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہے۔ جس کا سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۵ شلنگ ہے۔

چائنا کوارٹرلی:۔ یہ پرچہ ہر تین ماہ پر شنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ۱۲ شلنگ ہے۔

چائنا ویکلی ریویو:۔ یہ اخبار ہفتہ میں ایک بار شنگھائی سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۱۵ شلنگ ہے۔

چائنیز اکونومک جرنل اینڈ بلیٹن:۔ یہ ماہنامہ ہے۔ اور شنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ایک شلنگ ہے۔

چائنیز جرنل آف فیزیولوجی:۔ یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے۔ اور پیکن سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ایک شلنگ ہے۔

چائنیز میڈیکل جرنل:۔ یہ ماہوار رسالہ ہے اور پیکن سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۵ شلنگ ہے۔

چائنیز ریکارڈر:۔ یہ ماہوار پرچہ شنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ [illegible] شلنگ ہے۔

چائنیز سوشل اینڈ پالیٹیکل سائنس ریویو [illegible]

...ہے شائع ہوتا ہے سالانہ قیمت ۱۰ شلنگ ہے۔

مسلم ریویو۔ یہ پرچہ ہر ماہ شنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ... شلنگ ہے۔

چائنیز اینڈ کریس۔ یہ اخبار ہر ہفتہ شنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۴ شلنگ ہے۔

ہانگ کانگ ڈیلی پریس۔ یہ اخبار روزانہ ہانگ کانگ سے نکلتا ہے سالانہ چندہ ۳ پاؤنڈ ہے۔ اسی کا ایک ہفتہ وار ایڈیشن بھی نکلتا ہے۔ جس کا سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۴ شلنگ ہے۔

نارتھ چائنا ڈیلی نیوز۔ یہ روزنامہ شنگھائی سے نکلتا ہے سالانہ چندہ ۶ پاؤنڈ ۴ شلنگ ہے۔

نارتھ چائنا ہیرلڈ۔ یہ ہفتہ وار اخبار ڈیلی نیوز کے دفتر سے نکلتا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۱۸ شلنگ ہے۔

اسلامی صحافت

چین میں مسلمانوں کی تعداد خاص ہے جو پچاس ملین یعنی پانچ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن تعلیم کی کمی عام افلاس یا فقدان احساس کے باعث وہاں کے اسلامی جرائد کی عمر بہت کم ہے اور وہ بیس پچیس سال سے زائد نہیں ۱۹۱۶ء میں صرف چار اردو رسالے شائع ہوتے تھے جن میں سے ایک لائٹ آف اسلام شنگھائی سے اور اسلامک ریویو نانگ (مغربی چین) سے نکلتے تھے۔ ان میں عموماً اسلامی مسائل سے بحث کی جاتی تھی۔ اور اکثر مسلمان زعماء کی تصویریں شائع ہوتی تھیں چین کے دوا کا یہ مسلمانوں کا جو پیغام مسلمانان عالم کے نام ۱۹۳۳ء اسٹار آف الہ آباد میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انجمن ترقی اسلام کی سرپرستی میں جو جرائد و رسائل شائع ہوتے ہیں۔ وہ دس سے زیادہ قسم کے ہیں جن میں سے لنظرۃ الہلال بیکن ہی وہ پرچہ ہے۔ جو دیگر اقطاع عالم کے برادران اسلام سے راہ و رسم اور تعلقات رکھتا ہے۔ چونکہ یہ اخبار بین الاقوامی حیثیت رکھنے کا مدعی ہے۔ اس لئے اس کے اندر عربی اور انگریزی تحریروں کی اشاعت کا انتظام رکھنا بھی ضروری ہے۔ لیکن چونکہ سردست دونوں زبانوں کے ماہر آدمیوں نیز ٹائپ کی فراہمی دشوار ہے۔ اس لئے اس کا انتظام نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اس کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ پرچہ چینی کاغذ کے چند تختوں پر چھپتا ہے۔ اس کے پڑھنے والے عموماً چینی مسلمان ہیں۔ تاہم تقریباً ایک سو پرچہ باہر کے مسلمان بھی خریدتے ہیں۔ اگرچہ زبان کی مغائرت کے سبب سے وہ عموماً اس کو پڑھنے اور سمجھنے سے معذور ہیں۔ اس کے ایڈیٹر مولوی عبداللہ چاوسیں ایک اسلامی درد رکھنے والے بزرگ ہیں۔ ان کے ماسوا اور ماہنامے اور ہفتہ وار بھی نکلے۔ مگر قلت سرپرستی کے شکار ہو کر کچھ مدت بعد بند ہو گئے۔

منظر سوم

[مجّو کا مکان، خالد آتا ہے]

خالد۔ مرزا جی۔ ارے بھائی مرزا جی۔ مجّو مرزا!

مجّو۔ ارے کلن دیکھو تو کون ہے؟

کلن۔ بہت اچھا میں ابھی دیکھتا ہوں۔

مجّو۔ آواز تو خالد کی معلوم ہوتی ہے۔

کلن۔ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔

کلن۔ کون صاحب؟

خالد۔ میں ہوں خالد۔

کلن۔ اخاہ میں تو پہلے ہی سے کہہ رہا تھا کہ یہ خالد میاں کی آواز ہے۔

مجّو۔ کلن، ارے کلن خالد ہی ہیں نا؟

کلن۔ ہاں ہاں مرزا جی بالکل وہی ہیں۔

مجّو۔ کیسا پہچانا۔ آؤ بھئی آؤ خالد میاں اندر آجاؤ۔

خالد۔ حاضر ہوا مرزا جی، آداب عرض

مجّو۔ آداب عرض، آیئے تشریف رکھئے۔

خالد۔ کہئے مرزا جی، مزاج تو اچھا ہے۔

مجّو۔ آپ کا شکریہ! بالکل اچھا ہوں۔ آج بہت دنوں کے بعد نظر آئے ہو کیا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

خالد۔ نہیں مرزا جی، باہر تو نہیں گیا تھا فرصت ہی نہیں تھی۔

مجّو۔ اچھا اور کیا حال ہے؟

خالد۔ مرزا جی حال وال تو اچھا ہے آپ اپنی سنائیے۔ کہئے اس وقت کلن سے کیا باتیں ہو رہی تھیں۔

مجّو۔ کچھ بھی نہیں بہادری کے قصے ہو رہے تھے۔

خالد۔ کون سے بہادری کے قصے؟

مجّو۔ پرانے قصے، تمھیں بھی شاید یاد ہو ایک مرتبہ میں نے چھچھوندر ماری تھی۔ کلن مجھ سے وہ قصہ سن رہے تھے۔

خالد۔ کیا کہنے مرزا جی کے بھئی واللہ اس روز تو آپ نے کمال ہی کر دیا تھا

مجّو۔ کمال کیا کرنا تھا۔ بھئی اپنے بڑے بوڑھوں کے نام کی لاج رکھنا تھی۔ اور سچ پوچھو تو اس روز بچنے کی امید تو تھی ہی نہیں خاندانی غیرت اور شرم کی وجہ سے سب کچھ کرنا پڑا۔

خالد۔ اچھا خیر ان باتوں کو جانے دیجئے ہم کل صبح شکار کو جا رہے ہیں آپ کو چلنا پڑیگا۔ آپ کے بغیر لطف نہیں آتا۔

مجّو۔ (ہنستا ہے) کیوں میرے بغیر لطف کیوں نہیں آتا؟

خالد۔ بھئی مرزا جی آخر آپ بہادر ہی جو ٹھہرے ہم لاکھ کچھ کریں مگر شکار کی جو گھاتیں آپ جانتے ہیں ہم نہیں جان سکتے۔

مجّو۔ دیکھ لیا نا کلن۔ ہم نہ کہتے تھے کہ بہادر بننے کیلئے کچھ ہنر بھی ہونا چاہئے

کلن۔ مرزا جی ہم تو آپ کا لوہا مانتے ہیں۔

مجّو۔ ایک دفعہ ہم شکار کو گئے تھے۔ چکن۔ جموا ملوا بھی موجود تھے۔ جنگلی چوہوں کا شکار کھیل رہے تھے اور وہ [illegible] شکار ہوتا ہے

کلن۔ اجی آپ نے ایک مرتبہ جنگلی بلی کا شکار بھی تو کیا تھا؟

مجّو۔ بھئی واللہ خوب یاد دلایا۔ یہ واقعہ بھی عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ اس روز بھی اللہ نے ہی فضل کیا جو ہم بچ گئے تھی تو وہ مسری بلی مگر شیرنی سے کم نہیں تھی۔ جب کبھی وہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

خالد۔ تو مار لیا آپ نے اس بلی کو؟

مجّو۔ ہاں بھئی مار لیا۔ مگر [illegible] مصیبتوں کے بعد۔ اگر اس روز ہم نہ ہوتے تو ایک آدھ کا تو خاتمہ [illegible]۔

کلن۔ اجی مرزا صاحب اسی وجہ سے تو آپ کو ساتھ لیجاتے ہیں جنگلی بلی بھی تو کتنا ظالم جانور ہے یہ بھی آپ ہی کی ہمت تھی جو بلی کو مار لیا۔

خالد۔ اجی ایسے سیکڑوں معرکے مرزا جی نے سر کئے ہیں جبھی تو [illegible] کا لقب پایا ہے خاندانی بہادر ہیں۔

کلن۔ مرزا جی، اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ نے وہ جنگلی بلی کس طرح مار[illegible]

مجّو۔ بھئی یہ بھی بڑا دلچسپ واقعہ ہے تفصیل [illegible] کہ سب [illegible] کچھ شغل ہونا چاہئے اب سب سوچنے لگے کہ کیا ہو [illegible] کمبخت ہے نا ---؟

خالد۔ ہاں! ہاں! کہئے۔

مجّو۔ یہ ایکدم بولی [illegible] کھیلنے [illegible]

نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ اب ہم ستر امع کر رہے ہیں کہ بھئی
کوئی اور شغل کر لو مگر وہ مانتے ہی نہیں۔ آخر مجبوراً ہمیں بھی ہاں
کرنا ہی پڑی۔ بس بھئی پھر چل پڑے شکار کو اللہ کا نام لے کر۔

خالد۔ اچھا تو مرزا جی آپ کا ٹاڈی بھی ساتھ تھا یا نہیں؟

مجو۔ ٹاڈی کیسے نہ ہوتا۔ یہ کتا تو ہماری زندگی کا سہارا ہے۔

کلن۔ اچھا تو مرزا جی پھر آپ نکل پڑے۔

مجو۔ ہاں تو جونہی ہم جنگل میں داخل ہوئے ہیں کہ روح فنا ہو گئی۔ بس
ہم تو زندگی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔

خالد۔ کسی شیر سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی کیا؟

مجو۔ ارے یار توبہ کرو توبہ خدا نہ کرے کبھی ایسا ہو۔

کلن۔ تو کیا کوئی سیاہ اژدہا مل گیا تھا؟

مجو۔ ارے نہیں یار۔

خالد۔ تو پھر روح کیوں فنا ہو گئی مرزا جی؟

مجو۔ تم بات تو سنتے ہی نہیں اپنی کہے جاتے ہو۔

کلن۔ اچھا کہئے آپ بات سنائیے بھئی خالد تم اب مت بولنا۔ مرزا جی
ایسے ناموں سے بہت گھبراتے ہیں۔

مجو۔ کون! میں گھبراتا ہوں لاحول ولا قوۃ۔ تمہیں وہ دن یاد نہیں
جب میں نے ایک اژدہا مارا تھا بھئی کیسا خوفناک تھا وہ؟

خالد۔ خیر آپ بات سنائیے۔ شہ دیر کی باتوں کو تو جانے دیجئے۔ یہ بتلائیے
کہ آپ کی روح کیوں فنا ہو گئی؟

مجو۔ بس جونہی جنگل میں داخل ہوئے تو لومڑی کے پیروں کے نشان
دیکھے میں نے کہا کہ بھئی شگون اچھا نہیں ہے آج اللہ خیر کرے
کوئی نہ کوئی آفت آنے والی ہے۔

کلن۔ اچھا پھر۔

مجو۔ بس ہم دیکھتے بھالتے بہت احتیاط کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اگر
پتہ بھی کھڑکتا تھا تو روح فنا ہو جاتی تھی۔ لومڑی کمبخت بھی بڑا
ظالم درندہ ہوتا ہے۔ سب نے ہمت ہار دی۔ صرف ہم ہی تھے جو
سب کا حوصلہ بڑھا رہے تھے کہ اتنے میں ٹاڈی کے زور زور سے
بھونکنے کی آواز آئی۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ بھائی مرزا
آج بے اجل مر گئے۔ مروا دیا ان کمبختوں نے۔

خالد۔ کیا لومڑی سچ مچ سامنے آ گئی۔

مجو۔ ارے یار نہیں، خدا نہ کرے۔

کلن۔ تو پھر کیا ہوا مرزا جی۔

مجو۔ آگے بڑھ کر جو دیکھتا ہوں تو غرانے کی آواز آ رہی ہے بس میں نے
کوسنا شروع کیا کہ کمبختو دعا کرو کہ سلامت گھر پہنچ جائیں۔

خالد۔ تو گویا شیر نے حملہ کر دیا۔

مجو۔ خدا نہ کرے یار جو کبھی ایسا ہو۔

کلن۔ ہاں مرزا جی پھر کیا ہوا؟

مجو۔ بس میں نے دل میں کہا کہ میاں مرزا مرنا تو ویسے بھی ہے اب
کیوں ہار دیں۔ میں نے بندوق تو کر لی سیدھی اور آہستہ آگے
شروع کر دیا کوئی بیس گز گیا ہوں گا کہ ایک دم سے کسی چیز کے
کی آواز آئی۔ بس جان ہی تو نکل گئی۔ میں گھات لگا کر دیکھ
دیکھتا کیا ہوں کہ دو موٹی موٹی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ میں
اپنی جگہ پر کھڑا ہوں اور وہ اپنی جگہ پر۔

خالد۔ گویا دونوں اسی تاک میں ہیں کہ موقع ملے تو حملہ کر دیں۔

کلن۔ مگر مرزا جی وہ تھا کیا؟

مجو۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ شیرنی ہے کوئی تین فٹ کے برابر
اونچے ایسے جیسے چیتے کے مگر غور سے جو دیکھا تو جنگلی بلی تھی
میں اسی تاک میں تھا کہ گولی مار دوں۔ اتنے میں اُدھر سے
جھپٹا تو وہ ڈر کر بھاگی بے تحاشا تو پاس ہی ایک درخت
ٹُنڈ تھا اس کا سر زور سے اس کے ساتھ لگا۔ اور بے ہوش ہو
کر گری تو میں نے اللہ کا نام لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس کو چھو
کر نکل گئی۔ اب تو ٹاڈی کا بھی حوصلہ بڑھا اس نے جا کر بلی کی گردن
دبا لی۔ وہ گولی لگنے سے ادھ موئی تو پہلے ہی ہو چکی تھی بس
جو جھنجھوڑا ہے تو چت لیٹ گئی۔

خالد۔ واہ واہ مرزا صاحب کیا گولی ماری ہے۔

مجو۔ بس اب تو سب کے حوصلے بڑھ گئے اور لگے واہ واہ کے نعرے بلند کرنے پھر
اس طرح چل پڑے سب اور بیچاری کا بھرکس نکال دیا۔

غزل

از جناب قاضی وحید الدین صاحب وحید

وہاں سے غم و درد لے کر چلے
وہ جیتے رہیں جن پہ ہم مر چلے

نکالوں میں اک ایک ارمان دل
مرا بس جو اے شوخ تجھ پر چلے

کسی کے بھروسے پہ ہم بے خطر
سوئے حشر با دامن تر چلے

یہ دیوانہ پن دیکھیے تو کہ ہم
عدو سے بدلنے مقدر چلے

یہ صحبت تو اے شیخ رندوں کی ہے
کہاں آپ پھر بندہ پرور چلے

کبھی تو دکھا جذب اپنا اثر
کبھی تو وہ آئیں مرے گھر چلے

کسی طرح ہو غم غلط ساقیا
بلا سے شب و روز ساغر چلے

عطا کرنے والے سلامت رہیں
ہم آئے تھے مفلس تو انگر چلے

صفوں پر صفیں کھا کے غش گر پڑیں
وہ اس ناز سے سوئے محشر چلے

کٹی عمر لہو و لعب میں وحید
صد افسوس کچھ بھی نہ ہم کر چلے

تیس مار خاں!

ایک بہترین مزاحیہ ڈراما

جناب چوہدری علاء الدین صاحب طور

افراد

مجو مرزا	تیس مار خاں
راشدہ	مرزا جی کی بیوی
گامو	مرزا جی کا ملازم
حامد، خالد، کلن	مرزا جی کے ملنے والے بیکرے دوست

منظر اوّل

[حامد اور خالد دو دوست آپس میں باتیں کر رہے ہیں]

خالد۔ حامد! حامد! ارے میاں حامد!

حامد۔ اخاہ، آپ ہیں۔

خالد۔ جی کہو بھائی کس دھن میں جا رہے ہو جو سنتے ہی نہیں؟

حامد۔ دھن؟ دھن تو کچھ نہیں۔ یار پچھلے ہفتے سے جو کام میں پھنسے ہیں تو ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں ملی طبیعت اکتا گئی ہے۔

خالد۔ زیادہ کام تھا کیا؟

حامد۔ صرف زیادہ ہی نہیں بلکہ بے حد کام تھا۔ بھئی سچ پوچھئے تو یہ ماوا جان ہی کا دم ہے جو ان بکھیڑوں کو نپٹاتے رہتے ہیں۔ ورنہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔

خالد۔ مگر تم نے تو کبھی کوئی کام کیا ہی نہیں پھر اب کس طرح قابو میں آگئے۔

حامد۔ ارے یار کچھ نہ پوچھو۔ ماوا جان کو کسی کام سے باہر جانا تھا اس لئے انھوں نے مجھے بلا کر کہا کہ جب تک میں واپس آؤں تم کام کی دیکھ بھال کرو۔

خالد۔ مگر تم نے کہہ نہ دیا کہ محمد جیسے بیکرے کو کام سے کیا علاقہ؟

حامد۔ ارے یار بہتیرا کہا مگر وہ مانے ہی نہیں۔ اُدھر چچا میاں جان کو آگئے کہ یہ حرام خور ہے۔ کام چور ہے۔ بالکل نکما ہے۔ آرام طلب ہے آوارہ ہے وغیرہ وغیرہ

خالد۔ ارے یار ہم تو تین کام جانتے ہیں جو نہ آتا ہیں۔

حامد۔ ... وہ کیا؟

خالد۔ وہ یہ کہ کھانا، پینا اور یار دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکنا اور بس،

حامد۔ (ہنستا ہے) بھئی واللہ یہ خوب کام بتائے۔ واقعی ہمیں دنیا کے دھندوں سے کیا واسطہ۔ مگر میاں کبھی نہ کبھی تم بھی قابو آ ہی جاؤ گے

خالد۔ اوں، دیکھا جائیگا۔ ابھی تک تو آزادی چین لکھتا ہے۔

حامد۔ خیر میاں چھوڑو ان قصوں کو، اب یہ بتاؤ کہ کہتے کیا ہو۔ میں تو بالکل بس گیا ہوں کام میں۔

خالد۔ بس یہی پوچھ رہا تھا کہ کس دھن میں جا رہے ہو؟

حامد۔ میں ... بتاؤ کوئی دلچسپ شغل ہو تاکہ اتنے دنوں کی کوفت ... دور ہو جائے۔

خالد۔ بس اتنی سی بات، ارے میاں سیکڑوں دلچسپ مشغلے ہیں۔

جوب

حامد۔ مثلاً؟

خالد۔ پہلوانوں کا دنگل کرادو۔ شکار کھیلو، گانا کراؤ۔ دریا کی سیر کو چلو وغیرہ

حامد۔ تو پھر ایسا کریں کہ دنگل بھی کرادیں۔ شکار کو بھی چلیں گے اور بھئی گانا بھی ضرور ہونا چاہئے اب تم یہ بتادو کہ پہلے کون سا کام کرنا چاہئے رہا دریا کی سیر تو یہ بعد میں دیکھا جائیگا۔

خالد۔ میرے خیال میں تو پہلے شکار کھیلا جائے تو بہت اچھا رہیگا۔

حامد۔ ارے میں تو سمجھ رہا تھا کہ پہلے تم گانے کے لئے کہوگے۔ مگر ہو آخر شکاری ہی ــــ

خالد۔ بھئی بات دراصل یہ ہے کہ جتنا لطف مجھے شکار میں آتا ہے اتنا اور کسی کام میں نہیں آتا۔

حامد۔ اچھا تو پھر تیار ہوجاؤ شکار کے لئے کل صبح؟

خالد۔ یہاں ہر وقت تیار ہیں کہو تو ابھی چل دیں۔

حامد۔ نہیں جی ابھی کیا ضرورت ہے۔ بس کل صبح ٹھیک رہے گا۔

خالد۔ ارے مجو میاں کو ساتھ لینا اس کے بغیر لطف نہیں آئیگا۔

حامد۔ بھئی واللہ خوب یاد دلایا اس کی بے تکی باتیں بہت مزے کی ہوتی ہیں اور جب وہ تیس مار خاں بن کر لمبی ہانکتا ہے تو بس کچھ نہ پوچھو۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑجاتے ہیں بھئی ضرور ساتھ رکھنگے

خالد۔ اسی لئے تو کہا۔ ورنہ شکار کا سارا لطف کرکرا ہوجاتا۔

حامد۔ ہاں، ہاں، آج شام کو ان کے یہاں چلیں گے اور اں سے کہدینگے کہ کل صبح شکار کے لئے تیار ہوجائیں۔

منظر دوم

[مجو میاں کا مکان، کلن اور مجو میاں باتیں کررہے ہیں]

مجو۔ آؤ بھئی کلن بیٹھو، کہو کیا حال ہے؟

کلن۔ حال بالکل اچھا ہے۔ آپ سنائیے مزاج تو اچھا ہے۔

مجو۔ ہاں ہاں بالکل اچھا ہے۔ کوئی نئی بات سناؤ۔

کلن۔ اور تو کوئی نئی بات نہیں، کل چھکن اور بتن میں لڑائی ہوگئی۔

مجو۔ اچھا کیوں کیا بات تھی؟

کلن۔ مرزا جی بات کیا ہوتی۔ دونوں بیوقوف ہیں ایک کہتا تھا کہ میں بہادر ہوں اور دوسرا کہتا تھا کہ میں۔

مجو۔ (ہنستا ہے) آئے بڑے بہادر بننے والے ارے کل کے لونڈے ہیں نہ ہوئے ہم ورنہ دکھا دیتے کہ بہادر کس کو کہتے ہیں۔

کلن۔ اجی آپ کے کیا کہنے آپ نے تو وہ وہ معرکے مارے ہیں کہ سبحان اللہ یاد ہے نا جس دن آپ نے چھچھوندر ماری تھی۔

مجو۔ (ہنستا ہے) ہاں یاد ہے بھائی اچھی طرح یاد ہے کیسی کمبخت چھچھوندر تھی۔ قابو میں نہیں آتی تھی۔ وہ تو تم جانو ہمارا ہی دل گردہ تھا کہ جی کڑا کرکے اور مولا علی کا نام لے کر ہم اندر گھس گئے ورنہ چھچھوندر مارنا آسان کام نہیں کلن۔

کلن۔ اجی آسان؟ میں تو کہتا ہوں کہ ہاتھی مارنا آسان ہے مگر چھچھوندر مارنا بہت ہی مشکل۔

مجو۔ اور دیکھو کتنے آدمی کھڑے تھے مگر آگے کوئی نہیں بڑھتا تھا سب تماشا دیکھنے والے ہی تھے۔

کلن۔ اجی مرزا جی۔ آڑے وقت پر کسی جرأت والے ہی کا کام ہوتا ہے جو موت کے منہ میں بید هڑک کود پڑتا ہے۔

مجو۔ اور پھر دیکھو ہم کیسے کود پڑے تن تنہا صرف ایک لکڑی تھی ہاتھ میں اور ایک ہمارا سچا رفیق ٹاڈ بھئی سچ پوچھو تو ہمارا ٹاڈ بہت کام کا کتا ہے بڑا وفادار ہے اس نے ہماری سیکڑوں مرتبہ جان بچائی ہے

کلن۔ اس میں کیا شک ہے مرزا جی میں تو اکثر غور کرتا ہوں کہ ایسا کتا آپکے ہاتھ کیسے لگ گیا کہاں سے منگایا تھا یہ کتا آپ نے۔ وفاداری میں یکتا ہے۔

مجو۔ (ہنستا ہے) قسمت تھی جو مل گیا۔ ورنہ اب تو قریب قریب یہ نسل ہی نابود ہوچکی ہے۔ یہ میرے والد مرحوم کے ایک دوست نے تحفہ دیا تھا۔ دیکھو تو اس کے بال اور کان یہ پھیر ذات کا کتا ہے مجھے اس کے ایک دفعہ چار اسی روپے ملتے تھے مگر میں نے نہیں دیا۔

کلن۔ سبحان اللہ کیا کہنا ہاں تو وہ چھچھوندر والا قصہ پھر رہ گیا۔

مجو۔ ہاں تو سب لوگ سٹ کے ٹکٹ باندھے کھڑے تھے اور دور سے داؤ تا رہے تھے مگر آگے بڑھنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ میں نے دور سے دیکھا اور دل میں سوچا کہ یا الہٰی ماجرا کیا ہے مگر کچھ سمجھ میں

نہ آیا۔ آخر میں بھی ادھر ہی چل پڑا۔

کلن۔ اچھا پھر ——؟

مجو۔ اس جمن کمبخت نے جو مجھے دیکھا اور دور ہی سے للکارا۔ ارے مرزا جی دوڑ کر آؤ۔ اور سب نے کہنا شروع کیا کہ ہٹ جاؤ۔ بس کام بن گیا۔ آگئے ہیں ہمارے بہادر مرزا جان اب کسی کی ضرورت نہیں، یہ اکیلے ہی کافی ہیں۔

کلن۔ کیوں نہیں، آخر یہی تو آپ میں بات ہے ایسی ایسی بہادری کے کام بھی تو کئے ہیں۔

مجو۔ تم بات سنو۔

کلن۔ ہاں ہاں فرمائیے۔

مجو۔ اب میں نے جمن کمبخت کو ہتیرا اشارہ کیا، انگلی سے اشارے کئے کہ کمبخت ہمارا نام نہ لو اور ہم چپکے سے وہاں سے کھسک جائیں مگر وہ مانا ہی نہیں برابر یہی کہتا گیا کہ ہٹ جاؤ مرزا جی کو آگے بڑھنے دو۔

کلن۔ بس پھر تو لوگوں کی جان میں جان آگئی ہوگی۔

مجو۔ سب دم بخود کھڑے تھے۔ میں نے دل میں کہا کہ میاں مرزا، اگر اس وقت جی چرا لیے ہو تو ساری عمر کا کیا دھرا غارت ہو جائیگا۔ چنانچہ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر گھس ہی تو گیا۔

کلن۔ مرزا جی سنا ہے کہ یہ چھچھوندر کمبخت ایسی چیز ہے کہ اگر کسی کو سونگھ بھی لے تو کئی کئی دن تک آدمی کو ہوش نہیں آتا۔

مجو۔ کئی کئی دن۔ ارے میں نے ایک آدمی کو دیکھا تھا کہ اسے چھ مہینہ تک ہوش نہیں آیا تھا۔ سینکڑوں حکیموں اور ڈاکٹروں نے علاج کیا تو جاکر چھ مہینہ بعد اسے زندگی نصیب ہوئی۔

کلن۔ کیوں مرزا جی اور اگر یہ چھچھوندر کمبخت کسی کو کاٹ لے۔

مجو۔ اجی توبہ کر دیار تو۔ خدا نہ کرے جو یہ نامراد جانور کسی کو کاٹ کھائے دیکھنے میں تو ذرا سا جانور ہے۔ سانپ کا کاٹا تو پھر بچ جاتا ہے مگر اس موذی کا کاٹا تو بچتا ہی نہیں۔ سنا ہے کہ یہ کاٹ کر کہتی ہے کہ پڑے ہو کر گرنا، میرے اوپر نہ گرنا۔

کلن۔ توبہ توبہ خدا بچائے پھر تو یہ سمجھئے آپ بالکل موت کے منہ میں تھے واللہ بڑے بہادر ہیں آپ بھی ورنہ ہم جیسوں کا تو پتا پانی ہو جاتا۔

مجو۔ جی ہاں اور کیا؟

کلن۔ تو پھر آپ نے کس طرح قابو کر لیا چھچھوندر کو؟

مجو۔ میں نے سوچا کہ بس اپنے نام کی لاج رکھنا تھی میں نے ٹانڈ کو آگے کر لیا اور کوئی ہتھیار وغیرہ تو تھا ہی نہیں، میرے پاس ایک لکڑی تھی اور بس۔

کلن۔ اور مرزا جی آپ ڈرے بھی نہیں، واللہ میں آپ کی جگہ ہوتا تو بھاگ کھڑا ہوتا۔

مجو۔ (ہنستا ہے) مجھ میں اور دوسرے لوگوں میں یہی تو فرق ہے کہ بس مارِ جان یوں ہی نہیں جاتا۔ میاں کچھ کر کے بھی دکھانا پڑتا ہے۔

کلن۔ بھئی، ہم تو پہلے ہی سے مانتے ہیں۔ اچھا پھر؟

مجو۔ بس میں نے ٹانڈ کو آگے کر لیا اور لکڑی سے ٹٹولتا ہوا ادھر سے ادھر سے چکر لگانے شروع کئے اب چھچھوندر کمبخت قابو میں نہیں آتی تھی ایک مرتبہ تو مجھ پر حملہ کیا مگر وہ تو اللہ نے کرم کیا جو میں صاف بچ گیا ایک مرتبہ تو اس نے کاٹ ہی لیا تھا۔ جو پھر میں فوراً اوپر نہ کر لیتا ایک گھنٹہ اسی تگ و دو میں ہو گیا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور برابر پیچھے لگا ہی رہا۔

کلن۔ اور آپ تھکے بھی نہیں واللہ کیا کہنے آپ کی بہادری کے بھی؟

مجو۔ تم سنتے جاؤ۔

کلن۔ ہاں ہاں کہئے۔

مجو۔ بس ایک مرتبہ جو وہ مجھ پر جھپٹی ہے۔ میں وار بچا لیا اب وہ تڑپ کر دوبارہ اوپر اچھلی تھی کہ ٹانڈ کے منہ میں آگئی بس پھر کیا تھا۔ ٹانڈ نے جو ہی اسے بیس کر منہ پر ڈالا میں نے لاٹھیاں مار مار کر اس کا کچومر نکال دیا۔

کلن۔ آہا، ہاہا کیا کہنے مرزا جی کے پھر تو سب مان گئے ہونگے۔

مجو۔ مانتے کیسے نہیں —— دشمن سامنے مرا پڑا تھا بس پھر ہر طرف سے مبارکباد کی صدائیں آنی شروع ہو گئیں۔ بھئی اسے کہتے ہیں بہادری۔ کہنے سے کوئی بہادر نہیں بن جاتا۔

کلن۔ بیشک، بیشک، درست ہے۔

کلن - اجی مرزا صاحب انہی باتوں کی وجہ سے تو آپ تیس مار خاں کہلاتے ہیں بھلا خیال تو کیجئے جنگلی بلی کا مارنا کس قدر دشوار ہے یہ سب تجربے کی باتیں ہیں مرزا صاحب ورنہ جان سلامت نہ بچتی۔

خالد - اچھا بھائی ان پرانے قصوں کو تو چھوڑ دو۔ بس کل صبح کے لئے تیار ہو جائیے۔

مجّو - بھائی میں کل تو نہیں جا سکتا۔ اور تم لونڈوں کا کیا ٹھیک کوئی اور آفت مار کر دوگے۔

خالد - نہیں مرزا میں بھئی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ نہیں گئے تو واللہ ہم بھی نہیں جائیں گے۔

کلن - کیا ڈر گئے مرزا جی۔

مجّو - حسب الامقولہ ہم اور ڈر جائیں۔

کلن - تو پھر چلتے کیوں نہیں؟

مجّو - اگر ڈر جانے کی بات ہو تو بھئی ضرور چلیں گے۔

خالد - بس یہ بات ہوئی مرزا جی بہادروں والی۔ اچھا تو کل صبح ہم آجائینگے۔

مجّو - اچھا بھئی اگر تم اصرار کرتے ہو تو ضرور چلیں گے اب کیا کیا جائے۔

خالد - مرزا جی یہی تو خوبیاں ہیں آپ میں جو سب آپکے گن گاتے ہیں اچھا اب میں جاتا ہوں۔ کل انشاء اللہ حاضر ہونگا۔ آداب عرض

مجّو - آداب عرض۔

کلن - اچھا مرزا صاحب اب مجھے اجازت دیجئے پھر کسی وقت حاضر ہونگا۔ السلام علیکم!

مجّو - ارے بھئی کلن کل تم بھی کیوں نہیں چلتے شکار کو۔

کلن - مرزا جی دل تو میرا بہت چاہتا ہے گر ڈر لگتا ہے۔

مجّو - (ہنستا ہے) بھئی بڑے ڈرپوک ہو۔ ارے یار جب ہم ساتھ ہونگے، تو پھر ڈر کس بات کا،

کلن - اچھا مرزا جی میں بھی چلونگا آپ مطمئن رہیں۔ (جاتا ہے)،

منظر چوتھا!

[رات کا وقت، مرزا اور اس کی بیوی سو رہے ہیں]

راشدہ - کیا سو رہے ہو تم یا جاگ رہے ہو؟

مجّو - (خراٹے لے رہا ہے) کھر۔ کھر۔

راشدہ - سنتے ہو سنو تو۔

مجّو - (بدستور خراٹے لے رہا ہے)

راشدہ - اے ہے سنو بھی، تم تو مردوں سے شرط باندھ کر سوتے ہو۔

مجّو - کیا ہے سونے بھی دوگے یا نہیں۔ مجھے صبح ہی صبح شکار کو جانا ہے

راشدہ - میں کہتی ہوں چلاؤ مت، آہستہ بولو،

مجّو - کیوں کیا بات ہے۔ نیند حرام کر دی۔ کیا مزے سے سو رہا تھا اور کیسا عجیب خواب دیکھ رہا تھا کتنا بڑا شیر مارا ہے خواب میں۔

راشدہ - یہ شیخ چلی کی سی باتیں پھر کر لینا میں کہتی ہوں آہستہ بولو اور میری بات سن لو۔

مجّو - کیوں کیا بات ہے۔ خیریت تو ٹھیک ہے نا؟

راشدہ - اوپر والے کمرہ میں کھڑکا ہو رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کمرہ میں پھر رہا ہے۔

مجّو - کمرے میں اس وقت کون آسکتا ہے۔ ایسے تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔

راشدہ - میں نے خواب واب کچھ نہیں دیکھا واقعی کوئی کمرہ میں گھسا ہوا ہے۔

مجّو - مگر اب تو کوئی کھٹکا نہیں ہو رہا۔ خواہ مخواہ جگا دیا۔ ادھر کس بلا کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ (رضائی کھینچ کر پھر تان لیتا ہے)

راشدہ - میں کہتی ہوں اٹھ کر جاؤ ذرا دیکھو۔ پھر کھٹکا ہوا ہے۔

مجّو - نہیں تو وہم ہو گیا ہے۔ چپکے سے سو رہو۔

راشدہ - یہ دیکھو اب پھر آواز آئی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صندوق کے تالے توڑ رہا ہے

مجّو - اجی کچھ بھی نہیں۔ میں کہتا ہوں تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ بھلا اس وقت کسی چور کو کیا ضرورت پڑی ہے۔ ٹھنڈ میں مارا مارا پھرے تم اطمینان سے سو جاؤ۔ صبح دیکھا جائیگا۔

راشدہ - تم اٹھتے ہو یا نہیں غضب خدا کا اندر چور گھسے ہوئے ہیں اور ہم جاگتے ہی جاگتے اپنا گھر لٹوا رہے ہیں۔ مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جا سکتا۔

مجّو - اب تمہارے وہم کا کیا علاج بیگم یقین کرو کچھ بھی نہیں۔

راشدہ - میں یقین کیسے کر لوں۔ جب میں اپنے کانوں سے سن رہی ہوں تم جا کر دیکھ آؤ پھر مجھے یقین ہو جائیگا۔

مجّو - تم تو بیکار کی بحث میں رات یونہی ختم کر دوگی۔ ہم تو سوتے ہیں۔

راشدہ - یہ کیوں نہیں کہتے کہ ڈرتے ہو۔ اٹھو گے یا میں دوں پڑوسن کو آواز کہ کسی مردوے کو بھیجے۔ یا اللہ ایسے ڈرپوک مردوے بھی ہونگے جیسے یہ۔

مجو - کون کمبخت ڈر رہا ہے۔ دنیا تو ہماری بہادری کا لوہا مانتی ہے اور گھر میں بیگم صاحبہ ڈرپوک کہتی ہیں۔

راشدہ تو پھر اٹھتے کیوں نہیں؟

مجو - اٹھتا اس لئے نہیں ہوں کہ مجھے معلوم ہے کہ اوپر کچھ بھی نہیں

راشدہ اچھا پھر دیتی ہوں پڑوسن کو آواز اری

مجو - بیگم خدا را ایسا مت کرو۔ کیوں مجھے ذلیل کرتی ہو۔

راشدہ تو پھر اٹھو اور اوپر جاکر دیکھو۔ - دیکھو پھر کھٹکا ہوا۔

مجو - مگر میں کہتا ہوں کہ کہیں باہر تو جاتا نہیں پھر تم ہی دیکھ آؤ نا۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو آواز دے دینا۔

راشدہ تو لو یہ چوڑیاں تم پہن لو۔ تم ہیں آتی عورتوں سے جو مرد اتنے ہو۔ بزدل کہیں !

مجو - دیکھو بیگم بزدل مت کہو۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر بزدلی کا لفظ میرے لئے ناقابل برداشت ہے تمہیں معلوم ہے میری بہادری کی وجہ سے لوگ مجھے تیس مار خاں کہتے ہیں۔

راشدہ تو پھر اٹھتے کیوں نہیں تیس مار خاں صاحب؟

مجو - دیکھو بیگم مان جاؤ بیکار تکلیف دے رہی ہو۔ خدا کی قسم کچھ بھی نہیں آرام سے سو جاؤ۔

راشدہ اچھا تو میں دیتی ہوں پھر پڑوسن کو آواز۔ اری حمیدہ حمیدہ،

مجو - بیگم خدا کے لئے ایسا مت کرنا۔ میری تمام شہرت برباد ہو جائیگی پڑوسن دل میں کیا خیال کریگی کہ مرزا جی ایسے بزدل ہیں۔

راشدہ بزدل تو ہو ہی تم۔

مجو - دیکھو بیگم اور جو جی میں آئے کہہ لو مگر مجھے بزدل مت کہو۔

راشدہ تو پھر اٹھو اوپر جاکر دیکھو کیا معاملہ ہے سو پھر کھٹکا ہوا۔ میرے اللہ ہم لٹ گئے۔ میرے سب زیور لیجائیگے کمبخت،

مجو - بیگم اس مرتبہ میں نے غور سے سنا ہے۔ یہ چور کی آواز ہرگز نہیں کوئی چھپکلی وغیرہ گری ہو گی۔

راشدہ اچھا تم یونہی باتیں بناتے رہو اور میں پڑوسن کو آواز دیتی ہوں کہ کسی مردوے کو بھیجے۔ اری ..

مجو - اچھا بیگم میں اٹھتا ہوں، تم پڑوسن کو آواز مت دو۔

راشدہ تو اٹھو پھر۔

مجو - ہاں اٹھتا ہوں، یا اللہ کیا اطمنان سے سوئے ہوئے تھے۔ کیسی نیند حرام ہوئی ہے۔ بیوی بھی کیا زحمت ہوتی ہے بیگم دیکھو میں پھر کہتا ہوں کہ اوپر کچھ بھی نہیں۔ اگر ٹھنڈ ونڈ لگ گئی تو نمونیا ہو جائیگا۔ پھر لینے کے دینے پڑ جائینگے۔

راشدہ اچھا تم اطمنان سے لمبی تان کر سو رہو میں دیتی ہوں پڑوسن کو آواز۔

مجو - اب تم اطمینان سے تھوڑا ہی سونے دو گی اس پڑوسن کمبخت نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ لو بیگم صاحبہ میں اٹھ بیٹھا ہوں اب بولو کیا کہتی ہو؟

راشدہ بس اوپر جاکر دیکھو کیا کھٹکا ہے؟

مجو - اچھا جاتا ہوں - مگر ایک بات کہتا ہوں بیگم برا مت ماننا۔

راشدہ وہ کیا،

مجو - اب تمہیں مجھ سے ذرا سی محبت نہیں رہی۔

راشدہ وہ کیسے؟

مجو - دیکھو نا۔ اب مجھے خود ہی موت کے منہ میں دھکیل رہی ہو۔

راشدہ واہ کیا محبت جتائی ہے بس مجھے معلوم ہو گیا کہ تم بہانے بنا رہے ہو میں پڑوسن کو آواز دیتی ہوں۔

مجو - بس نہیں پڑوسن کو آواز دینے کی ضرورت نہیں اب جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائیگا۔ تمہاری بلا سے۔

راشدہ تو جلدی کرو۔ دیکھو پھر آواز آئی۔

مجو - اچھا تو ذرا ماما کو گرز لا دو اور لالٹین جلا دو۔

راشدہ لو یہ لالٹین اور گرز وہ سامنے کونے میں پڑا ہے۔

مجو - (ٹھنڈی سانس بھر کر) لاؤ یعنی دل کی دل میں ہی رہ گئی۔

راشدہ کیا دل کی دل ہی میں رہ گئی؟

مجو - بیگم آج ہم بازار سے واپس آ رہے تھے تو پنا لال بزاز کی دوکان پر ایک نہایت نفیس پھولدار ریشم دیکھا تھا۔ خیال تھا کہ کل صبح ہی صبح تمہارے لئے اس میں سے ایک سوٹ کا کپڑا لے آئیں مگر

اور ننھے کیلئے اس میں سے ایک اچکن بنائینگے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو منظور نہیں۔

راشدہ۔ اب پھر لگے باتیں بنانے۔ دوں پڑوسن کو آواز۔

مجّو۔ اب بھلا پڑوسن کو آواز دینے کی کیا ضرورت ہے۔

راشدہ تو پھر جاتے کیوں نہیں؟

مجّو۔ جا تو رہا ہوں۔ اچھا ایک مرتبہ ننھے کو دیکھ لینے دو اور پیار کرلینے دو۔ کیا چاند سا مکھڑا ہے۔ بے ماہو بہو ہماری شکل اچھا میاں حافظ تمہاری کوئی خوشی دیکھی نصیب ہوئی مجھے۔

راشدہ جاتے ہو یا میں دوں پڑوسن کو آواز

مجّو۔ اچھا بیگم جاتے ہیں مگر ہمارے بعد ننھے کا خیال رکھنا۔

راشدہ تم نہیں جاؤگے یونہی باتیں بناتے رہوگے۔

مجّو۔ بس اب جاتے ہیں کون سی کمی باقی ہے مگر بیگم اگر تم بھی ہمارے ساتھ چلو تو بہت اچھا ہے۔ ایک سے دو بھلے اگر ہم بیہوش ہو جائیں تو کم از کم پانی تو منہ میں ڈال دوگی اور ہم پیاسے تو نہیں مرینگے۔

راشدہ ماشااللہ کیسا ڈرپوک مرد ہے۔ چل نوج میں چلتی ہوں۔

مجّو۔ چلو چلو! بیگم میں ڈر کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ دوسرے سامنہ کی وجہ سے کہتا ہوں۔

راشدہ اچھا اب باتیں مت بناؤ۔ چلو،

مجّو۔ بیگم یہ لالٹین مجھے دیدو اور یہ لٹھ تم اپنے ہاتھ میں لے لو۔

راشدہ اچھا یہ چوڑیاں تم پہن لو اور یہ لٹھ میں پکڑ لیتی ہوں۔ واہ رے تیس مار خاں!

مجّو۔ دیکھو مجھے غصہ مت دلاؤ۔ نہیں تو میں اکیلا ہی چلا جاؤنگا۔

راشدہ تو پھر جاتے کیوں نہیں۔ مجھے کیوں ساتھ لئے جا رہے ہو۔

مجّو۔ دیکھو بیگم ناراض مت ہو۔ تم ساتھ ہوگی تو ڈھارس بندھی رہیگی۔

راشدہ اب چلوگے بھی یا باتیں ہی بناتے رہوگے۔

مجّو۔ بس اب بالکل چل ہی دو۔ بیگم تم ذرا آگے ہو جاؤ۔

راشدہ اگر تمہیں کوئی کھا جائیگا تو دیں ہی آگے ہو جاتی ہوں۔ آپ ہی جان کتنی پیاری ہے۔

(دونوں اوپر جاتے ہیں)

راشدہ۔ لو کھولو دروازہ اور دیکھو۔

مجّو۔ مگر کواڑ تو بند معلوم ہوتا ہے۔ بس اسی سے سمجھ لو کہ سب طرح خیریت ہے۔ اندر کوئی بھی نہیں۔

راشدہ دروازہ کھولتے ہو یا دوں میں پڑوسن کو آواز۔

مجّو۔ تم نہیں مانوگی۔ دیکھو بیگم اپنے ہاتھوں سے اپنی بیوگی کا سامان پیدا کر رہی ہو اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ پیش ہو رہا ہے جب تم بیوہ سی ہوئی بیٹھی رو رہی ہوگی۔ آہ یا اللہ موت بھی آئی تو کیسے ذلت،

راشدہ اچھا اگر تم مر ہی چکے ہو تو کواڑ میں کھول دیتی ہوں (کواڑ کھولتی ہے) لو اب دیکھو اندر جاکر۔

مجّو۔ جب کواڑ تم نے کھول دیا تو لگے ہاتھوں اندر بھی جاکر دیکھو آؤ ہم یہاں کھڑے ہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

راشدہ اب جاتے ہو یا میں دوں پڑوسن کو آواز۔ نوج تم سے تو عورتوں کا حوصلہ اچھا ہوتا ہے۔

مجّو۔ اچھا بیگم تو تمہاری مرضی۔ مگر ذرا دیکھو لالٹین لے کر ہمارے ساتھ ساتھ چلو اور ذرا آگے ہو جاؤ تو اور بھی اچھا ہے۔

راشدہ اچھا چلو۔ میں آگے ہی چلتی ہوں۔

[دونوں داخل ہوتے ہیں۔ بلی میاؤں میاؤں کر رہی ہوتی ہے]

مجّو۔ بیگم ذرا سنبھل کر۔ بس یہیں کھڑی رہو میں اپنا لٹھ سنبھال لوں تاکہ چور کے وار کرنے سے پہلے ہم وار کر دیں۔

راشدہ بس دیکھ لیا میں نے اب لٹھ سنبھالنے کی ضرورت نہیں۔

مجّو۔ کیوں کیا بات ہے۔ چور بھاگ گئے۔

راشدہ چور کا تو نام و نشان بھی نہیں نگوڑی ماری بلی ہے۔

مجّو۔ بلی ہے؟ کیا کر رہی ہے؟

راشدہ ایک چوہے کو اچھال اچھال کر کھیل رہی ہے۔

مجّو۔ دیکھو بیگم [illegible] بھی ہیں مگر تم تو بیکار محبت کر رہی تھیں دوں کی کیا شامت آئی تھی جو اس گھر میں گھستے جانتے نہیں ہیں کس کا گھر ہے ضرار آتیں تو بتا سکا گھر ہے۔ مذاق تھوڑا ہی ہے کوئی اگر چور آجاتے تو مار کر بھس نکال دیتا [illegible] کا نام [illegible]۔

راشدہ۔ بس شیخی مت بگھارو۔ دیکھ لی تمھاری بہادری۔ اگر میں ساتھ نہ
ہوتی تو تم چلے [illegible] آتے۔

مجو۔ اوں! میں تو مذاق کر رہا تھا ورنہ اس میں ڈرنے کی کون سی بات تھی۔

راشدہ۔ اچھا چلو اب اتنی ڈینگیں نہ ہانکو۔

دوسرے دن صبح

حامد۔ مرزا صاحب! اماں مرزا جی! مجو میاں!

مجو۔ گامو! ارے گامو! او گامو! کمبخت کیا سانپ سونگھ گیا سامنے ہو تو بولتا۔ بہرہ

گامو۔ جی ہاں، میاں میں تو بول رہا ہوں آپ سنتے ہی نہیں۔

مجو۔ جا دیکھ یہ آدھی رات کے وقت کون بلا رہا ہے۔ کمبخت رات کو
بھی چین نہیں لینے دیتے۔ ہم نے تو آج رات ویسے ہی جاگ
کر کاٹی ہے۔ پہلے بیگم صاحبہ نے جگا دیا ان کی ٹک ٹک جھک جھک
میں دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ اس وقت ذرا آنکھ لگی تھی جو باہر سے
مرزا جی مرزا جی کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

گامو۔ مگر میاں اب تو ساڑھے چھ بج چکے ہیں آدھی رات تھوڑا ہی ہے

مجو۔ اچھا کمبخت باتیں پھر بنانا پہلے جا کر دیکھ تو کہ کون ہے۔

گامو۔ جی اچھا میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔

مجو۔ اس سویرے کون ہو سکتا ہے؟

گامو۔ مرزا جی۔ حامد میاں، خالد اور کلن آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ مرزا
جی کو جلدی بلاؤ دیر ہو رہی ہے۔

مجو۔ اے لاحول ولا، میں تو قطعی بھول گیا وہ شکار جانے کے لئے کہہ
رہے ہونگے اور میں نے کچھ تیاری بھی نہیں کی اچھا دیکھو گامو ان سب
بیٹھک میں بٹھا دو اور کہہ دو کہ مرزا جی ابھی آتے ہیں۔

گامو۔ اچھا میاں — آئیے صاحب آپ بیٹھک میں تشریف
لائیے۔ میاں ابھی آتے ہیں۔

حامد۔ اچھا بھائی لو ہم بیٹھ جاتے ہیں مگر تم جا کر مرزا جی سے پھر کہہ دو کہ فوراً
آ جائیں، بہت دیر ہو گئی ہے۔

گامو۔ جی ہاں میں ابھی جا کر انہیں بھیجتا ہوں۔ (جاتا ہے)

حامد۔ بھئی بڑا پوستی ہے یہ مرزا بھی۔ سات بجنے کو ہیں اور یہ ابھی بستر ہی
پر پڑا اونگھ رہا ہے۔

گامو۔ میاں انھیں بیٹھک میں بٹھا آیا ہوں مگر وہ کہہ رہے ہیں مرزا جی
کو جلدی بھیج دو۔

مجو۔ اچھا لو میں جاتا ہوں تم ذرا پان لے آؤ جلدی اور دیکھو ہم آج شکار
کو جائیں گے سب سامان درست کر دینا۔

گامو۔ بہت اچھا سرکار،

مجو۔ السلام علیکم،

حامد۔ واہ مرزا صاحب واہ اتنی دیر کر دی۔ کیا افیم کھا کر سوئے تھے رات
جو اس وقت تک ہوش نہیں آیا۔

مجو۔ نہیں یار افیم کیا کھائی تھی۔ آج رات ایک عجیب قصہ ہو گیا۔

حامد۔ وہ کیا ــــ؟

کلن۔ کوئی بہادری کا ہی کام کیا ہو گا۔

خالد۔ کیوں مرزا جی، کیا بات تھی؟

مجو۔ بات یہ تھی کہ کوئی آدھی رات کا وقت ہو گا میں بڑا بے خبر سو رہا تھا
کہ ایکدم منے کی والدہ نے مجھے جگا دیا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور اس سے
پوچھا کیا بات ہے اس نے کہا بالا خانے میں چور گھس آئے ہیں۔

حامد۔ اچھا تو واقعی چور تھے۔

مجو۔ میں نے پہلے تو مانا نہیں مگر تھوڑی دیر میں کھٹ کھٹ کی آوازیں آنا
شروع ہو گئیں اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔

خالد۔ اچھا پھر؟

مجو۔ بس میں نے اللہ کا نام لیکر لٹھ سنبھالا اور سیدھا بالا خانے پر جا پہنچا
ہوں دیکھتا ہوں کہ چور صندوق کے تالے توڑنے میں مصروف ہیں۔

کلن۔ او ہو مرزا جی کتنے تھے چور؟

مجو۔ چار، کوئی چھ چھ فٹ کا جوان،

حامد۔ اور آپ بالکل تنہا!

مجو۔ جی بالکل اکیلا،

کلن۔ مرزا جی یہ آپ ہی کا دل گردہ ہے ورنہ ہم ایسا کوئی ہوتا تو چور
کا نام سن کر بیہوش ہو جاتا۔

حامد۔ ارے بھائی پوری بات تو سن لینے دو۔ ہاں مرزا جی پھر کیا ہوا؟

مجّو۔ بس اودھر جو پہنچا ہوں اور چوروں کو للکارا ہے کہ کمبختو تمہاری کیا شامت آئی ہے جو مرزا تیس مار خاں کے مکان میں گھس آئے ہو بس یہ سننا تھا کہ چوروں کے اوسان خطا ہو گئے اور لگے ایک ایک کرکے بھاگنے۔

خالد۔ تو آپ نے پکڑا نہیں کسی کو؟

مجّو۔ اجی میرے پہنچتے پہنچتے سب بھاگ گئے سر پہ پاؤں رکھ کر بس ایک ابھی دیوار پر سے کود رہا تھا جو میں پہنچ گیا۔

کلن۔ پھر اس کو آپ نے مار دیا ہوگا۔ جان سے ہی۔

مجّو۔ اجی لپک کر میں نے ایک کڑاکے کا ہاتھ جو دیا ہے تو بھاگا ہی گیا۔ ٹانگ تو ٹوٹ ہی گئی ہوگی کمبخت کی۔ کہنے لگا معاف کیجئے مرزا جی ہم دھوکے میں آپ کے گھر میں گھس آئے تھے۔

حامد۔ واہ بھئی واہ کیوں نہ ہو آخر یونہی تو تیس مار خاں نہیں بنے پھرتے آپ؟

خالد۔ بھئی واللہ مرزا جی کمال کر دیا آپ نے۔ اب ہم آپ کی بہادری کا سکہ مان گئے۔

کلن۔ اچھا بھئی اب دیر ہو رہی ہے چلنا چاہئیے۔

حامد۔ ہاں مرزا جی جلدی چلئے ورنہ شکار کا وقت نکل جائیگا۔

مجّو۔ ہاں ہاں بس ابھی چل دیتے ہیں۔ ذرا ناشتہ تیار ہو جائے اور اسباب بندھ جائے۔

حامد۔ ناشتے کی کیا ضرورت ہے مرزا جی۔ سفر کو تو نہیں جا رہے۔ شکار کو جا رہے ہیں۔ شکار مارینگے اور بھون کر کھائینگے۔

مجّو۔ بھئی یہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی احتیاطاً کچھ نہ کچھ ساتھ لے ہی جانا چاہئیے۔ میں نوکر سے کہے دیتا ہوں ابھی سب انتظام ہو جائیگا۔ ارے گامو او گامو۔

گامو۔ جی سرکار، حاضر ہوا کہئے کیا حکم ہے؟

مجّو۔ دیکھو گامو، بیگم سے کہو کہ جلدی ناشتہ تیار کر دے اور ہاں سنو تم جلدی سے میرا بستر باندھ دو اور ایک جوڑی نئے کپڑے رکھ دینا۔ ہماری چھڑی اور چھاتہ بھی رکھ دینا۔ ایک تولیہ اور صابن بھی اور ایک لوٹا بھی۔

گامو۔ بہت اچھا سرکار میں ابھی سب کچھ تیار کر دیتا ہوں۔

مجّو۔ ابے سن تو بیہودے۔ پوری بات تو سن لیا کر۔ دیکھ ہماری نئی اچکن بھی رکھنا۔ سمجھے۔ کون سی بھلا۔

گامو۔ اجی وہی جو کھونٹی پر ٹنگی ہوئی ہے۔

مجّو۔ ارے نہیں کمبخت وہ نہیں۔ اسی لئے تو میں نے پوچھا تھا۔ ہو تا بالکل گدھے ہی۔ وہ دوسری جو پھولدار ہے۔ اب سمجھے؟

گامو۔ جی ہاں سمجھ گیا۔

مجّو۔ سمجھے، بس اب جلدی جا، اور ہاں ایک بات تو رہ گئی بیگم سے کہدو کریاوں کی ڈبیا میں اچھے اچھے چھانٹ کر پان لگا دے اور ہمارے بٹوے میں بہت سی چھالیا بھر دے۔

حامد۔ مگر مرزا صاحب میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ بازار میں جا رہے ہیں یا شکار کے لئے۔

مجّو۔ جا تو رہے ہیں شکار ہی کھیلنے مگر احتیاطاً یہ سب چیزیں ساتھ لے چلتے ہیں۔

حامد۔ شکار میں لیجانے کی اصل چیز تو آپ بھول ہی گئے۔ مگر احتیاطاً سب چیزیں سب چیزیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

مجّو۔ کیا کوئی ضروری چیز بھول بھی گیا ہوں؟

حامد۔ جی ہاں —!

مجّو۔ وہ کیا؟ بس میں سمجھ گیا۔ حقہ کہہ رہے ہونگے آپ۔

حامد۔ جی نہیں وہ بندوق ہے مرزا صاحب جو شکار کا اصل ہتھیار ہے۔ سمجھے آپ

مجّو۔ ارے وہ تو میں قطعاً بھول گیا۔ بھئی واللہ خوب دلایا۔ ورنہ راستے ہی سے لوٹنا پڑتا۔ ارے گامو، او گامو،

گامو۔ جی حضور!

مجّو۔ ارے کمبخت ہم شکار میں لانے کی اصل چیز تو بھول ہی گئے ہیں اور تم نے یاد بھی نہیں دلائی۔

گامو۔ وہ کیا؟ میں نے تو نیا جوتہ بھی رکھدیا ہے بس اب سامان باندھ رہا ہوں

مجّو۔ ارے بدتمیز جوتا نہیں۔ بندوق۔ ہماری بندوق کدھر ہے شکار کی اصل چیز تو بندوق ہوتی ہے۔

گامو۔ بہت اچھا سرکار، بندوق بھی باندھ دیتا ہوں۔

مجّو۔ ابے بندوق بندھیگی نہیں، ہمارے ہاتھ میں رہیگی۔

گامو۔ اچھا میاں!

مجّو۔ اور دیکھو ہماری کارتوسوں والی پیٹی بھی نکال لینا۔

گامو۔ اچھا سرکار۔

~~~~~~

راشدہ ارے گامو یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کہاں کی تیاری ہو رہی ہے؟

گامو۔ بیگم صاحبہ آپ جلدی ناشتہ تیار کر دیجئے۔ میاں شکار میں جا رہے ہیں
اور ڈبیا میں پان بھی لگا دیجئے۔

راشدہ شکار جا رہے ہیں یا کہیں شادی میں جا رہے ہیں رکھ دو سب سامان
یہیں۔ ناشتہ جلدی تیار کر دو جیسے ہرن مار کر لائینگے آج۔

گامو۔ بہت اچھا بیگم صاحبہ اب میں جا کر کیا کروں؟

راشدہ رکھ دو کہ اتنا سامان لیجانے کی ضرورت نہیں بس بندوق کافی ہے

گامو۔ اچھا سرکار،

مجو۔ ارے گامو، او گامو۔

گامو۔ آیا حضور۔

مجو۔ کیا ہو گیا سب سامان تیار؟

گامو۔ نہیں حضور بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ سامان لیجانے کی کوئی ضرورت نہیں
صرف بندوق کافی ہے۔

حامد۔ ہاں مرزا صاحب میں نے پہلے ہی کہا کہ سامان مت لیجئے۔

مجو۔ اچھا کمبخت، تو جانے اور تیری بیگم صاحبہ جانے جاؤ میری بندوق
تو لے آؤ یا اس کی بھی ضرورت نہیں

گامو۔ بہت بہتر سرکار

خالد۔ بھئی ہمارے مرزا جی کا نشانہ بہت پکا ہے ہم نے تو کبھی چوکتے دیکھا نہیں۔

کلن۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو پرانے کھلاڑی ہیں جبھی تو تیس مار خاں کہلاتے ہیں۔

حامد۔ تو بس مرزا جی آج کوئی موٹا سا شکار ماریے۔

مجو۔ دیکھو بھئی اب جیسا موقع ہو جائے۔

گامو۔ لیجئے سرکار یہ بندوق ہے اور یہ کارتوسوں کی پیٹی۔

مجو۔ لاؤ ــــ،

حامد۔ بس اب چل دو مرزا جی،

مجو۔ ہاں بھئی چلو خدا خیر سے واپس لائے۔

حامد۔ مرزا جی جنگ پر تھوڑے ہی جا رہے ہیں جو اتنی دعائیں مانگ رہے ہو

مجو۔ ارے بھائی یہ شکار کا معاملہ بھی بہت ہی بیڈھب ہوتا ہے تم کیا جانو۔

حامد۔ اچھا خیر۔ اب چلئے۔ اٹھو بھئی اٹھو۔

[سب جاتے ہیں]

راشدہ ارے گامو کیا چلے گئے تمہارے مرزا جی شکار کو؟

گامو۔ جی ہاں ــــ!

راشدہ جیسا ماتھ چوہا پکڑا تھا۔ ویسا ہی شکار مار لائینگے۔

گامو۔ جی بیگم صاحبہ ہمارے میاں تو بہت بہادر ہیں۔

راشدہ ہاں بہت بہادر ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں دہشت سے ہی بیہوش نہ ہو جائیں

~~~~~~

حامد۔ اچھا مرزا جی لیجئے۔ اب ہم جنگل میں داخل ہو رہے ہیں اب آپ شکار
کی ساری گھاتیں بتا دیجئے۔

مجو۔ (ہنستا ہے) آخر مرزا جی کی ضرورت پڑ ہی گئی نا!

کلن۔ اجی اسی لئے تو آپ کو ساتھ لیتے ہیں۔

مجو۔ اچھا بھئی تھوڑی دور اور چلو پھر بتا دینگے شکار کی گھاتیں ایکدم سے تھوڑی
ہی آ جاتی ہیں رفتہ رفتہ آتی ہیں ہم یونہی تو نہیں بن گئے ہیں میں کی خاں

حامد۔ خالد۔ خالد ادھر آؤ۔ میرے خیال میں تم جاؤ اس طرف اور کلن کو میں
دوسری طرف بھیجتا ہوں مرزا جی اور میں فی الحال ایک ساتھ رہتے ہیں۔

خالد۔ نہیں بھئی ہم تو اپنے استاد مرزا جی کے ساتھ رہینگے۔

حامد۔ نہیں بھئی نہیں بس جانا پڑیگا۔ مرزا جی میرے ہی ساتھ رہینگے۔

خالد۔ اچھا بھئی اگر تم کہتے ہو تو ہم ہی چلے جاتے ہیں۔

حامد۔ بس اب تم چلے جاؤ جلدی سے ہاں ایک بات ذرا۔

خالد۔ وہ کیا ــــ؟

حامد۔ ٹھہرو میں تمہارے پاس آ کر کہتا ہوں ــــ دیکھو تم ان جھاڑیوں
کے پیچھے جا کر شیر کی طرح دہاڑنا شروع کر دو۔ پھر تم تماشہ دیکھنا
اس مسخرے تیس مار خاں کا۔

خالد۔ اچھی بات ہے (ہنستا ہے) بھئی خوب سوجھی یہ۔ مزا آ جائیگا آج مرزا
غریب تو مر جائیگا۔

حامد۔ چلو ذرا دل لگی تو رہیگی۔ میں کلن کو اُدھر بھیجتا ہوں۔ اس کو بھی
سمجھا دونگا۔ کلن۔ کلن۔

کلن۔ ہاں بھیا ــــ!

حامد۔ دیکھو تم اس طرف چلے جاؤ اور احتیاط کے ساتھ دیکھ بھال کر چلنا، یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔

کلن۔ اچھا بھیا۔

حامد۔ آؤ مرزا جی ہم ادھر چلیں۔

مجنّو۔ چلو بھئی چلو خدا کی پناہ کیسا خوفناک جنگل ہے۔ یہاں تو دن کو بھی رات معلوم ہوتی ہے۔

حامد۔ اچھا مرزا جی یہ تو بتایئے کہ اگر خدانخواستہ اس وقت یہاں سے شیر نکل آئے تو پھر کیا ہو؟

مجنّو۔ ارے توبہ کرو یار خدا نہ کرے جو ایسا ہو۔

حامد۔ یہ جگہ تو ایسی ہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر بالفرض ایسا ہی ہو جائے تو پھر —؟

مجنّو۔ پھر کیا بندوقیں تو بھری رکھی ہیں دن سے فیر کر دیں۔

حامد۔ آفریں ہے مرزا جی آپ کی جرأت پر۔

مجنّو۔ (ہنستا ہے) ارے بھئی عمر گذر گئی اس دشت کی سیاحی کرتے ہوئے سینکڑوں شیر ہم نے مار ڈالے ہیں اسی طرح۔ اچھا بتاؤ ایسے موقع پر تم کیا کرو؟

حامد۔ میں تو لمبا لمبا لیٹ ہو جاؤں پھر چاہے کچھ ہی ہو۔ چاہے وہ چھوڑ جائے چاہے کھا جائے۔

مجنّو۔ (بڑے زور سے ہنستا ہے) ہونہ آخر لڑکے ہی ہو بھئی ایک بات ہماری بھی یاد رکھو۔

حامد۔ وہ کیا مرزا جی جلدی سے بتلایئے۔

مجنّو۔ وہ یہ کہ چاہے کیسا ہی خطرناک موقع پیش آ جائے اوسان خطا نہ ہونے دینا، پھر سب خیریت ہے۔

حامد۔ بھئی مرزا واللہ، بات تو ایک لاکھ کی بتا دی آپ نے۔

مجنّو۔ (پھر ہنستا ہے) ایسی ایسی تو سینکڑوں باتیں مجھے یاد ہیں۔

حامد۔ ارے مرزا صاحب خدارا ہنسئے نہیں۔ یہ دیکھئے کیا آواز آ رہی ہے

مجنّو۔ کہاں ——؟

حامد۔ سنئے، یہ سنئے، ارے یہ تو پاس ہی کہیں شیر دہاڑ رہا ہے۔

مجنّو۔ کیا یہ شیر کی آواز ہے؟ شیر کی آواز ایسی ہوتی ہے۔ ارے بھئی اب کیا ہوگا۔

حامد۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ کوئی ترکیب آپ ہی بتلایئے مرزا صاحب خدا کے لئے جلدی بتلایئے!

مجنّو۔ ارے بولو مت، وہ میری کارتوسوں کی پیٹی کہاں ہے [illegible]

حامد۔ بندوق تو آپ کے ہاتھ میں ہے اور پیٹی کمر سے لگی ہے مگر یہ آواز تو بالکل قریب ہوئی جا رہی ہے۔ اب کیا ہوگا۔

مجنّو۔ جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو، ارے رے۔ رے . . .

حامد۔ میرے اللہ! مرزا صاحب آپ اس قدر گھبرا رہے ہیں یہ تو مدد کرنے کا موقع ہے۔ اگر آپ کا یہ حال ہے تو پھر میرا خدا حافظ

مجنّو۔ نہیں گھبرا نہیں رہا ہوں اری کھل بھی جلدی کمبخت۔

حامد۔ ارے مرزا جی یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

مجنّو۔ پیٹی کھول رہا ہوں کمبخت کھلتی ہی نہیں،

حامد۔ مگر آپ تو کمربند کھول رہے ہیں اور یہ آواز تو اور بھی قریب ہوتی جا رہی ہے۔

مجنّو۔ ارے بھائی لو۔ یہ جلدی سے پیٹی کھول دو۔ میرے اللہ آج ان لونڈوں نے مروا دیا۔

حامد۔ لایئے میں پیٹی کھول دیتا ہوں۔ لیجئے یہ پیٹی کھل گئی ہے۔

مجنّو۔ ارے نکالو اس میں سے کارتوس،

حامد۔ لیجئے یہ کارتوس۔ مگر اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ مرزا جی جلدی کیجئے۔

مجنّو۔ لاؤ جلدی لاؤ۔ یا علی مدد۔ ارے میرے اللہ کس جگہ موت آئی ہے اگر معلوم ہوتا کہ آج بے موت ہی مارے جائینگے تو آتی دفعہ کوئی نصیحت ہی کر آتے۔ ننھے کو ہی بھر کر پیار کر لیتے۔ آخری بار بیگم سے مل لیتے اچھا بیگم و ننھے خدا حافظ اب تو آخرت ہی میں ملاقات ہوگی۔

حامد۔ مرزا جی، یہ آپ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں اور یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

مجنّو۔ بندوق میں کارتوس بھر رہا ہوں۔

حامد۔ مگر آپ تو الٹا کر کے نالی میں کارتوس ڈال رہے ہیں آپ تو مجھے نصیحت کر رہے تھے کہ اوسان خطا نہ ہوں خدارا جلدی کیجئے ورنہ میں بھاگتا ہوں۔

مجنّو۔ ارے رے ایسا مت کرنا۔ ذرا یہ بندوق سیدھی کر دو بھائی۔

حامد۔ لایئے۔ لیجئے۔

مجنّو۔ ارے میرے تو ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ یا اللہ آج تو ہی مدد گار ہے [illegible]

حامد۔ مرزا جی گھبرایئے نہیں، لیجئے پہلے میں فائر کرتا ہوں [illegible]

(فائر کرتا ہے) لیجئے مرزا صاحب اب آپ [illegible]

مرزاجی اچھلتے کودتے ہیں مرزاجی، مرزاجی اٹھئے اٹھئے لاحول ولا قوۃ
(منہ تکتا ہے) خالد خالد! ارے یار بس کرو یہ ہمارے تینوں بہادر بیٹ گئے۔

خالد۔ کیوں کیا ہوا؟

حامد۔ ارے یار یہ تو بالکل بیہوش ہوگیا ہے۔

خالد۔ کیا واقعی؟

حامد۔ اللہ کی قسم دیکھو تو۔ اب تم جلدی سے پانی لاؤ۔

خالد۔ پانی میرے پاس ہے تم اس کا منہ تو کھولو۔

حامد۔ ارے اس کے تو دانت بھنچ گئے ہیں لاؤ وہ تمہارا شکاری چاقو کہاں ہے
اس کمبخت کا منہ تو کھولیں۔ یار عجب آفت مول لی۔

خالد۔ مگر جس وقت یہ بڑھ بڑھ کر شیخیاں ہانکتا ہے اور میں لاجواب رہتا ہے اس وقت
اس کی باتیں سننے کے قابل ہوتی ہیں اور ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ پورا دل
کھار کر بٹھا دیا اور بہادری کا۔ عالم ہے۔

حامد۔ خیر اس وقت تو چھٹکارہ پاؤ اس مصیبت سے کمبخت بے دانت اس
زور سے بھینچے ہیں کہ کھلتے ہی نہیں، اوں، اوں، لو یار منہ تو کھل گیا
بڑی مشکل سے۔ لو اب ڈالو پانی۔

خالد۔ ارے اس کا تو پیشاب نکل گیا۔ یہی حال ہو گیا ہے۔

حامد۔ لاحول ولا، ہے نا آخر بہادر ہی۔ یہ بھی بہادری کی نشانی ہے

خالد۔ پانی کے چھینٹے دو کمبخت ہوش ہی نہیں آتا۔

مجو۔ ارے ارے میرے کارتوس نکال دو اور وہ گولی وہ بندوق، ارے جلدی کرو۔

حامد۔ واہ بھئی واہ مرزا صاحب آپ بھی خوب ہیں آج ابھی گھبرانے کی کوئی بات نہیں لو اٹھ بیٹھو۔

مجو۔ کیوں کیا ہوا؟

حامد۔ اچھا آپ کو معلوم ہی نہیں، آپ ہی کی گولی سے تو شیر زخمی ہوا۔

مجو۔ کیا واقعی؟ کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟

حامد۔ واللہ بالکل سچ کہتا ہوں بھئی کتنا سچا نشانہ ہے آپ کا۔

مجو۔ مگر یار یہ تو بتاؤ اب شیر کہاں ہے؟

حامد۔ ابھی وہ آپ کی گولی سے زخمی ہو کر بھاگ گیا ہے۔

مجو۔ کیا مرا نہیں؟

حامد۔ یہاں سے تو کراہتا ہوا بھاگ گیا مگر گھر جا کر ضرور مر جائیگا۔ زخم کاری لگا ہے۔

مجو۔ اچھا آج تو کمبخت نے مار ڈالا تھا مگر اللہ نے بال بال بچا دیا۔ آخر کری
گئے نا ہم جرأت؟

کلن۔ مگر مرزا صاحب آپ گر کیسے گئے تھے۔

مجو۔ ابھی جس وقت میں نے بندوق داغی ہے نا تو اس میں سارے کارتوس اکٹھے چل
گئے ادھر جھٹکا جو لگا تو میرا پاؤں گڑھے میں پڑ گیا اور میں گر گیا۔

خالد۔ اچھا، ہم سمجھے آپ ڈر گئے تھے۔

مجو۔ لاحول ولا کیا سمجھے تم؟ میں نے تو جنگلی ہاتھیوں سے مقابلہ کیا ہے چیتوں سے کشتی
لڑا ہوں ریچھوں سے مڈبھیڑ ہوئی ہے اور بھیڑیئے تو سیکڑوں مار ڈالے ہیں
میں نے اس وقت نہ ڈرا تو اب بھلا اس شیر کی آواز سے کیا ڈرتا تھا اور
نہ تو میں جانوں کوئی اتنا بڑا شیر بھی نہیں تھا۔

حامد۔ ابھی شیر کا بچہ سمجھیے۔ اتنا سا تھا۔ گیدڑ جتنا۔

مجو۔ تو بیچارا میری گولی کی تاب کیا لاتا میں تو جانوں اس کی قضا یہاں کھینچ لائی تھی۔

خالد۔ بالکل ٹھیک ہے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے۔

کلن۔ بھئی مرزاجی آج تو ہم بھی قائل ہو گئے کہ واقعی آپ تیس مار خاں ہیں۔

حامد۔ بھئی اب کافی دیر ہو گئی ہے اب واپس چلنا چاہیئے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے

مجو۔ کیوں تھوڑی دیر اور شکار کھیل لیں شاید کوئی اور چیتا وغیرہ ہاتھ لگ
جائے ورنہ ہرن تو ضرور ہی مل جائیگا۔ اب خالی ہاتھ جانا بھی تو مناسب
معلوم نہیں ہوتا۔ بہرحال اپنے نام کی بھی تو لاج رکھنا ہے۔

حامد۔ نہیں بھئی مرزاجی اب چل دینا چاہیئے۔ بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں
ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں پھر کوئی شیر نہ آ کودے۔

کلن۔ مگر مرزاجی یہ آپ کا پاجامہ خراب ہو گیا ہے ذرا اسے دھو لیجیئے۔

مجو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پاخانہ کی جگہ پر گر گئے تھے۔

حامد۔ خیر اب آپ اسے دھو لیجیئے پھر چلیں گے۔

مجو۔ ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو ورنہ جو دیکھے گا یہی کہیگا کہ ڈر کی وجہ
سے ایسا ہو گیا ہے۔

حامد۔ اسی لئے تو کہا کہ دھو ڈالئے اسے۔ وہ سامنے ہی پانی کا چشمہ ہے

مجو۔ اچھا تو آپ یہیں ٹھہریئے میں دھو کر ابھی آیا۔ (جاتا ہے)

حامد۔ ہاں، ہاں، ہم یہیں کھڑے ہیں آپ اطمینان سے جا کر دھوئیں
واہ رے تیس مار خاں۔ کیا شکار کھیلا ہے؟

(پردہ گرتا ہے)

انقلاب!

از جناب مولانا انعام اللہ خاں صاحب ناصر حسن پوری

برگشتگیِ بخت نے الٹی بساطِ عیش
اب لطفِ ہاؤ ہو نہ سرناو نوش ہے

گرنے لگے ہیں دیدۂ پرنم سے لختِ دل
جو پہلے باغباں تھا وہ اب گلفروش ہے

جس دل میں موج خیز تھا کل چشمۂ سرور
آج اس میں آتشِ غم و حسرت کا جوش ہے

یا کل یہ دیکھتے تھے کہ جوشِ نشاط سے
میخانہ در بغل نگہِ مے فروش ہے

مطرب نوا سے راہزنِ کاروانِ دل
ساقی ادا سے دشمنِ ایمان و ہوش ہے

چھائی ہے کائنات پہ مستی و بیخودی
عالم تمام میکدۂ بے خروش ہے

لالہ پیالہ گیر ہے نرگس کی آنکھ مست
راحت طلب شمیم ہے گل عیش کوش ہے

جب کوئی پوچھتا تھا حقیقت حیات کی
کہتے تھے ہم کہ حاصلِ مستی و جوش ہے

یا آج دیکھ دیکھ کے آنسو سرِ مژہ
کہتے ہیں اس کو نیش جہاں میں جو نوش ہے

اُس دل میں تھا جو مطلعِ انوارِ آرزو
اب ہر طرف سے یاس کی ظلمت کا جوش ہے

جو دل صفا میں روکشِ صبحِ بہار تھا
داغوں سے آج رشکِ کفِ گلفروش ہے

وہ سازِ دل کہ جس سے نکلتی تھی خود صدا
مضرابِ غم کی چھیڑ بھی سن کر خموش ہے

دلسوز ہو تو کون ہو صبحِ شبِ طرب
اوروں سے بے خبر ہے جسے اپنا ہوش ہے

"داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"

علمبردار حریت اتاترک

جناب سید ارشاد حسین صاحب ازہر بی۔ اے

آغوش مادر میں پہاڑیوں کے دامن میں پرانے قلعہ کی فصیلوں کے زیر سایہ ایک مختصر سی آبادی تھی جو سیلونیکا کے نام سے معروف تھی۔ اس غیر مشہور بستی کے ایک تنگ محلہ میں علی رضا اور زبیدہ کا بوسیدہ مکان تھا۔ شاخہائے انگور کی شاداب بیلوں نے سڑکوں پر جابجا سر محرابیں بنا رکھی تھیں لیکن فطرت کی اس نوازش نے اس مقام کے تاریک راستوں کو اور بھی تاریک بنا رکھا تھا۔ اسی سرسبز و شاداب مقام پر آغوش فطرت میں ترکی کا وہ پھول کھلا جس کے تبسم نے ملک کے گوشہ گوشہ کو نورانی شعاعوں سے منور بنا دیا جس کی مہک سے عالم اسلام کا چپہ چپہ ارض حرم بن گیا۔ اقوام عالم کی نگاہیں اس جنگل کے اُگے ہوئے پھول پر ادب سے پڑنے لگیں اور وہ گل نودمیدہ ہر ایک بے بس قوم کا مرکز توجہ بن گیا۔

زبیدہ اپنی عمر کی مسرت بھری منزل میں تھی کہ خدا نے اس کی گود کو گل مراد سے پُر کر دیا۔ علی رضا نے اپنے اس میوۂ نورس کا نام رسول کی کسی بزرگ ہستی کی طرف منسوب کرتے ہوئے مصطفےٰ رکھا۔ علی رضا ترکی دفاتر میں قلیل تنخواہ پر ملازم تھا اور فرصت کے اوقات میں تجارت سے مدد لے کر اپنی آمدنی میں اضافہ کر لیتا تھا۔ زبیدہ زیور تعلیم سے بے بہرہ تھی لیکن اس ریشمی زلفوں اور نیلگوں آنکھوں والی ماں [illegible] تھا۔ قد بالا جسم توانا۔ ذہن رسا رکھنے والی مذہب کی پابند [illegible] انداز سے امور خانہ داری میں مصروف رہتی۔ ایک اور لڑکا موت کی نیند زمین کے گہوارے میں سو رہا تھا۔ صرف ایک بیٹی مقبولہ ان کی سونی زندگی میں امنگیں پیدا کرنے کے لئے تھی۔ مصطفےٰ پیدا ہوتے ہی والدین کی محبت کا مرکز ہو گیا۔ ایسی حالت میں مادری محبت نے مصطفےٰ کو رہا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن جو ہستیاں چمکنے والی ہوتی ہیں ان پر ماحول کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مصطفےٰ خاموش و کم سخن لڑکا تھا۔ اس نے والدین کی محبت کی ان لطف نوازیوں سے قطعی اثر نہ لیا۔ ماں کے احکام کی خلاف ورزی اسے زیادہ پُرلطف معلوم ہونے لگی۔ اور مزاج خود پسند و خود رائے ہو گیا۔ کسی کی گھڑکیاں برداشت نہ ہو سکتی تھیں رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا کہ علی رضا نے ملازمت سے استعفا دے کر لکڑیوں کی [illegible] خارج میں ہاتھ بٹانے لگا۔ [illegible] ادھر شروع کیا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے ایک مسجد سے متعلق مکتب میں داخل کرا دیا گیا۔ اور چند سال بعد شمسی آفندی سے درس لینے لگا۔

بچپن کے حالات یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا دفعتاً علی رضا کے انتقال نے اس مختصر خاندان کو ورطۂ تباہی میں ڈال دیا۔ زبیدہ اپنے بھائی کے یہاں چلی گئی۔ مصطفےٰ نے زراعت شروع کی۔ اس محنت شاقہ نے لڑکے کو زیادہ تندرست اور قوی کر دیا مضبوط بنا دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ زیادہ سنجیدہ اور خود مختار ہو گیا۔ دو سال بعد مصطفےٰ گیارہ سال کا ہو گیا اور اس کی خالہ نے [illegible] کر دیا [illegible] ان عادتوں نے مدرس کا حکومہ [illegible] مدرس سے درست [illegible] اور اسکول کی زندگی کو خیرباد کہہ دیا [illegible] مدرس نے لڑکے کو [illegible] میں داخل کرنے کا مشورہ دیا۔ ہر چند زبیدہ کچھ ڈر رہی تھی۔ لیکن مصطفےٰ خود اپنے والد کے ایک پرانے دوست کی وساطت سے فوجی مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں اسے اپنے مزاج کے

موافق فضا ملی۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ ہر ایک کی نگاہ اس پر پڑتی رہے چنانچہ اس نے وہی طریقے اختیار کیے جو اسے دوسروں سے ممتاز کردیں ہی فوجی مدرسہ میں ایک شخص کیپٹن مصطفےٰ نامی تھا۔ اس نے لیے ہم نام نوجوان کا نام اپنے سے ممیز کرنے کے خیال سے کمال رکھدیا۔ اس دن سے رسیدہ کا چشم و چراغ یونانیوں مصطفےٰ کمال کے نام سے آسمان عروج پر آفتاب کی طرح بلند ہوتا رہا۔ سترہ سال کی عمر میں مصطفےٰ کمال جوانی کی رومانیت سے لب آشنا اسکول سے کامیاب ہوکر اعلیٰ فوجی تعلیم کے لئے مقام مناستر سے ترکی مقدونیہ بھیجدیا گیا۔ یہاں ماحول بالکل فوجی تھا۔ ہر طرف سپاہیوں کی متحرک دیواریں ہر جانب توپ و تفنگ دولت عثمانیہ سسکیاں لے رہی تھی۔ یونانیوں نے جزیرۂ کریٹ (Crete) پر قبضہ کرلیا تھا۔ ترک سلطان عبدالحمید سے خوش نہ تھے۔ ان کے بہترین نفوس قید کی سختیاں جھیل رہے تھے۔ ہر طرف بدامنی مناستر کے گلی کوچوں میں رونما تھی۔ مصطفےٰ کمال نے ان تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا۔ نتھی بے سے فرانسیسی زبان میں مہارت حاصل کی اور بعد ازاں فرانسیسی انقلاب پسند جماعت کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ والٹیر اور روسو کے خیالات جذب کئے۔ ان کتب کا مطالعہ ممنوع تھا لیکن اس دلیر کو ایسے ہی خطرے پیدا کرنے میں لطف آتا تھا۔ اس نے تقریر کرنے کا مادہ پیدا کیا اور ترکی خون کو اپنے دیکھتے ہوئے انگاروں سے گرمانا شروع کیا۔ "ترکی ترکوں کے لئے" کی آواز بلند کی اور اسی خیال میں سرمست ترقی کرتا ہوا حربیہ کالج میں داخل ہوکر قسطنطنیہ چلا گیا۔ اب اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ عین شباب جسم توانا۔ خون گرم۔ جوانی کی لغزشوں نے اپنی طرف کھینچنا چاہا لیکن محسوس کرنے والا مزاج فانی محبت کا محکوم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں صنف نازک کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ دفعتاً جذبۂ وطن پرستی نے خدمت وطن کی طرف کھینچا۔ اگر زندگی رہنے کے قابل ہے تو صرف آزادی کی زندگی ورنہ غلامی کی زندگی سے موت بہتر ہے اور آزادی ہی کی حیات کے لئے سرچشمۂ حیات جاوید ہے۔ اس کا ایک مقولہ ترکی ترکوں کے لئے ہے۔ اس کی رگ رگ میں خون دوڑ رہا تھا۔ ہمت مردانہ نے مصطفےٰ کمال کی ہر نقل و حرکت کو کامیابی کا سہرا پہنا دیا۔

مصطفےٰ کیپٹن۔ قید اور آزادی

۱۹۰۵ء میں وہ کالج سے کپتان ہوکر باہر آیا۔ لیکن اس کی نظر فوجی اور ملکی دونوں معاملات پر یکساں پڑ رہی تھی۔ اس نے اسکول و کالج کے ہر طالب علم بلکہ افسران کو بھی انقلاب پسندی کے جذبات سے متاثر پایا۔ خود کالج میں "وطن" کے نام سے ایک سوسائٹی قائم تھی جس کا نصب العین پرانی حکومت کو تبدیل کرکے بہتر حکومت قائم کرانا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے اس انجمن کو فروغ دیا۔ رفتہ رفتہ سلطان عبدالحمید کو اطلاع ہوگئی۔ حکومت نے انجمن کو جبراً شکست کرادیا لیکن جو جذبات ابھر چکے تھے وہ دب نہ سکے۔ اب اس کے ممبر خفیہ سازشوں میں شریک ہونے لگے۔ زبیدہ نے عرصہ ہوا ایک سوداگر سے دوسری شادی کرلی تھی اس لئے مصطفےٰ کمال اس قابل تھے کہ "وطن" کی مالی امداد کرکے سنبھال لیں۔ انھوں نے ایک کرایہ کے کمرے میں اسی نام سے خفیہ ایک انجمن قائم رکھی اور ممبروں کی نشستیں بدستور ہوتی رہیں۔ پولیس ان کی جویا تھی۔ ایک دن جب وطن پرستوں کی یہ جماعت ایک نئے ممبر سے حلف وفاداری لے رہی تھی۔ پولیس نے سب کو گرفتار کرلیا۔ مصطفےٰ کمال بھی قید کرکے استنبول بھیجدیئے گئے۔

حریت کا علمبردار آج قیدخانہ میں تھا لیکن روح آزاد تھی۔ اسے قید تنہائی کی سزا دی گئی لیکن خیالات و جذبات کے ہجوم میں مصطفےٰ کمال تنہا نہ تھے۔ بالآخر سلطان کے وزرا نے اس جوشیلے نوجوان کو اصلاح کا ایک موقع دیا اور یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ ایسے دل گردے والے سپاہی کو محبوس کرکے اس کی قوتوں کو زائل کرنے کے بجائے دمشق کے بلوائیوں کی روک تھام کا کام لیا جائے۔ چنانچہ قیدخانہ سے نکال کر مصطفےٰ کمال کو جہاز پر سوار کردیا گیا۔ جہاز بیروت میں لنگر انداز ہوا اور مصطفےٰ کے فوجی کارنامے شروع ہوئے۔ یہ پہاڑی قوم کبھی بالمقابل نبرد آزما نہیں ہوتی تھی اسلئے کوئی نمایاں معرکہ آرائی نہ ہوئی لیکن مصطفےٰ کمال کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا اور معمولی لڑائیوں کے بعد یہ رجمنٹ دمشق میں قیام پذیر ہوگیا۔

مصطفےٰ انقلاب انگیز

مصطفےٰ کمال طبعاً انقلاب پسند تھے۔ درحقیقت انقلابی کی

کم واقف تھا۔ علی آنکھوں نے الگ نمازی کی اور وہ عرب نہ سمجھ سکے
گرفتاری کے احکام جاری تھے لیکن تائید غیبی شامل حال ہوگئی۔ مصری
افسر ترکوں سے ہمدردی رکھتا تھا اس نے ایک دوسرے نیلگوں
چشم مسافر کو گرفتار کرلیا اور مصطفےٰ کمال کو جانے دیا۔ غازی عین المنصور
پہنچ گئے۔ یہاں انور بے موجود تھے۔ ہر طرف جہاد کی آواز گونج رہی تھی
اور انور بے کے علم کے نیچے ہزارہا جانفروش ہتھیلی پر سر لئے موجود تھے
لیکن افسروں کی قلت تھی اس لئے مصطفےٰ کمال کا پرجوش خیر مقدم ہوا
انور بے مصطفےٰ کمال سے عمر میں ایک سال چھوٹے تھے لیکن عہدہ کے
اعتبار سے بلند۔ دونوں خود پسند و خود رائے۔ سخت مزاج و سخت
گیر۔ نڈر اور بہادر تھے لیکن اس کے علاوہ دونوں میں زمین و آسمان کا
فرق تھا۔ انور بے کی نگاہ دوررس۔ مصطفےٰ کمال کی نظر جنہ درس۔ انور
لعمیل مزاج مصطفےٰ خاموش و پرفکر۔ انور بے بلند پرواز مصطفےٰ کمال کی
تحمل یا مند حدود۔ انور بے مسلمانوں کے نام پر مٹنے والا۔ مصطفےٰ کمال اپنے
وطن پر جان دینے والا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں اختلافات رونما ہوگئے
کسی طرح دونوں ح ہم آہنگ نہ ہوسکے۔ جنگ ہوتی رہی یہاں
تک کہ دفعتاً خود ترکی پر اکتوبر ۱۹۱۲ء میں مانٹی نیگرو نے حملہ کردیا اور خطرہ
دیکھ کر اٹالیہ سے صلح کرلی گئی۔

مصطفےٰ کمال لفٹنٹ کرنل

مصطفےٰ کمال وطن واپس ہوئے تو
حالت نازک پائی۔ ترکوں کو شکست ہو رہی تھی۔ اس کا وطن سیلونیکا
یونانیوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ اور پچیس ہزار ترک قید کی سختیاں جھیل
رہے تھے۔ بلغاریہ نے قسطنطنیہ کے دروازے پر اپنا جھنڈا گاڑ رکھا تھا
اور اس دارالسلطنت سے صرف پندرہ میل کے فاصلہ پر بمقام شتلجہ مستند
ئی تھے۔ یورپ کے لعنتہ سے ترکی کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ صرف
ف نے حمدیہ جہاز کے ذریعہ سے جادوگروں کی طرح چالاکیاں کر رہے
کس انفرادی کوششیں بے سود ہو رہی تھیں۔ قسطنطنیہ جنگ
زخمیوں کا ہسپتال ہو رہا تھا۔ ہر جانب وبائی بیماریوں کا زور۔ غلہ
ن اور کمیاب۔ اس پریشانی میں مصطفےٰ کمال نے اپنی ماں کی خبر لی
معلوم ہوا کہ وہ متعلقوں کے ساتھ محفوظ مقام پر ہے لیکن پیرانہ سالی اپنا اثر
دکھا رہی ہے۔ شصت سالہ عمر لعبارت لئے جارہی ہے۔ کی قسطنط
پہنچا کر دفتر جنگ میں حاضری دی اور فوراً گیلی پالی جانے کا حکم مل گ
انور بے بھی واپس آچکے تھے انھوں نے عنان جنگ اپنے ہاتھوں
میں لے لی اور محاذ قائم کیا حسب معمول مصطفےٰ کمال پھر ان کی اسکیم
سے متفق نہ ہوسکے لیکن انور بے افسر اعلیٰ تھے۔ اور مصطفےٰ ماتحت
اسکیم پر عمل ہوا اگر ناکامیابی ہوئی۔ ہزیمت خوردہ ترکی ابھی اپنے زخموں
کی دیکھ بھال کر رہا تھا کہ لقدیر نے ساتھ دیا۔ فاتح اقوام آپس میں لڑنے
لگیں۔ انور بے نے یہ حال دیکھ کر حملہ کردیا۔ اور اڈریانوپل پر قبضہ کرلیا
مصطفےٰ کمال اس جنگ میں شریک تھے۔ کامیابی نے لفٹنٹ کرنل کا
رتبہ غازی کو عنایت کیا۔

اس فتح نے انور بے کی بنیادیں زیادہ مضبوط کردیں۔ انھوں
نے ایک جرمن افسر سینڈرس نامی کو فوجی تنظیم کے لئے ملازم رکھا۔ مصطفےٰ
کمال نے پھر اختلاف کیا۔ انور بے نے باربار کی مخالفت کو پسند نہ کیا۔
اور ترکی سفارت سے متعلق کرکے فرانس بھیج دیا۔ یہاں مصطفےٰ کمال
نے رقص کرنا سیکھا۔ مغربی کمزوریاں جاری پاتا تھا۔ گ جب اطمینان
کہ دنیا کے گوشہ گوشہ پر "جنگ عظیم" کی گھٹا ٹوپ گھٹائیں چھانے لگیں
مصطفےٰ کمال نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے صلاح دی کہ ترکی اس
جنگ سے الگ رہے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا
باوجود اختلاف کے غازی کو ملک کے ساتھ رہنا اور جنگ میں حصہ لینا
پڑا۔ جرمن افسر سینڈرس کے ساتھ برطانیہ کے مقابلہ کے لئے گیلی پالی
بھیج دیئے گئے۔ سینڈرس مردم شناس تھا۔ اس نے جانباز سپاہی
اور نکتہ رس افسر کو پرکھ لیا۔ گیلی پالی میں سینڈرس کا کام نہایت دشوار
تھا۔ باون میل کا طویل ساحل اور برطانیہ کا مشہور آفاق بیڑہ۔ ہر مقام
پر حملہ ہوسکتا تھا۔ ہر چند سینڈرس کے پاس اسی ہزار فوج تھی لیکن۔
باون میل کی پہاڑیوں اور وادیوں کے دامن کا انتظام آسان نہ تھا
سینڈرس نے بیس بیس ہزار کے چار رجمنٹ تیار رکھے۔ اور ایک مصطفےٰ
کمال کی ماتحتی میں دے دیا۔ لیکن انور بے کے حکم نے سینڈرس کو مجبور
کیا کہ وہ مصطفےٰ کو وہاں سے ہٹا کر بمقام میڈاس بھیج دے۔ مصطفےٰ کمال
کو بحد شاق ہوا لیکن فرض شناسی اور وطن پرستی کے جذبات نے

…نک وقت میں ثابت قدم رکھا۔ مصطفےٰ نے اسی کو قومی خدمت …یہ سمجھ لیا۔

…مصطفےٰ کمال شیر جنگاہ

۲۵ اپریل کی صبح کو کہر کے پردوں کی آڑ میں برطانوی …چلا اور بلیئر (Bulair) کے شمال میں نظر آیا۔ دراصل …جھکا تھا اور سینڈرس اس فریب میں آگیا۔ برطانوی افسروں نے …لیں حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور سخت ترین حملہ کا رخ مٹلس کی …ب تھا۔ سینڈرس نے دھوکا کھا کر اپنی قوت مقام بلیر کی طرف بھیجدی …کی سہانی فضا میں ایک دن مصطفےٰ کمال پریڈ کر رہا تھا چند ترکوں …نے اطلاع دی کہ انگریزوں نے حملہ کر دیا ہے۔ معاملہ کی اہمیت سے …ری کے دماغ کو سریع الفہم بنا دیا وقت کم تھا۔ احکام کا انتظار …رہوتا۔ کام ذمہ داری کا تھا۔ آدمی کم تھے خطرہ کثیر۔ لیکن غازی کو …ین تھا کہ خاص حملہ کا مقام یہی ہے۔ سینڈرس کی غلط فہمی پر مسکرایا …صرف دو سو آدمی لیکر اس برطانوی آہنی دیوار کے مقابلہ کے لئے …نک پر روانہ ہو گیا۔ پہاڑی پر پہنچکر قرار لیا۔ پہلی توپ کا دہانہ …سٹریلیوں کی طرف اپنے ہاتھوں سے کیا اور صرف اپنی ذاتی ذمہ …داری پر فیر کا حکم دے دیا۔ نزاکت وقت میں جری کی ہمت اور …بھی بلند تھی۔ دو دن رات اپنی خاص نگرانی میں پے در پے حملے کئے اور اسلام کے ابتدائی زمانہ کی جنگوں کا نقشہ دکھا دیا۔ انگریز متعجب تھے کہ یہ مدافعت کیونکر ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گو مصطفےٰ کمال اس ٹڈی دل فوج کو پسپا کر کے ساحل سمندر تک نہ پہنچا سکے تاہم مٹھی بھر آدمیوں نے ہزاروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ کاش چند سپاہی اور ہوتے کامل فتح مصطفےٰ غازی کے ہاتھ میں ہوتی مگر پھر بھی یہ کام اسی جری کا تھا کہ ایک تنکے سے سیلاب کو روک دیا۔ غازی کی ہمت بلند تھی وہ اپنے ملک کی خدمت کر رہا تھا۔ اور کسی کے حکم کا محتاج نہ تھا۔ شکست یا فتح اس کا ملک اس کا فیصلہ کرتا۔ وہ جانتا تھا وہ کیا کر رہا ہے۔ اس مقام پر ترکوں کا ہار جانا درہ دانیال اور وہاں سے قسطنطنیہ کا راستہ انگریزوں کے لئے کھول دینا ہے اور ترکی کو انگریزوں کے قدموں پر بےجان ڈال دینا ہے …ت آشنائی ہو چکی۔ دونوں ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگا چکے

دونوں نے خندق کھود کر اپنے اپنے کو محفوظ کر کے موقع کا انتظار کرنا شروع کیا۔ انگریزوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ صرف دو سو ترک ان کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ باہر نکل کر حملہ آور ہو۔ آفتاب نے آگ برسائی۔ پانی کمیاب ہو گیا لیکن جنگی سورما ثابت قدم رہے۔ مصطفےٰ کمال نے متواتر کسی وقت آنکھ نہ جھپکائی۔ نیند سے ہمکنار نہ ہوا۔ جنگاہ میں سپاہی کے جوہر نکھرے۔ آج یہ دوسرا مصطفےٰ کمال تھا۔ ہر ماتحت سے نرمی کے ساتھ پیش آیا۔ ہر سپاہی کی دلجوئی اور دلجمعی کی۔ ہر ایک کو ہمت دلائی جوش بڑھایا۔ معمولی سپاہیوں کے ساتھ حملوں میں شرکت کی اور ہمت نہ ہارنے دی۔ مارا مار۔ وہ گولیوں کی زد میں آجاتا۔ لیکن پروانہ کی۔ دائیں بائیں سپاہی گولیوں کے نشانہ ہو رہے تھے لیکن غازی کے پاس سے گولیاں جانے ادب تلاش کرتی ہوئی نکل جاتی تھیں۔ ایک وقت خندق سے باہر بیٹھا ہوا غور کر رہا تھا۔ توپوں نے غازی کو اپنی زد میں لے لیا۔ پاؤں کے پاس گولیاں برسنے لگیں۔ ایک افسر نے کہا پناہ لے لیجئے لیکن غازی نے مسکرا کر کہا کہ خطرہ کے وقت ساتھیوں کو چھوڑ کر پناہ نہیں لے سکتا۔ دوسروں کے لئے بری مثال نہ قائم کروں گا۔ سگرٹ جلایا اور اطمینان نفس کے ساتھ پینے لگا۔ ایسے افسر کی ماتحتی میں بزدل سے بزدل سپاہی جوانمرد بن گیا۔ اس دل گردے والے جاں نثار کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں عزت پیدا ہو گئی۔ جوش بڑھ گیا۔ مشہور ہو گیا کہ غازی کو گولیاں چھو نہیں سکتیں۔ آج غازی بالکل نڈر تھا۔ بے خوف تھا۔ خود اسے بھی یقین تھا کہ گولیاں اس کے پاس نہیں آسکتیں۔ نہایت خطرہ کے مقام پر بھی سست رفتار ہو جاتا تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ خطرہ سے ڈر کر بھاگ رہا ہے اور بزدلی کی مثال قائم ہو جائے۔

مصطفےٰ کمال حاکم قلوب

غرض ہر دو فریق ہر مسلک خندقوں میں پناہ گزین رہے۔ اگست کا مہینہ آگیا ۶ اگست کی تاریک رات میں انگریزوں نے سولہ ہزار آدمی خفیہ طریقہ سے اور اتار دیئے۔ آسٹریلیوں کے دل بڑھے اور پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ غازی نے صرف بیس آدمیوں سے مقاومت کی اور اس زور کی گولہ باری کی کہ انگریز ورطہ حیرت میں پڑ گئے۔ ان کو خیال ہوا کوئی بڑی فوج مقابلہ کر رہی ہے۔ اب غازی

کے پاس بھی کچھ اور فوج اکٹھی ہوگئی اور گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی حملہ سخت تھا۔ جنگ مہیب تھی۔ خود مصطفےٰ کمال کی خندق پر حملہ ہونے لگا۔ قریب تھا کہ ترکوں کے پاؤں اکھڑ جائیں لیکن مصطفےٰ کمال کی شخصیت نے ہر ایک کے پاؤں گاڑ دیئے۔ ہر ایک سپاہی کو آہنی دیوار بنا دیا۔ قوت و استقامت کا پہاڑ جس مقام پر موجود ہو وہاں بزدلی کا گذر نہیں۔ ترک جمے رہے اور انگریز آگے نہ بڑھ سکے۔ مصطفےٰ کمال کی جوانمردیوں اور سپاہیوں کی معرکہ آرائیوں کو دیکھ کر افسر اعلیٰ سینڈرس نے بھی خطرہ ظاہر کیا اور اپنی تمام فوج مصطفےٰ کمال کی ماتحتی میں دیدیا اور نئی کمک کا منتظر رہا۔ مصطفےٰ کو سوال پوچھنے کی ضرورت نہ تھی اسے فرائض کا احساس تھا۔ اس نے خاموشی سے چارج لے لیا اور ترتیب و تنظیم میں گھس پڑا۔ تقدیر غازی کے ساتھ تھی۔ کمانڈ ملتے ہی نئی فوج بھی آگئی۔ اور حسن اتفاق سے انگریزی افسر سر ہیملٹن اور غازی مصطفےٰ کمال نے بیک وقت حملہ کا حکم دیا دونوں فوجیں بالمقابل سخت معرکہ ہوا۔ انگریز پھر جہاں کے تہاں رہ گئے اور ایک انچ بھی نہ بڑھ سکے تک پیر پر ترکوں کو کامیابی ہو رہی تھی لیکن جنگی محاذ ابھی زیر و زبر ہو رہا تھا اور ترکوں کے دل چھوٹے ہو رہے تھے۔ جنگ پیر سے بھی اطلاع آئی کہ قریب ہے ترکوں کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ مصطفےٰ کمال نے جنگی پیر دیکھنے کی ضرورت محسوس کی صرف چوبیس گھنٹے کی اجازت لی اور آٹھ کے شب کے وقت جنگ پیر پہنچ گیا۔ معائنہ کیا فی الواقعی حالت سقیم تھی لیکن اس کی موجودگی نے مردہ دلوں میں جان ڈال دی۔ غنیم نے دو مرتبہ مصطفےٰ کمال کو گولیوں کی زد میں لے لیا۔ رفقا نے پناہ لینے کی التجا کی لیکن شیر دل نے ایک نہ سنی۔ ہمت اور بلند ہوئی۔ خود غنیم کی افواج کے پاس پہنچ کر صورت حال کا عینی مشاہدہ کیا اور بہ حالت اطمینان کی قطار سے واپس ہوا۔ جسمانی حفاظت سے لاپروائی برتنے نے شکستہ دل ترکوں کو مجتمع کر دیا۔ ساری رات غازی نے سب کو ہمت دلائی ہر ایک سپاہی سے مذاق کرتا ہنستا ٹہلتا رہا۔ جنگ کا محاذ تھا خطرہ ہنگام تھا۔ اس لئے غازی مسرور تھا۔

"وطن کے سپوتو۔ جانفروشی کا وقت ہے۔ ملک کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ عجلت نہ کرنا۔ میرے منتظر رہنا۔ میں مناسب وقت دیکھ کر نکلوں گا۔ میرے ہاتھ اٹھنے کا انتظار کرنا۔ ہاتھ اٹھتے ہی تیز و خونخوار سنگینیں بندوقوں پر ہوں اور ایک دل ہو کر حملہ کر دینا۔"

اعجاز کمال پاشا

مصطفےٰ کمال کی تقریر نے شریف مزاج ترکوں کے جذبات کو ابھار دیا۔ ہر ایک سرشار ہو کر جھومنے لگا۔ ایسے جوانمرد افسر کے ساتھ آگ میں بھی کود سکتے تھے۔ صبح کا ستارہ چمکنے کو تھا۔ تین بجے۔ غازی خندق سے نکلا آگے بڑھا۔ انگریزوں نے گولیوں پر رکھ لیا۔ ایک گولی گھڑی پر آکر لگی اور اسے چکنا چور کر دیا۔ اگر خدانخواستہ یہی گولی کہیں اور لگی ہوتی تو تاریخ جنگ کسی اور نوعیت سے لکھی جاتی۔ ترک ہمت ہار جاتے لیکن مصطفےٰ کمال کی سرکردگی میں بات ہی اور تھی۔ دفعتاً گولیوں کی بارش ذرا کم ہوئی پہلا جوانمرد ترکی کمانڈر ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ سپاہیوں نے دیکھا ہاتھ آہستہ آہستہ بلند ہوا۔ غازی آگے بڑھا۔ اور ایک جنگی نعرے کے ساتھ ترکوں نے حملہ کر دیا۔ آہنی لہر چلی اور انگریزوں کی صفوں کو توڑ دیا۔ وہ بحری موج روانہ ہوئی اور دشمن کو بہا دیا۔ جنگ پیر خطرہ سے پاک ہو گیا۔ یہ اسی غازی کی شخصیت تھی جس نے انگریزوں کو یہ روز بد دکھایا۔ بالآخر دسمبر ۱۹۱۵ء میں برطانیہ نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ اور غازی بھی قسطنطنیہ پلٹ آئے۔ اخبارات نے دھوم مچا دی غازی پر ہر فرد کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ آج وہ ممدوح جہاں تھا اور پاشا کا خطاب پا چکا تھا۔

غازی باغی

انور بے ڈکٹیٹر ہو رہے تھے۔ ہر طرف جرمنی اقتدار ظاہر تھا مصطفےٰ کمال کا خون ترکی کی اس غلامی پر کھول رہا تھا۔ انور بے کے خلاف سازشیں ہونے لگیں لیکن جنگ اسی طرح جاری تھی۔ ہندی فوج بغداد فتح کر چکی تھی موصل جانے کی تیاریاں تھیں۔ فلسطین و شام پر حملہ ہونے والا تھا۔ کرنل لارنس نے امیر فیصل کو غدار بنا لیا تھا۔ غازی بیمار تھا لیکن شام پہنچا۔ جسم نحیف و ناتواں لیکن ارادہ کی مضبوطی اور طبع کی استواری نے جسمانی کمزوری پر فتح پائی، ۱۸ ستمبر کو ایک ہندوستانی سپاہی نے اطلاع دی کہ پرسوں انگریزی حملہ ہوگا تیار رہیئے۔ کسی نے کہا ہندی ناقابل اعتبار ہے۔ لیکن غازی شناس فطرت تھے۔ نگاہیں پہچانتے تھے۔ بہ شکل اچھے [illegible]

قسیشا اور فوج کو ترتیب دیا۔ اطلاع صحیح نکلی ۱۹ ستمبر کو حملہ ہوا اور خونریز جنگ ہوئی۔ مصطفےٰ کمال لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے۔ پانچویں دن ہزیمت خوردہ ترکی فوج تتر بتر ہو چکی تھی۔ دریا پار کیا اور سب سے آخر میں خود دریا میں قدم رکھا۔ ہوائی جہازوں نے آسمان سے آگ برسائی۔ کرنل لارنس و امیر فیصل نے سامنے سے حملہ کر دیا۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ کرنل لارنس نے اپنا دام تزویر غازی پر بھی ڈالنا چاہا لیکن غازی کی غیرت نے گوارا نہ کیا وہ سپاہی تھا اور بات اور تلوار کا دھنی تھا۔ ملک فروشی ممکن نہ تھی پیغام کو ٹھکرا دیا لیکن حکومت نے خود صلح کر لی۔ قسطنطنیہ میں صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔ جرمن افسر واپس بھیج دیے گئے۔ ترکی ہزیمت خوردہ ملک تھا لیکن کمال پاشا اب بھی شکست ماننے کو تیار نہ تھے۔ شرائط صلح نامہ کی رو سے انگریزوں نے الگزنڈرا پر قبضہ کرنا چاہا لیکن غازی سد راہ ہوا۔ وزیر اعظم عزت پاشا کو تار دیا کہ قدموں پر ناک رگڑنے سے مرجانا بہتر ہے اور فوج تیار کرنے لگا۔ انور طلعت جمال بھاگ چکے تھے۔ تنہا اسی غازی نے عزم کر لیا کہ انگریزوں کو ترکی میں قدم نہ رکھنے دے گا۔ باسفورس میں جیک لہرا رہا تھا۔ قسطنطنیہ اتحادیوں کا تھا۔ اسمرنا پر فرانسیسی قابض تھے۔ دولت عثمانیہ کی دھجیاں اڑ چکی تھیں۔ مصر شام فلسطین عرب سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ خود ترکی دشمنوں کے فولادی پنجے میں تھا لیکن غازی نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ترکی کو فنا ہونے دیگا غیر کی امداد کا خیال بھی فضول ہے خود ترکی کو اٹھنا چاہئے۔ آج باوجود ضعف و اضمحلال کے غازی کی آواز میں زور تھا۔ ترکوں کی نگاہیں گیلی پالی کے ہیرو کی طرف اٹھیں فوج جمع ہونے لگی۔ انگریزوں کے پاس خطرناک افراد کی فہرست میں مصطفےٰ کمال کا نام جلی حروف سے لکھا تھا۔ ہر دم گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ لیکن غازی کو دوستوں نے بچا لیا وزیر اعظم داماد فرید پاشا نے دوستی ضمانت کی اور اناطولیہ کا حاکم بنا کر بھیج دیا لیکن اسکا ہمراز عارف یا وہ خود ہی واقف تھا کہ برطانوی اور فرانسیسی چالوں کی وجہ سے اس کے دل پر کیسے سانپ لوٹتے ہیں ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو سدنگاہ صمصم پر جہاز لنگر انداز ہوا۔ یہ مقام انگریزی جاسوسوں کا مرکز تھا ایک غازی نے کچھ پروا نہ کی۔ انگریزوں کے خلاف ملک کا دورہ کر کے آگ برسائی جذبات حریت ابھارے۔ حب الوطنی کے جوش کو گرمایا

دفعتاً خبر آئی کہ آرمینیوں نے ارزروم پر قبضہ کر لیا ہے یونانیوں نے سمرنا لے لیا اور بے شمار ترکوں کو تہ تیغ کر دیا۔ آگ شعلہ زن ہو گئی۔ نفرت کی چنگاریاں بلند ہوئیں۔ مصطفےٰ کمال نے اپنی جانب سے حکم دے دیا کہ ہتھیار نہ ڈالے جائیں۔ فاتح برطانیہ نے سلطان سے شکایت کی۔ سلطان نے غازی کو بلایا لیکن غازی نے اعتنا نہ کی اور کہلا دیا۔

"میں یہیں رہوں گا جب تک میرا وطن آزاد نہ ہو جائے"۔

آج غازی مصطفےٰ کمال باغی تھا اور جنگ ہیرو اور میدانِ اس کے فاتح کے لئے گرفتاری کا وارنٹ تھا .....

صدر حکومت انگورہ غازی

ملک کانگریس کی تنظیم میں مصروف ہے۔ ڈیلیگیٹس کی آمد ہے۔ غازی بھی ارزروم کی طرف سے نمائندہ ہے کانگرس مجتمع ہوئی۔ حکومت کو ایسا اجماع خطرناک معلوم ہوا۔ کل افراد کی گرفتاری کے لئے فوج بھیجی گئی۔ کانگرس کے افراد نے مدافعت کی یہاں تک کہ فوج خود شکست کھا گئی۔ مصطفےٰ کمال کانگرس کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر منتخب ہو گئے۔ غازی نے اپنا صدر دفتر انگورہ میں قائم کیا جنوری ۱۹۲۰ء میں نئی حکومت کی بنیاد ڈال دی اور بحیثیت صدر صلح نامہ پر دستخط نہ کئے۔ غازی حکومت کا باغی تھا لیکن صدر جمہوریہ تھا۔ درد گردہ تکلیف دے رہا تھا۔ ہر طرف خراب تھی۔ صحت جواب دے رہی تھی۔ موت ہر لحظہ سامنے تھی۔ لیکن بستر پر موت کا آنا سپاہی کے لئے زیبا نہ تھا۔ وطن کشی غازی کے لئے موت سے زیادہ جانکاہ تھی۔ حکومت کا باغی ملک کا خادم زراعتی کالج کے ایک کمرے میں خالدہ ادیب کے ساتھ قوم کی خدمت کر رہا تھا۔ وہ اپنی ہر سانس قوم کے ہاتھ فروخت کر چکا تھا۔ زراعتی کالج ایک طرح سے اس کا مدرسہ تھا۔ ادیب خانم نے پستول چلانا سیکھا اس کا نشوہر ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ غرض ان میں سے ہر ایک موت سے کھیل رہا تھا۔ خالدہ زور تحریر و تقریر سے لوگوں کو ابھارا۔ بستر اپنے کمرے میں بھی گرجتا رہا۔ قوم کو "فتح یا موت" کا پیغام دیا اور ترکوں کو بیدار کیا۔ سلطان کی افواج کو الگ شکست دی۔ اٹلی کو الگ زیر کیا یونانیوں کو ہزیمت دی۔ انگریزوں کو پسپا کیا۔ مصطفےٰ کمال کا نام زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ اب وہ صدر جمہوریہ ترکی تھا اور اسی حیثیت سے

فرانس کو لکھ بھیجا۔

"جب تک ملک دشمنوں کے ہاتھ میں ہے اور سلطان غیروں کے قبضہ میں ہے یہ مجلس ملی ترکوں کی تقدیر کا فیصلہ کرے گی اور یہی جماعت قوم کی ضامن ہے۔ قوم خود اپنی حاکم ہے۔ اور میں قوم کا ترجمان ہوں۔"

وہ اکثر کہا کرتا کہ مجھے برطانیہ کو سبق دینا ہے کہ وہ ہمیں اپنے برابر سمجھے۔ اتحادیوں کے سر برآوردہ لیڈر پریسیڈنٹ ولسن لائیڈ جارج کلیمنشو نے اپنے خیال سے ترکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا صرف اناطولیہ اور وہ بھی باستثنائے سمرنا ترکوں کا تھا۔ باقی ممالک تقسیم ہو چکی تھی ترکی کو فوج رکھنے کی ممانعت تھی۔ ہر مہینہ میں فاتحین کی مداخلت سے ترکی سسکیاں لے رہا تھا لیکن کمال پاشا کی بدولت مردہ سے مردہ ترک زندہ ہو گیا۔ پانچ سو سال حکومت کرنے کے بعد آج ترکی کی عظمت طوق لعنت بن رہی تھی۔ اسلامی شان مسیحی اقوام کے قدموں پر تھی۔ لیکن ترکوں نے باہمی جنگ و جدل کا خاتمہ کیا۔ تفرقے فراموش کر دیے۔ ابھی اتحادی پیرس میں موجود تھے۔ کہ حیرت سے خبر سنی کہ ولایت زدہ مٹھی بھر ترکوں نے فاتح اتحادی قوت کو تہس نہس کر دیا۔

صلیب شکن غازی

اتحادیوں نے یونانیوں کی ملک گیری کو ابھارا۔ ترکی پر مصیبت کے دن پھر لہرائے۔ ترکی زخموں سے چور تھا۔ دنیا مایوس تھی لیکن مصطفےٰ مایوس نہ تھا۔ اسے اپنے ملک اور بھائیوں سے بڑی امیدیں تھیں۔ مجلس ملی کے سامنے پہنچا۔ دردناک تصویر کا خاکہ کھینچا۔ متوسط اندام، نیلگوں چشم، چہرہ پر جھریاں۔ رخ پر سکون۔ بظاہر ایک معمولی مسافر مجمع کے سامنے آواز بلند کر رہا ہے۔ دل کا جذبہ زبان سے ابل رہا ہے۔ رگوں کا خون آواز میں رنگ دے رہا ہے۔ ترکوں کو جوش ہو ترکی اور یونان کے قدموں پر۔ استغفر اللہ غازی کا سکون دلوں میں گھر کر گیا اور بڑھ گیا۔ اول اول مصیبت کے پہاڑ اٹھانے سے لوگ کسی بات پر تیار نہ نظر آتے تھے۔ لیکن آخر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ تقریر ختم ہوتے ہوتے ہر ایک اس کا ہمنوا تھا۔ انھوں نے کسی بالی کے پیرو میں مسیحا نفس پائی۔ ترک اور غلام۔ عرب نکل جائے شام چھن جائے۔ شیرازہ سلطنت اسلام بکھر جائے لیکن ترکی اپنی مدد آپ کرے گا ترکی آزاد رہے گا۔ فوج تیار کی گئی۔ اور غازی کی انتھک کوششیں بار آور ہوئیں لیکن محنت شاقہ نے غازی کو بیمار ڈال دیا۔ فخریہ خانم کی تیمارداری ہی غازی کو زندہ بچا سکی۔ فخریہ خانم عزیز تھی۔ گھر کا انتظام دیکھنا شروع کیا۔ کمرے سجائے۔ باغ درست کیا۔ مکان کو پھولوں سے اور ہر گوشہ کو اپنی موجودگی سے مہکا دیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے لیکن مصطفےٰ کمال محبت کے بندے نہ تھے۔ انھوں نے جلد فخریہ کو بھلا دیا لیکن فخریہ پروانہ صفت اپنی شمع محبت پر نثار ہو گئی ملک کی کشش ایک عورت کی کشش سے زیادہ زوردار ثابت ہوئی

مجلس ملی نے غازی کو کمانڈر انچیف اور عارضی ڈکٹیٹر بنا دیا۔ بیماری کے باوجود تیاریاں کرتا رہا۔ گھوڑے سے گر جانے کی وجہ سے ایک پسلی بھی ٹوٹ گئی۔ لیکن محنت و جفاکشی میں کمی نہ کی۔ محاذ جنگ پر جا پہنچے۔ چودہ دن متواتر جنگ ہوتی رہی۔ غازی کو ایک منٹ کے لئے بھی فوجی لباس اتارنا نصیب نہ ہوا۔ کھانا اور سونا بھی بمشکل میسر ہوا۔ دو ہفتہ بعد دونوں فوجیں تھک چکی تھیں۔ پسلی کی چوٹ چلنے پھرنے میں نشتر کا کام کرتی تھی۔ غازی ابھی غور کر رہا تھا کہ ذرا پیچھے ہٹ کر کیوں نہ لڑا جائے کہ ٹیلیفون نے گھنٹی دی۔ ریسیور ہاتھ میں لے لیا۔ پیام سنا اور مسکرا کر ریسیور رکھ دیا۔ یونانی عاجز آکر ہٹ رہے تھے۔ لنگڑاتے ہوئے دفتر پہنچے۔ قہوہ طلب کیا اور حملہ کا حکم دے دیا۔ سات دن خونریز لڑائی رہی۔ غازی باوجود تکلیف کے خود جنگ میں شریک تھا۔ ارد گرد سپاہی گولیاں کھا کر ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ لیکن پاشا محفوظ تھے۔ بائیسویں دن یونانی پیچھے ہٹے۔ ہٹنا تھا کہ دھوم مچ گئی۔ روس۔ فرانس۔ اٹالیہ۔ افغانستان۔ ہندوستان ہر مقام سے مبارکباد کے تار آنے لگے۔ ترکی نے اپنے بہادر کے لئے آنکھیں بچھا دیں۔ آج مصطفےٰ کمال صلیب شکن تھا۔

لیکن غازی مبارکباد کے تاروں سے غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا تھا وہ جانتا تھا ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ دن اور رات۔ رات اور دن محنت کر کے نئی فوج تیار کی۔ خفیہ طریقہ سے محاذ پر بھیج دیا۔ ۲۶ اگست ۱۹۲۲ء کی شب کو رقص کا انتظام کیا۔ زبیدہ اور فخریہ کسی کو معلوم نہ تھا کیا ہونے والا ہے۔ دنیا کو پر اطمینان نفس دکھانا تھا۔ یونانیوں کو دھوکا دینا تھا۔ انتظامات سب مکمل تھے گھڑی کی سوئیاں [illegible] پہنچیں

تک سے مصطفےٰ نے حملہ کا اعلان کیا۔ ایک سکنڈ کے لئے رقص بند ہوا اور حکم دے دیا "غازیو! منزل ساحل پر ہے"۔ ادھر نہ رکا۔

ستارۂ صبح خون میں رنگ لیکر نمودار ہوا۔ چار بجے یونانیوں پر حملہ ہو گیا۔ دوپہر تک نصف یونانی فوج جنگاہ میں موت کی نیند سو رہی تھی۔ یونانی پیچھے ہٹے۔ دس دن تک ایک سو لوتے میل یونانی بھاگے اور ترک برابر تعاقب کرتے ہوئے ساحل پر جا ڈٹے۔ فاتح ترک تگھیٹر سے یونانیوں کے بیڑوں کو بے نیل و مرام واپس ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے دل مسرت سے اچھل رہے تھے۔ مصطفےٰ کمال نے یونانی فوج کو فاتح اتحادیوں کے منہ پر پھینک مارا۔ سمرنا اس کا تھا ترکی یونانیوں سے آزاد تھا۔ غازی خود ترکی کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا مسلمہ ہیرو تھا۔ سمرنا میں غازی کا داخلہ یادگار منظر تھا۔ شہر سے میلوں پہلے آراستہ موٹروں کی صفیں دو رویہ سڑکوں پر ہنستے مسکراتے بیٹھے اور شادماں چہروں کی دو رویہ [illegible] غازی سمرنا کے پھاٹک پر اترا۔ گھوڑا لیا فوج نے ننگی تلوار سے سلامی دی۔ سوح و سنگ گھوڑوں کی لہر چلی۔ اسپان خوش اندام سڑکوں سے چنگاریاں پیدا کرتے ہوئے تفاخرانہ انداز سے رواں ہوئے۔ مصطفےٰ شہر میں آگئے۔ آزاد کنندہ ترکی کا ورود تھا۔ مجمع خوشی سے اچھل رہا تھا دل قابو میں نہ تھے۔ فلک شگاف نعرے مصطفےٰ زندہ باد کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔

آمر ترکی کمال پاشا

انگریز۔ یونانی اطالوی فرانسیسی سب زیر ہو چکے تھے۔ ترکی سردار فاتح تھا غنیم مفتوح۔ یہ کامیابی صرف مصطفےٰ کمال کی ہمت دانائی پیش بینی اور عاقبت اندیشی کی وجہ سے تھی لیکن غازی میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ ترکی کی فتح ترکوں کی وجہ سے ہوئی لیکن اسی اس فتح کو غازی مانا تھا۔ رفتہ رفتہ غازی ترکی کا ڈکٹیٹر ہو گیا۔ اس کی زندگی پر دو بار حملے ہوئے اور ہر بار دوبارہ زندگی پائی۔ ترک اس کے بھائی تھے اور رعایا اس کی اولاد۔ اسے ابھی ملک کی اصلاح کر کے دنیا کے سامنے مثالی ملک بنا کر پیش کرنا تھا۔ لباس۔ عادات و اطوار۔ طرز گفتگو۔ آداب نشست و برخاست میں زمانہ کے ساتھ چلانا تھا۔ قوانین بدلے۔ اطالوی قانون تعزیرات۔ جرمنی قوانین تجارت۔ سوئٹزرلینڈ کے دیوانی کے قوانین نافذ کئے۔ پردہ اٹھا دیا۔ تعدد ازدواج کے خلاف قانون پاس کرا [illegible] اور ہر شے ترکی زبان میں کر دی۔ ترکی ادب سے عربی۔ فارسی تاتاری الفاظ نکال دیئے۔ اشاعت پر ترکی کا پرانا نشان "گرگ" کی تصویر چسپاں کر [illegible] وطن پرستی کی طرف مائل کیا۔ بیرونی اثرات کے دروازے بند کر دیئے۔ ترکی میں صرف ترکی مال کا استعمال جائز رکھا۔ ہر قوم کے لئے جمعہ کو یوم تعطیل قرار دیا شمسی سال رائج کیا۔ گداگری موقوف کر دی کسی درویش زندہ کے دکھ درد پر [illegible] جرم قرار دے دیا۔ غرض ہر شعبہ زندگی پر نگاہ کر کے ہزاروں تبدیلیاں کر دیں اور سارے ترکی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ مسلمانان ہند کے ایک وفد نے ایک بار اس کے خلیفہ ہو جانے کے لئے استدعا کی لیکن کمال پاشا نے صاف انکار کر دیا۔ فرضی خلیفہ بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کیا ہندی مسلمان اس کے احکام ماننے کے لئے تیار ہوں گے۔ ہندی وفد خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے کو صرف ترکی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس کے کوئی اولاد نہیں۔ کوئی خاندان نہیں۔ اس کا ملک اس کا خاندان ہے اور اس کی قلیل ذاتی املاک کا وارث خود اس کا وطن ترکی ہے ہر چند جوانی جا چکی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی لیکن محنت و جفاکشی کا وہی عالم ہے۔ ایک بار مسلسل ساٹھ [illegible] بیٹھ کر تقریر تیار کی اور چھ دن مسلسل تقریر کی لیکن آواز کا زیر و بم کسی مقام پر کم نہ ہوا۔ نہ آواز سے تکان کا اظہار کیا۔ فی الواقع قوم کا ایسا جاں نثار خادم کہاں۔ اس کی ہر سانس سے وطن کی آواز آتی ہے۔ وہ جان ترکی ہے وہ شان ترکی ہے۔ دنیا کا سب سے [illegible] اور تاریخ کا فرد واحد مصطفےٰ کمال پاشا زندہ باد۔

غزل!

جناب مولانا درد صاحب کاکوروی

ترے جلوؤں کی رنگینی گلستاں میں یہاں تک ہے
کہ ہر ذرہ درخشندہ زمیں سے آسماں تک ہے

ہر اک ذرہ تماشائی مکاں سے لامکاں تک ہے
بصارت وجد میں ہر دم زمیں سے آسماں تک ہے

جہاں میں اللہ اللہ یہ جمال آرائیاں تیری
بہار حسن سے رنگین دامانِ خزاں تک ہے

فضاؤں میں ہم آغوشِ تصور ہے یہ رنگینی
کہ جنت ہمکنار حسن و مستی کہکشاں تک ہے

جو بلبل چہچہاتی ہے تو غنچے مُسکراتے ہیں
عجب خوشبو چمن سے لیکے پھیلی آشیاں تک ہے

مگر کچھ اپنی بربادی کا بھی احساس ہے تجھکو
تغافل سے تری برہم نظام دو جہاں تک ہے

ہماری زندگی کے ختم ہو جائینگے سب قصے
یہ سارا شور ہستی ایک مرگ ناگہاں تک ہے

بنا مشعل یقیں کے راستے ہو جائینگے روشن
کہ شک کی حکمرانی ہستیٔ وہم و گماں تک ہے

دھواں بنکر ابھی اُڑ جائیگا دو چار نالوں میں
فلک رفتار یہ تیری مری ضبط فغاں تک ہے

ذرا پروردگار دین و ملت سے کوئی کہدے
کہ تیرے حُسن کا قصہ ہماری داستاں تک ہے

ہماری یہ کہانی دیکھ لینا رنگ لائیگی
بظاہر گرچہ شہرت درد دل کی داستاں تک ہے

چچا

ایک درد انگیز نفسیاتی افسانہ

جناب مولانا امیر اللہ صاحب آسی رام نگری

دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح کی حکومت کے ماتحت غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں انہیں اپنے قریب کا کام چھوڑ کر زیادہ سوچ بچار کی دقت، ایک آن نہیں بھاتی۔

رگھو پتی بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا۔ کس وقت کھیت میں ہل چلانے کا موقع ہے؟ کس کھیت میں کیا بو دیا جائے کہ پیداوار اچھی ہو ان باتوں میں تو وہ کبھی کسی کی حکومت اور دباؤ قبول نہیں کر سکتا۔ باپ کے زمانے کی سیکھی ہوئی اس جانکاری کو اس نے کھیتی باڑی سے اپنی اس دلچسپی کی بنا پر اور بڑھا ہی لیا ہے۔ لیکن کھیت اور میدان کے متعلق اس کی اتنی بھی ہوئی سمجھ گھر میں آکر زندگی کے دوسرے معاملات کے سامنے ایک دم معطل اور بیکار ہو جاتی۔ اور ٹھیک اسی وجہ سے تو اسے اپنے اوپر کسی نہ کسی حکومت کی ضرورت تھی۔

رگھو پتی کی ماں کے پرلوک سدھارنے کے بعد جب سے گھر گرہستی کا بوجھ بھابی پر آ پڑا ہے اس وقت سے آج تک پندرہ بیس برس کے طویل عرصہ میں اسی بھابی ہی کی رائے سے سیاہ و سفید ہوتا آیا ہے۔

رگھو پتی کا دھیان کبھی بھی اس راج کے بھلے برے پر نہیں گیا۔ دن بھر باہر رہتا۔ دن کی روٹی بھی اکثر باہر ہی منگاتا۔ شام کو گھر میں اپنے بھتیجے برجو کے ساتھ دودھ روٹی ایک ہی تھالی میں کھاتا۔ دسہرے کے موقع پر اور لوگوں کے ساتھ اسے بھی نئی دھوتی نئے کرتے اور دو ایک روپے مل جاتے اور پھر اسے کمی ہی کس بات کی تھی؟ کھانے پینے کے لئے وہ خود ... اسے پیسے کی ہنگ پوری کرنے کے لئے بھیا ہر

مہینے روپے بھیجتے ہی تھے۔ غرض اس طرح بھابی کے راج کے پندرہ سال گذر گئے۔

اس درمیان میں چھوٹی ہوتے بھی کسی طرح کی دل پھٹنے والی والی بات نہیں ہوئی۔ نہ کوئی معاملہ نہ جھگڑا کیا۔ ہر چند کہ اس کا شوہر کھانے کے لئے اناج پیدا کرتا تھا لیکن اس کے بناؤ سنگار کے کام تو جیٹھ ہی کے روپے آتے تھے اور خرچ ہوتے تھے جٹھانی کے ہاتھوں سے کیا اسے کیا؟ کسی کا بھی راج رہے۔

لیکن جب بڑے بھائی کی ایک معمولی ہی مرض میں اچانک موت ہو گئی اور رد دھو کا کام کاج کر لینے کے بعد بھی پندرہ بیس دن ہونے کو آئے تو گھر کے ہر سمجھدار فرد نے دیکھا کہ اب ہر روز کچھ نئے سوال سر اٹھا رہے ہیں۔ دیورانی کے کھلے کانوں نے ان کی آواز سنی۔ جٹھانی کی تیز نگاہوں سے بھی ان کے کھڑے ہونے کی بات چھپی نہ رہ سکی۔ لیکن رگھو پتی کچھ بھی نہ سن سکا نہ دیکھ سکا۔ اور پھر وہ سمجھدار ہی کب تھا؟ دس سال کے بھولے برجو ... ورا ... سے ابھی جاننے سنے کی امید بھی تو نہیں کی جا سکتی تھی۔

گھر کا جو کاروبار ... رگھو کی ماں ... نہ سمجھ کبھی نہیں جا سکا پھر وہ کیوں ... تو یہ بھی نہیں ہیں وہ اپنی چالیس سال کی طویل زندگی میں کتنے گھروں کا حال دیکھ چکی ہے۔ آہستہ آہستہ گھر کے باہر آس پڑوس میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ لیکن نا سمجھ رگھو پتی اب بھی بے خبر تھا۔

برجو لڑکا تو تھا ہی - دیر تک سوتا تھا - سویرے اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر کچھ دانہ منہ میں ڈالنے کے بعد اپنی گلے کا گرم کیا ہوا دودھ پیتا، باقی دودھ دوپہر کے کھانے کے ساتھ پیتا یہی اس کا روز کا معمول تھا -

ایک دن برجو ابھی سو ہی رہا تھا اور دودھ ابھی آگ ہی پر تھا کہ چھوٹی بہو نے اپنے کمرے کے دروازے سے رامو کی ماں کو پکار کر کہا -

"سنتی ہو رامو کی ماں! آج دودھ میرے کمرے میں لانا اور ابھی جلدی ہی سے لاؤ چاہے کتنا ہی گرم ہو سکا ہو"

رامو کی ماں نے کسی قدر تعجب سے کہا "کتنا لے آؤں چھوٹی بہو"

"تو پوچھ رہی ہے کتنا لے آؤں؟ تو سمجھتی ہے چلو بھر دودھ سے میرا کام چل جائیگا؟ میں تجھے بتا دینا چاہتی ہوں کہ سویرے کا کل دودھ روز مجھے ہیں چاہئے - اس گھر میں تو یہ ہے کہ چاہے کوئی مرے چاہے جئے دوسروں کو کیا - میں نے بھی امید ترک کر دی ہے اب تو اپنا ہی اپنا بھلا کرنا ہوگا، دید نے بتایا ہے کہ تمہارا روگ دودھ ہی سے جائے گا" یہ کہتی ہوئی چھوٹی بہو اپنے کمرے میں چلی گئی -

رامو کی ماں یہ تو سمجھ گئی کہ سارا کا سارا دودھ چھوٹی بہو کو چاہئے لیکن وہ یہ اب بھی نہ سمجھ سکی کہ دیکھنے سننے میں بھلی چنگی چھوٹی بہو کے بدن میں کس وید نے ایسا روگ ڈھونڈ نکالا ہے کہ مرنے جینے تک کی بات آ پڑی ہے - چھوٹی بہو کا صاف اور صریح حکم سن کر بھی رامو کی ماں کھڑی ہی رہی -

بڑی بہو لڑکے کے لئے دانہ صاف کر رہی تھیں انہوں نے سر نیچے کئے ہی سب کچھ سنا لیکن اسی طرح چپ بیٹھی رہیں -

"بڑی بہو! تو دے آؤں؟"

چھوٹی بہو نے اپنے کمرے کے اندر ہی سے نوکرانی کا یہ دل جلا دینے والا سوال سنا جیسے جو کچھ ہیں بڑی ہی بہو ہیں وہ کچھ بھی نہیں - آگ بگولہ ہو کر بولی - "توبہ ہے توبہ، یہ کیسا گھر ہے کہ نوکر چاکر تک بات نہیں سنتے میں جانتی ہوں کہ یہ کس کے بل پر کود رہی ہے - اگر میں ایک ایک کی خبر نہ لوں تو کہنا"

چھوٹی بہو اسی سُر میں کچھ دیر تک بکتی رہی تب بڑی بہو نے سر اٹھا کر دھیرے سے کہا "رامو کی ماں تم کیا دیکھ رہی ہو - چھوٹی بہو کو [illegible]

ہے نا؟" یہ کہہ کر پھر دانہ صاف چننے لگیں -

"لیکن لڑکا جاگ اٹھے گا تو کیا کھائیگا بڑی بہو" رامو کی ماں نے کہا -

"تو دے آ - میں اسے دیکھ لونگی - ایک دن دودھ نہ ملا تو مر نہ جائیگا اور پھر مر بھی جائے تو [illegible]" اتنا کہتے کہتے بڑی بہو رک گئیں ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا - یہ کہتی ہوئی نوکرانی بھی کہ "بدام رام بھلا ایسے بھی کہا جاتا ہے بہو" تیزی سے دودھ دینے چلی گئی -

نوکرانی کے دودھ لے جانے پر چھوٹی بہو نے شیرنی کی طرح پلنگ سے اٹھ کر تیزی سے نوکرانی کے ہاتھ سے دودھ لے کر سارا کا سارا اسی کے اوپر ڈال دیا - اور کڑک کر بولی - "بدذات! اچھی ہے مزاج دکھلانے آئی ہے انہیں تو سب کو مزا چکھاتی ہوں" یہ کہہ کر دھم سے چارپائی پر گر کر رونا شروع کر دیا -

آج سویرے ہی سویرے کی ان ساری ان ہونی باتوں نے رامو کی ماں کو کیسا کر دیا تھا؟ یہ تو وہ صاف [illegible] بہو کا بے جھجھک گالی دینا - اور الٹے پھوٹ پھوٹ کر رونا [illegible] کس کے آنے کی طرف بہو کا اشارہ [illegible] لیکن [illegible] تک جس کے سامنے گھر کی ساری باتیں طے ہوتی چلی آئی ہیں اس کی [illegible] پسندی کو یکایک ٹھکرا کر ایک نئے شخص کے سامنے جو ان معاملات کو پیش کرنے کی تجویز جو ہو رہی ہے اس سے اس کے کان ضرور کھڑے ہوئے -

"توبہ ہے توبہ ایسا غصہ تو دیکھا ہی نہ تھا - میرا سارا کپڑا خراب ہو گیا" بڑبڑاتی ہوئی رامو کی ماں کمرے سے باہر چلی گئی -

بڑی بہو دانہ صاف ہو جانے پر بھی اسی طرح [illegible] سر نیچا کئے بیٹھی رہیں -

برجو نے جب دانہ کھانے کے بعد دودھ مانگا تو ماں نے چمکارتے ہوئے کہا - "بیٹا آج دودھ نہیں ملا کہو تو روٹی بنا دوں چینی سے کھا لینا"

برجو نے مچلتے ہوئے کہا - "ہوں، میں روٹی نہ کھاؤں گا - میں تو دودھ ہی لونگا - آج تک تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ دودھ [illegible] - چاچی نے آج دودھ بھیجا ہی نہیں کیا؟"

ماں نے [illegible]

[illegible] آیا ہے۔ تمہیں سکول بھی تو [illegible]
[illegible] جیب میں ڈال کر [illegible]
[illegible] دوا کی جڑی جس کے لئے تمہیں اس [illegible]
[illegible] کتنا اچھا ہے:

[illegible] برتن صاف کر رہی تھی۔ اندر کی آگ بھڑک [illegible] کر اس کے دل کو جلا رہی تھی۔ اب تک تو بڑی بہو کی شرافت دیکھ [illegible] سے اپنے دل کو روکے رہی جب اس نے دیکھا کہ دودھ نہ ملنے [illegible] سبب بتا کر بہو لڑکے کو بہلا دینا چاہتی ہیں تو اس سے کسی طرح ضبط نہ ہو سکا۔ اور اونچی آواز میں آپ ہی آپ کہنے لگی۔

"ہائے رے باپ ابھی ایسے اچھے باپ کو مرے ہوئے پندرہ دن بھی نہیں ہوئے کہ بیچارے کو دودھ ملنا بھی محال ہو گیا۔ اسے اس سنسار کا [illegible] " اور بھی نہ جانے کیا کیا کہتی۔ لیکن بڑی بہو نے اس کے جملے کو بیچ میں ختم کرتے ہوئے غصہ کے انداز میں کہا۔ "راموکی ماں کیا بک رہی ہو؟"

راموکی ماں تو چپ ہو گئی۔ لیکن اب تک بچے کو سنبھالے رکھنے والی بہو اب اور زیادہ ضبط نہ کر سکی۔ شوہر کے مرنے کا دکھ دینے والا حادثہ اندر ہی اندر اس کے دل کو مسوس رہا تھا اور دودھ والے واقعہ واقعہ کا تعلق کس سے ہے اور یہ بات کہاں جا کر ختم ہو گی؟ یہ سوچنا بھی اس کے لئے باقی نہیں رہا۔ ٹھیک اپنے ہی جذبات کو نوکرانی کے منہ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر وہ ایکبارگی جھنجھلا اٹھی جیسے کسی نے ان کی چوری پکڑ لی ہو۔ لیکن جب چوری ظاہر ہو گئی تو وہ اپنے ان آنسوؤں کو بھی نہ روک سکیں جنہیں بیٹے کے سامنے اب تک نہ گرنے دینے کی دل وجان سے کوشش کر رہی تھیں۔ نہ جانے کیسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ضبط کے بند کو توڑ کر امنڈ امنڈ کر بہنے لگے۔

بھولا ابھی تک نہ سمجھ سکا تھا کہ باپ کی موت اور اس کے سویرے کے دودھ سے کیا تعلق ہے؟ اس کے خیال میں اگر دودھ کا کچھ تعلق گائے کے علاوہ کسی اور سے ہے تو وہ صرف چچا ہی سے ہو سکتا ہے لیکن باپ کی موت اور ماں کے آنسوؤں کا بھید تو اسے معلوم ہو گیا تھا۔

اس لئے اب وہ زیادہ سوچ بچار میں نہ پڑا۔ اور جلدی سے ماں کے لئے جڑی ڈھونڈنے نکل پڑا۔

لڑکے کے چلے جانے پر بڑی بہو نے بھی اپنے کمرے میں جاکر اندر سے کواڑ بند کرلئے۔ کتنی دیر تک وہ اپنے کمرے میں پڑی رہیں؟ کب ان کے امنڈتے ہوئے آنسو تکیہ کو بھگو کر گالوں پہ سوکھ گئے۔ یہ کن خیالات کی رو میں بہتی ہوئی سو گئیں انہیں کچھ بھی خبر نہ ہوئی۔

یکایک جب برجو کی آواز کانوں میں آئی تو بڑی بہو نے فوراً اٹھ کر کواڑ کھول دیئے۔ بیٹے نے ہنستے ہوئے محنت سے تلاش کی ہوئی بوٹی ماں کے ہاتھ پر رکھدی اور مچل کر بولا۔ "ماں میں جاکر جلدی سے نہا آتا ہوں آج ہمارے سکول میں ڈپٹی صاحب آئینگے۔ کچھ پہلے جانا چاہیئے۔" یہ کہتا ہوا برجو کنوئیں کی طرف بھاگا۔

لیکن ابھی تک تو رسوئی گھر میں آگ بھی نہیں جلائی گئی ہے، نہ جانے کیوں بڑی بہو کو اندر ہی اندر یقین سا تھا کہ چھوٹی بہو کا ردگرد وہ پاکر ٹھنڈا ہو جائیگا۔ اور کھانے میں مزاحم نہ ہوگا۔

جب سے چھوٹی بہو اس گھر میں آئی ہے رسوئی گھر اسی کے ذمے رہا ہے۔ لیکن اب تک رسوئی بنانے کا کوئی انتظام نہ دیکھ کر بڑی بہو گھبرا گئیں لیکن جو روگ سویرے ہی سویرے یہ مہابھارت کھڑی کر سکتا ہے وہ بھلا چھوٹی بہو کو رسوئی کیسے بنانے دیتا، یہ تو انہیں سمجھنا ہی چاہیئے تھا۔

اگر بڑی بہو اتنی دیر کمرے میں پڑکر فضول آنسو بہانے اور رلو خیالات میں الجھی رہتیں تو اب تک رسوئی بن گئی ہوتی۔ برجو آتا ہوگا اسے جلدی کھانا ملنا چاہیئے۔ خیر بڑی بہو نے کسی نہ کسی طرح جلدی جلدی تھوڑا سا آٹا گوندھ کر کڑھائی میں گھی چڑھادیا اور دو ایک پوری نکالتے نکالتے برجو کھانے پر آبیٹھا اس نے تعجب سے پوچھا۔ "آج پوری کیوں بنا رہی ہو ماں؟"

"آج تمہارے ڈپٹی جو آنے والے ہیں۔ اس لئے آج تو اچھا کھانا اچھے کپڑے چاہئیں نا؟" کہہ کر مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی ماں چینی لانے چلی گئی۔ ٹھیک وقت پر برجو صاف ستھرے کپڑے پہن کر سکول چلا گیا اس دن گھر میں کھانا نہیں پکا۔

شام کو جب چچا بھتیجا ایک ہی تھالی میں کھانے بیٹھے تو برجو ڈپٹی صاحب کے سکول دیکھنے کے متعلق بڑے شوق سے ساری باتیں بتلانے لگا۔ ڈپٹی صاحب کیسے کیسے سوال کرتے تھے۔ ڈر کے مارے ٹھیک جانتے ہوئے بھی لڑکے کیسے غلط جواب بتا دیتے تھے اور اس کے جواب پر ڈپٹی صاحب کتنا خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے ماسٹر سے پوچھا کہ یہ کس کا لڑکا ہے اور۔۔۔

اب تک چچا چپ چاپ سن رہا تھا لیکن برجو کے منہ سے یہ بات نکلتے ہی منہ چلانا بند کر کے پوچھا "اچھا تو اس پر ماسٹر صاحب نے کیا کہا؟"

پاس ہی بیٹھی ہوئی ماں بڑے پیار اور محبت سے بیٹے کی باتیں سن رہی تھی۔ اندر رسوئی گھر میں بیٹھی ہوئی چھوٹی بہو بھی برجو کا جواب سننے کیلئے کان لگائے بیٹھی تھی۔

برجو نے اسی جوش سے کہا۔ "اور کہتے کیا؟ آپ کا نام لیکر کہا کہ انہیں کا بھتیجا ہے؟" یہ سن کر رگھوپتی تو اتنا خوش ہوا کہ اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا اور بھتیجے کی پیٹھ پر خوشی کا ایک ہاتھ مار کر کہا۔ "شاباش بیٹا!"

اندر بیٹھی ہوئی چھوٹی بہو نے کہا۔ "لونڈا کتنا باتونی ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں یہ سب کس کے سکھانے سے کہہ رہا ہے۔"

برجو کہتا ہی گیا۔ "اور دیکھو چچا میں سکول بھر میں سب سے صاف ستھرے کپڑے پہن کر گیا تھا اور جاتے ہوئے میں سکول میں پوری چینی کھا کر گیا تھا۔" اسی وقت اس کی ماں دودھ لے کر آئی پوری کی بات کے ٹھیک بعد ہی دودھ دیکھ کر یکایک برجو کے دماغ میں سویرے کی بات گھوم گئی اس نے روٹھنے کے انداز میں دھیرے سے کہا۔ "لیکن چچا آج تم نے سویرے مجھے دودھ کیوں نہیں بھیجا؟"

"بھیجا تو تھا۔ ؟" رگھوپتی نے تعجب سے کہا۔

"کہاں بھیجا تھا؟ بھیجا ہوتا تو مجھے ملتا نا؟"

اب رگھوپتی کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی۔ بڑی بہو کی طرف منہ پھیر کر کہا۔ "کیوں بھابی کیا بات ہے؟ برجو کو دودھ کیوں نہیں ملا؟"

اندر بیٹھی ہوئی چھوٹی بہو نے ساری باتیں سن کر دل ہی دل میں کہا۔ آپ میٹھی بنی رہ کر چچا کے کان بھرنے کیلئے لڑکے کو سکھا دیا ہے یہ عورت ہے کہ ڈائن؟ اوپر سے اتنی چپ اور اندر سے اتنی داؤ پیچ! چھوٹی بہو اندر ہی اندر اینٹھ کر رہ گئی۔

تھالی میں دودھ ڈالتے ہوئے بڑی بہو نے دھیرے سے کہا

بچی کو دودھ کی ضرورت تھی :۔

"بچی کو دودھ کی ضرورت تھی؟ یہ کیا کہتی ہو بھابی؟ اور پھر دودھ کی ضرورت اتنی بڑی تھی کہ برجو کی اتنے دنوں کی عادت کا بھی خیال نہ کیا۔"

"وہ بیمار ہو گئیں۔ وید نے بتایا ہے کہ دودھ ہی سے انہیں آرام ہوگا"

"اچھا وہ بیمار کب پڑ گئیں؟ ابھی کل تک تو بالکل بھلی چنگی تھیں۔"

اب تو چھوٹی بہو کے غرور و تمکنت نے چٹکیاں لے کر ان کا منہ کھلوا ہی دیا۔ چمک کر بولیں۔ "کیا جو کل اچھا تھا آج بیمار ہو ہی نہیں سکتا جو دو چار لمحے پہلے بھلے چنگے رہتے ہیں وہ دوسرے لمحہ میں اچانک مر جاتے ہیں۔ بیماری اور موت پر کیا کسی کا بس ہے۔ لیکن نہیں میں جانتی ہوں کہ اس میں کس کا قصور ہے اگر میری تقدیر پھوٹی نہ ہوتی اور میری گود بھری ہوتی تو لوگ مجھے اس طرح نہ دباتے۔"

رگھوپتی نے تعجب سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "ایں یہ کیا بات ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک ساتھ ہی ساری باتیں بدل گئی ہیں۔ برجو کو دس برس کے عرصہ میں آج پہلی بار دودھ نہیں ملا۔ چھوٹی بہو اچانک بیمار ہو گئی اور گھر کے چھوٹے لوگ بڑوں کا لحاظ تک بھول گئے! یہ سب ایک ہی دن میں کیسے ہو گیا۔ بھائی میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔"

"کیسے سمجھ میں آوے۔ اگر سمجھ ہی میں آتا تو دوسرے غیر بنا کر کیسے رکھ سکتے؟" اندر سے چھوٹی بہو کی تیز آواز کانوں میں آئی۔

رگھوپتی تو ایسا گھبرا گیا جیسے اس کے اوپر اچانک دھاوا بول دیا گیا ہو۔ وہ کتنا ہی سیدھا کیوں نہ ہو لیکن ایسے صاف الفاظ کا مطلب سمجھ ہی سکتا تھا۔ جب گھر کی بات بگڑنے کو ہوتی ہے تو ایسی ہی باتیں پہلے کھڑی ہوتی ہیں۔ رگھوپتی جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر باہر جاتے ہوئے کہتا گیا۔ "آج کا دودھ تو ہم لوگ کھا ہی گئے۔ شاید چھوٹی بہو کی بیماری جلدی اچھی نہ ہوگی اس لئے کل تو کسی کے ہاتھ سے تھوڑا دودھ منگوا دونگا لیکن کل سے رات ہی کو دوسرے دن کیلئے دودھ رکھ دینا ہوگا۔ ہاں دیکھنا برجو ہمارا اپنی ہی گلے کا دودھ پیتا آیا ہے۔ کل جو دوسرا دودھ آئیگا وہ چھوٹی [بہو] کو دینا۔ برجو اپنا دودھ پیئے گا۔"

ایک ہفتہ تک تو نئے انتظام سے کام اچھی طرح چلتا رہا۔ لیکن جو نیا پتی پریم صبح کی بیمار چھوٹی بہو کو شام کو بیماری ہی کی حالت میں روٹی گھر میں کھینچ لانے میں کامیاب ہو سکا۔ وہ شوہر کے دودھ کی اس کمی کو کیسے سہ سکتا۔ بھتیجے کے لئے چچا اپنا دودھ پینا چھوڑ دے تو کسی گرہست شاستر میں نہیں لکھا ہے۔ پھر اسی کے گھر میں یہ بات کیوں ہو؟ چھوٹی بہو اندر ہی اندر شوہر کی بیوقوفی اور ماں بیٹے کی چالاکی پر جلنے لگی لیکن اس کی آگ اسی کو کب تک جلاتی۔ اور لوگوں پر بھی تو اس کی آنچ آنا لازمی تھی۔ اس روز دودھ والی بات نے گرہستی کی ناؤ میں جو ایک معمولی سا سوراخ کر دیا تھا اسے رگھوپتی کے نئے انتظام نے دو چار دن کیلئے بڑھنے سے روک دیا لیکن سوراخ اگر بالکل بند نہ ہو جائیگا تو بڑھیگا ضرور۔ ہفتہ دو ہفتہ گذرتے گذرتے سبھی سمجھدار آدمیوں نے دیکھا کہ [اب تک] چل رہے والے خاندان کی گاڑی اب آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس مرتبہ رگھوپتی نے بھی اسے اچھی طرح سمجھ لیا۔ برجو نے بھی یہ تو ضرور ہی سمجھ لیا کہ گھر میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے لیکن اس گڑبڑ کا آخری نتیجہ کیا ہوگا اس کا معاملہ اس کی تہ کو اب بھی نہ پہنچ سکا۔

ایک روز شام کو سکول سے آنے پر اس نے دیکھا کہ چچی صحن میں کھڑی برتن اور دوسرے سامان باہر رکھوا رہی ہیں۔ رامو کی ماں نے اسے تعجب میں کھڑے دیکھ کر کہا۔ "کھڑے کیوں ہو بیٹا؟ جا کر کچھ پانی پی لو۔ اب چچا تم سے الگ رہینگے۔ تم لوگ اسی گھر میں رہوگے وہ دوسرے والے مکان میں رہینگے۔" یہ کہہ کر وہ برتن دھونے لگی۔

الگ ہونے پر بھی رگھوپتی کا وہی پرانا دستور جاری رہا ہاں صرف ایک تغیر کے ساتھ۔ اب وہ سویرے ہی گھر چھوڑ دیتا اور شام کو اندھیرا ہونے پر گاؤں میں آتا۔ گھر میں بھی اس کے لئے کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی بس بھائی کا راج بیوی کے راج میں بدل گیا تھا۔ لیکن کوئی دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا کہ اس کے چہرے پر بھوؤں سے تھوڑا اوپر فکر کے بل کی صورت میں اپنے نشان ڈال رکھے تھے۔ پہلے تو اس نے برجو کے لئے دودھ کا وہی دستور جاری رکھنا چاہا لیکن بیوی کی پرزور مخالفت کی وجہ سے اپنا خیال بدل دینا پڑا۔ ہاں ایک بات وہ ضرور کرتا رہا تھا کہ بھابی کے حصہ کی جگہ زمین کی دیکھ بھال کر دیتا اور جو تھوڑی بہت

الگزاری ملتی اسے پہنچا دیتا۔ اس بارے میں بیوی کی طرف سے بھی کچھ زیادہ مخالفت نہ ہوئی۔

دو ایک دن کے بعد ہی برجو کا جی چچا کے دیکھنے کو چاہا۔ یہ تو اسے معلوم ہی تھا کہ سویرے تو اس سے ملاقات ہو ہی نہیں سکتی اس لئے الگ ہونے کے تیسرے ہی دن شام کو سکول سے آنے پر وہ چچا کے گھر کی طرف چل پڑا۔ چچا کا گھر اس کے گھر سے چار سو گز کے فاصلے پر تھا اس نے وہاں پہنچکر دیکھا کہ چچی صحن میں بیٹھی ہوئی کسی پڑوسن سے باتیں کر رہی ہیں۔ اسے دیکھکر چچی نے روکھے انداز سے پوچھا۔ "ادھر کیسے آئے برجو۔؟"

"کیا چچا ابھی نہیں آئے؟" برجو نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو اس وقت کبھی نہیں آتے۔" اتنا کہہ کر چچی پڑوسن سے باتیں کرنے لگیں۔ برجو تھوڑی دیر تک کھڑا رہنے کے بعد اداس منہ لئے دھیرے دھیرے گھر سے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے سنا چچی کہہ رہی ہیں۔ "تم نہیں جانتی ہو بہن! یہ لڑکا بڑا چھل باز ہے وہ ضرور کسی نہ کسی مطلب سے آیا تھا۔ اپنی ماں کا لڑکا ہے کہ نہیں؟" چچی کی بات سُن کر برجو کی آنکھوں سے دو بوند آنسو نکل پڑے۔

لیکن دل ہی دل میں چھوٹی بہو نہ جانے کیوں برجو سے ڈرتی بہت تھی۔ شاید اس کے ڈر کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے شوہر پر پورا بھروسہ تھا اور سوچتی تھی کہ کہیں یہ مصری کی طرح میٹھی باتیں کرنے والا لونڈا اپنی قسمت کے جال میں انہیں پھر نہ پھانس لے اس لئے اس کا چچا سے ملنا جلنا اس کے نزدیک خطرے سے خالی نہ تھا۔

اس روز رات کو جب رگھوپتی کھانے بیٹھا تو چھوٹی بہو نے کھانا سامنے رکھتے ہوئے ذرا گردن گھما کر کہا۔ "اپنے لائق بھتیجے کی باتیں سنیں؟ ہم لوگوں کے بارے میں لوگوں سے کیا کہتا پھرتا ہے؟"

"نہیں تو۔ کیا کچھ کہہ بھی رہا ہے؟" رگھوپتی نے سر نیچا کئے کئے پوچھا۔

"ارے کچھ؟ وہ زہر اگل رہا ہے۔ دیکھنے میں تو چھوٹا ہے لیکن اس سے گلنے کا منتر نہیں ہے۔"

لیکن تعجب تو یہ ہے کہ رگھوپتی اسی طرح سر نیچا کئے ہوئے کھاتا رہا۔ اس نے زہر کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کی ذرا بھی خواہش ظاہر نہیں کی۔ چھوٹی بہو اب بھی اپنی ناکامی سے مایوس نہیں ہوئی اور دم

سُن میں کہنے لگی۔ "مجھے کیسے معلوم ہوتا۔ وہ تو اس دن کلو کی ماں گھر گئی تھیں انہیں نے ذرا اس کے دل کا اندازہ لگانے کی نیت سے کہا کہ چچی چاہے جیسی بھی رہی ہو لیکن چچا تو تمہیں بہت چاہتے ہیں۔" اس پر اس انگل بھر کے لڑکے نے جو جواب دیا اسے سن کر تو کلو کی ماں بھی کٹ کر رہ گئی۔ اس نے کہا۔ پیار کیا کرتے تھے۔ ذرا پوچھ پاچھ لیتے تھے جیسے بھگوان نے اپنا لڑکا ہی نہیں دیا وہ دوسرے کے لڑکے کو کیا پیار کریگا؟ تمہیں یقین نہ ہوگا۔ لیکن کلو کی ماں سے پوچھنا یہ سب اسی بڑی رانی کے سکھانے پڑھانے کا نتیجہ ہے نہیں تو وہ لڑکا اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔"

اتنا سن کر رگھوپتی نے سر اٹھایا اور بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم سچ کہتی ہو؟ وہ سچ مچ اس طرح کہتا تھا۔؟"

"اور نہیں تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔" چھوٹی بہو نے تیوری بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" اتنا کہہ کر رگھوپتی پھر کھانے لگ گیا۔ چھوٹی بہو نے بڑی خاطر سے اس کی تھالی میں ایک اور روٹی ڈالتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم تو ایسے بدھو ہو کہ اگر وہ ایک بار چچا کہہ کر پکار دے تو پانی پانی ہو جاؤگے۔"

رگھوپتی نے غرور و تمکنت سے سر اٹھا کر کہا۔ "کیا تم نے مجھے ایسا بیوقوف سمجھ رکھا ہے؟"

بیوی نے فاتحانہ انداز سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب تک تو یہی سمجھتی آئی ہوں۔" ہاتھ دھلاتے وقت چھوٹی بہو نے لمبی سانس کھینچکر کہا۔ "ہائے بھگوان نے ہم لوگوں کا بھاگ ہی پھوڑ دیا ہے نہیں تو کل کا لڑکا کیا ایسی باتیں کہہ سکتا۔"

رگھوپتی نے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہی بات ہے۔"

اس واقعہ کے دو تین دن بعد ہی برجو نے طے کیا کہ اگر وہ کچھ سویرے اٹھے تو چچا سے کھیت پر ملاقات کر کے سکول کے وقت تک گھر بھی لوٹ آسکتا ہے۔ رگھوپتی نے اپنے سب سے بڑے کھیت کے نزدیک ایک جھونپڑی ڈال رکھی تھی وہیں پر اس کے بیل وغیرہ رہتے تھے اور ایک چرواہا بھی رہتا تھا۔ دن کا زیادہ حصہ رگھوپتی وہیں کاٹتا تھا۔ وہ جھونپڑی کے سامنے بیٹھ کر منہ دھو رہا تھا۔ اس وقت [illegible]

[illegible] جلد جلد قدم بڑھا کر لپکا۔ رگھوپتی کا منہ دوسری طرف تھا۔ [illegible] اگر اچانک وہ پیچھے سے چچا کہہ کر پکار اٹھے گا تو چچا کو کتنا تعجب ہوگا۔ اس وقت اسے چچا کو اس طرح چونکانے میں بڑا مزہ آئیگا۔ اس ترکیب کا خیال کر کے اسے جو ہنسی آ رہی تھی اسے سنبھالنا اس کیلئے مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن پاس جا کر جب اس نے سچ مچ "چچا" کہہ کر پکارا تو رگھوپتی نے منہ دوسری طرف گھما لیا لیکن اس سے برجو کو خوشی نہیں ہوئی۔ رگھوپتی بغیر کچھ کہے پاس ہی رکھا ہوا گھڑا اٹھا کر کنویں کی طرف چل دیا۔

برجو پر جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ اسے یقین ہی نہیں ہوا کہ یہی اس کے چچا بابو رگھوپتی سنگھ ہیں جن کا اس کے ساتھ ایک تھالی میں کھائے بغیر پیٹ ہی نہیں بھرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر جیسے ساری دنیا ہی بدل گئی ہو اس نے ڈر کر ایک مرتبہ اپنے کو بھی دیکھا کہ تمام وہی تو نہیں بدل گیا۔ اس کا خوددار دل اندر ہی اندر رو اٹھا۔

کسی نہ کسی طرح اپنے کو سنبھالتا ہوا سسکیاں لیتا گھر آ کر ماں کی گود میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں سویرے ہی جان گئی تھی کہ برجو اپنے چچا سے ملاقات کرنے گیا ہے اس نے لڑکے کے سر کو اپنی چھاتی سے چپکاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "روتے کیوں ہو بیٹا بھلا اس طرح بھی کوئی روتا ہے؟" بہت دیر کے بعد اپنے کو سنبھال کر برجو نے کہا۔ "میں چچا کے ہاں گیا تو انھوں نے مجھ سے بات تک نہیں کی" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگا۔ روتی ہوئی ماں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "اس میں رونے کی کون سی بات ہے بیٹا! بات ہی کرنی ہوتی تو الگ کیوں ہوتے"۔

برجو اس دن سکول نہیں گیا۔

اس بات کو چھ مہینے گذر گئے۔

پندرہ سولہ دن سے سردی کافی پڑنے لگی تھی۔ ایک دن یونہی کسی سے رگھوپتی کو معلوم ہوا کہ برجو کو سردی لگ گئی ہے پانچ چھ دنوں سے بیمار ہے اس خبر سے رگھوپتی کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ اسے وہ دن بھولا نہیں تھا جس روز برجو نے اسے پیچھے سے چچا کہہ کر بڑے پیار سے پکارا تھا۔ اُس دن کی وہ مایوس صورت اور ڈگمگاتے لوٹتے پیر اسے نہیں بھولے تھے حالانکہ اس نے بھلانے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آج بھی وہ ننھے ننھے پاؤں اس کے دل تک لڑکھڑا کر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رگھوپتی اسی وقت برجو کو دیکھنے چل پڑا لیکن جب دور ہی سے اس چھ مہینے کے دیکھے ہوئے بند دروازے پر اس کی نظر پڑی تو دم بھر کیلئے کھڑا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا "اگر وہ اچھا ہو گیا ہو اور پوچھ بیٹھے کہ میں کیسے پہنچ گیا تب تو بھاگتے رستہ نہ ملے گا"۔ یہ سوچ کر رگھوپتی الٹے پاؤں لوٹ آیا۔

کھانا کھاتے وقت رگھوپتی نے ڈرتے ڈرتے بیوی سے کہا۔ "سنا ہے برجو بیمار ہے"۔ چھوٹی بہو نے گردن ٹیڑھی کر کے منہ کو ذرا ایک طرف کھینچ کر کہا "بیمار کیا ہے۔ ذرا سردی لگ گئی ہے۔ کلو کی ماں بھی تو کل ہی دیکھنے گئی تھیں کہتی تھیں دبلا ہو گیا ہے۔ سو دبلا تو ہو ہی جائیگا۔ کوئی بیماری ہو۔ آخر بیماری ہی تو ہے"۔ رگھوپتی نے سمجھ لیا کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔

اس کے پانچ چھ دن کے بعد ایک روز رگھوپتی سورج ڈوبنے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے آنگن میں بیٹھا دانہ کھا رہا تھا کہ رامو کی ماں نے باہر ہی سے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "چھوٹی بہو! کیا چھوٹے بھیا گھر میں ہیں؟" اس کے گھر میں گھستے ہی رگھوپتی نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے رامو کی ماں؟"

"بھیا جلدی چلو، تمھیں برجو بلا رہا ہے"۔ اتنا کہہ کر رامو کی ماں آنچل سے منہ ڈھانپ کر رو پڑی۔ رگھوپتی کے پیر کے تلے سے تو جیسے زمین نکل گئی لیکن چھوٹی بہو نے مطمئن انداز سے طنز آمیز لہجہ میں پوچھا "کیا بات ہے رامو کی ماں کہ آج چچا کی طلبی ہوئی ہے؟"

"تم اسے طلبی کہتی ہو چھوٹی بہو۔ سونے جیسا بدن پندرہ دن سے چارپائی پر پڑے پڑے مٹی میں مل گیا۔ تین دن سے چھاتی میں ایسا درد اٹھا ہے کہ بیچارے کو نیند تک نہیں آئی گاؤں کے سبھی لوگ دیکھنے آئے ایک تمھیں لوگوں کو فرصت نہیں ملی جو سب سے زیادہ اپنے ہیں۔ آج سویرے ہی سے چچا چچا کی رٹ لگائے ہوئے ہے آخر کو ہار کر بڑی بہو نے بڑی ہمت کر کے مجھے بھیجا ہے کہ تم لوگوں کو بلا لاؤں"۔

رگھوپتی اب زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔ بیوی کو رامو کی ماں کے ساتھ آنے کو کہہ کر خود بھاگتا ہوا چلا۔ شوہر کو بہت دیر تک اکیلے اس

گھر کے خطرناک ماحول میں چھوڑنا نامناسب اور دور اندیشی کے خلاف سمجھ کر چھوٹی بہو بھی چل پڑی۔

گھر کے اندر ایک چارپائی پر سوکھا ہوا برجو پڑا تھا۔ اس کا ننھا سا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے اب وہ باہر آجانے کو ہے۔ بے بس ماں مایوس نگاہوں سے بیٹے کو تک رہی تھی لیکن کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ رگھوپتی نے برجو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر پوچھا "کیسی طبیعت ہے بیٹا؟"

"تم آگئے چچا — بڑا اچھا کیا۔ اب جی اچھا ہی ہے۔"

تھوڑی دیر تک سب چپ چاپ بیٹھے رہے چھوٹی بہو کی طرف کسی کا بھی خیال نہیں گیا۔ برجو نے کمزور آواز میں کہا "چچا میں اچھا تو ہو ہی جاؤنگا۔ لیکن اگر تم مجھے اپنے پاس گھر میں لے چلو تو شاید جلد اچھا ہو جاؤں کیا مجھے لے چلوگے چچا؟" یہ کہہ کر اس نے چچا کی طرف آنکھیں پھیریں۔

رگھوپتی کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی چیز اس کے دل میں ایک پاگل کی طرح گھوم رہی ہے اس نے کہا "کیوں نہیں بیٹا! وہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔" یہ کہہ کر رگھوپتی نے رامو کی ماں کو بلایا۔ اب تک چھوٹی بہو بیمار ہی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نے اب سے پہلے بھی کتنوں کو مرتے دیکھا تھا۔ اور مرنے والوں کو خوب پہچانتی تھی۔ وہ موت سے بیحد ڈرتی تھی اس لئے اسے یہ سمجھنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی کہ اب برجو دو ہی چار دنوں کا مہمان ہے ایسی حالت میں وہ اسے اپنے گھر میں لیجانا کسی طرح بھی گوارہ نہیں کر سکتی تھی اس نے جلدی سے کہا "رہنے دو رامو کی ماں! بھلا کوئی سمجھدار ایسا کرنے کی رائے دے سکتا ہے انھیں کیا کچھ جانتے سنتے تو ہیں نہیں؟ بھلا گھر میں مُردے لے جاکر کیا ہوگا؟"

رگھوپتی کا منہ نفرت و ندامت سے فق ہو گیا۔ برجو خائف نگاہوں سے چچی کی طرف دیکھتا رہا۔ سرہانے بیٹھی ہوئی مصیبت کی ماری ماں نے بیچارگی سے سہارا لے کر چھوٹی بہو کی یہ دل ٹکڑے کر دینے والی بات سنی اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے پھڑکے لیکن منہ سے الفاظ نکل نہ سکے رامو کی ماں نے چھوٹی بہو کی طرف نفرت بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "چھوٹی بہو! کچھ بھگوان سے بھی ڈرو۔ کسی کے بچے کو کوئی ایسا بھی کہتا ہے؟"

چھوٹی بہو نے دل ہی دل میں محسوس کیا کہ اس کے منہ سے نامناسب بات نکل گئی ہے۔ اپنی پہلی کہی ہوئی بات کے اثر کو کم کرنے کے لئے اس نے ذرا سنبھل کر ہمدردی جتاتے ہوئے کہا "مجھے کیا دکھ نہیں ہے رامو کی ماں؟ لیکن تم تو جانتی ہی ہو۔ ایشور ایک تو ہم پر یوں ہی ناراض ہیں کہ ابھی تک کوئی ماں کہہ کر پکارنے والا نہیں دیا۔ پھر تمہیں کہو۔ ایشور نہ کریں اگر وہاں جاکر کچھ برا بھلا ہو جائے تو پھر میرے لئے کیا ہوگا؟"

یہ کہہ کر بہو نے اپنی آنکھیں پوچھ لیں اور رگھوپتی تو جیسے ساری دنیا کے رنج و غم اور شرم و ندامت کی وجہ سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

بڑی بہو نے اتنی دیر کے بعد اپنے کو سنبھال کر روتے ہوئے کہا "چھوٹی بہو۔ ایشور کیلئے تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے بچے کو اچھا ہونے دو۔"

چھوٹی بہو ناگن کی طرح بل کھا کر پھنکارتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور شوہر سے یہ کہتی ہوئی کہ کیا اور بھی بے عزتی کرانا چاہتے ہو؟ جلدی سے صحن پار کر گئی۔ لیکن رگھوپتی اب بھی اسی طرح بیٹھا رہا پھر غصہ سے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی چھوٹی بہو گھر سے باہر ہو گئی۔

گھر آکر بہت دیر تک رگھوپتی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس بیچ میں چھوٹی بہو نہ جانے کیا کیا بک گئی۔ بغیر کچھ کھائے پئے رگھوپتی چارپائی پر پڑ رہا۔ نیند تو کیا آتی کچھ سوتا کچھ جاگتا کروٹیں بدلتا رہا۔ بارہ بجے کے وقت یکایک اٹھ بیٹھا جیسے اس کا بدن کانپ رہا ہو۔ بیوی نے پوچھا "کیا ہے؟ کیا نیند نہیں آرہی ہے؟" تو اس نے جواب دیا "نہیں بڑی گرمی معلوم ہو رہی ہے میں ذرا باہر جاؤنگا۔" یہ کہکر بغیر اس کی پروا کئے کہ بیوی کیا کہہ رہی ہے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

جب پرانے گھر کے بند دروازے سے ٹکرایا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں آیا ہے۔ وہ دروازہ کھلوانے ہی والا تھا کہ اندر سے دو عورتوں کے زور زور سے رونے کی آواز آئی۔ ایک چیخ تو بہت دردناک تھی جو تیزی سے اٹھ کر ساکت و صامت خلا کو چیرتی ہوئی نہ جانے کہاں جاکر غائب ہو گئی۔ اور دوسری آواز معمولی اونچے سُر میں اب تک کانوں میں آرہی تھی۔ ماں کے دل کا پورا زور لے کر وہ درد و کرب سے معمور چیخ دردمندوں کی فریاد سننے والے کے حضور میں شاید کچھ کہنے چلی گئی جس کی صدائے بازگشت بھی لوٹ کر نہیں آئی۔ اور یہی اپنے ساتھ کیا کیا لیتی گئی؟ اسے اس سب کچھ جاننے والے کے سوا کون جان سکتا ہے؟

رات بھر رگھوپتی نہ جانے کہاں کہاں پھرتا رہا اور سویرا ہوتے ہی گھر آکر بیوی سے کہا۔ "کچھ سنا تم نے۔ برجو مر گیا" اس کی بیوی چونک سی گئی۔

"کل تو ابھی اچھا ہی تھا . پھر آج ہی . . ؟" کہتے کہتے ، چھوٹی بہو نے ذرا آنکھیں پونچھ لیں۔

"ہاں یہی تو؟ کل تو اچھا ہی تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ مر گیا۔"

تھوڑی دیر تک آسمان کی طرف تکتے رہنے کے بعد یکایک رگھوپتی نے اپنی آنکھیں بیوی کی طرف پھیر کر کہا۔ "اور تم نے تو کل ہی کہہ دیا تھا کہ مُردے کو بچا کر کیا ہوگا؟ سو تم نے جھوٹ تھوڑا ہی کہا تھا؟"

چھوٹی بہو شوہر کی اس نگاہ کی تاب نہ لاسکی آنکھیں نیچی کرکے کہا "تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے میں بالکل ہی پتھر ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے رونے کی ناکام کوشش کی۔

رگھوپتی پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹی بہو کے رونے کی طرف اس کا خیال نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر رک کر کہا۔ "چلو اچھا ہی ہوا۔ دکھ سے چھوٹے کیوں؟" پھر اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ یہ دیکھ کر چھوٹی بہو گھبرا سی گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں لاؤ تھوڑا سا گڑ کھا کر مرگھٹ پر چلوں۔"

"مرگھٹ پر جاؤ گے؟ لاش کے ساتھ تمہیں جانا چاہئے نا؟ نہ جاؤ تو لوگ کیا کہینگے؟" بیوی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اونہہ، لوگوں کے کہنے کا مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اور پھر تم تو ان کا جواب دے ہی دوگی؟" یہ کہہ کر رگھوپتی زور سے ہنس پڑا۔ اس ہنسی میں نہ جانے کیا تھا کہ چھوٹی بہو ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ایک بار پھر زور سے ہنسکر رگھوپتی گھر سے باہر نکل گیا۔

جب ارتھی اٹھی تو لوگوں نے دیکھا کہ بائیں طرف رگھوپتی کندھا لگائے ہوئے ہے۔ آدمی زیادہ نہیں تھے اور پھر وہ ارتھی ہی کتنی بھاری تھی؟ بانس کی ہلکی سیڑھی پر سفید چادر میں لپٹا ہوا ایک بچے کا بیماری سے سوکھا ہوا دبلا پتلا ڈھانچہ ہی تو تھا۔

جس وقت لاش جل رہی تھی۔ رگھوپتی چتا سے اٹھ کر آسمان پر جاتے ہوئے پیچ در پیچ دھوئیں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا شاید اس کی آنکھیں اس میں برجو کو تلاش کر رہی تھیں۔

روگ سے گل کر، آگ سے جل کر، دھوئیں کے ساتھ آکاش میں سما کر برجو کے چھوٹے جسم کا جو کچھ بھی حصہ رہ گیا تھا وہ بھی گنگا میں بہا دیا گیا۔ دنیا نے اس کا نشان کوئی بھی نہیں رہنے دیا۔ صرف ندی کے کنارے کی اس زمین نے جہاں چتا جلائی گئی تھی اس کی یادگار کے طور پر اس کی چتا کا سیاہ نشان اپنی چھاتی پر لے لیا جسے لوگوں کے ڈالے ہوئے گھڑے کا پانی بھی دھونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن ہمیشہ سبک روی سے بہنے والے ایام کے سیل نے اس یادگار سے کیسی بے رحمی کا برتاؤ کیا۔۔۔؟ اسے جاننے کیلئے دنیا نے کبھی کوشش نہیں کی۔۔۔!

رگھوپتی نے بھی نہا دھو کر دوسرے کپڑے پہنے اور چلنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پر ایک بوڑھے پڑوسی نے اسے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ "دکھ کرنے سے کیا ہوتا ہے بیٹا؟ یہ اسار سنسار ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا۔" ایک مختصر جملہ کہہ کر رگھوپتی نے منہ پھیر لیا پھر یکایک نہ جانے کیا سوچ کر ندی کے کنارے کنارے دھارے کے رخ پر چل پڑا۔ برجو کی راکھ بھی اسی سمت گئی تھی۔

بوڑھے نے فکرمند انداز سے کہا۔ "ادھر کہاں بیٹا؟ گھر چلو نا؟"۔

رگھوپتی نے ذرا گھوم کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے بابا۔ آپ لوگ چلیں میں بھی آ ہی رہا ہوں۔ مگر جینا تو لگا ہی ہوا ہے اس کے لئے سوچ بچار کرنے سے کیا ہوگا؟" اتنا کہہ کر وہ اسی سمت کو چلتا رہا۔ بوڑھے کے ساتھ اور لوگ بھی گھر کی طرف لوٹ آئے۔

دن پر دن گزرتے گئے اب بھی چھوٹی بہو اور بڑی بہو اپنے اپنے گھر دن الگ ہی رہتی ہیں۔ رگھوپتی لوٹ کر نہیں آیا۔ وہ برجو کو تلاش کرنے گیا ہے۔

چھوٹی بہو پوجا پاٹ میں زیادہ وقت گذارتی ہیں لیکن بڑی بہو یہ سب کچھ نہیں کرتیں اکثر دروازے کے سامنے برآمدے میں بیٹھی دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہیں جو دروازہ دن بھر اور رات کے وقت بھی بہت دیر تک کھلا رہتا ہے کون جانے کب اس کس وقت چھوٹے لوٹیں۔۔۔! دروازہ بند دیکھینگے تو کیا کہیں گے۔ (آسی [illegible])

یادگارِ دلگیر

از حضرت دلگیر مرحوم و مغفور

چپ وہ بھی ہو گئے اثرِ ضبطِ آہ سے
اتنا تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں نگاہ سے

لپٹا ہوا ہوں میں بھی تری گردِ راہ سے
او جانے والے دیکھ لے ترچھی نگاہ سے

دیکھا نہیں کسی کی طرف تم نے چاہ سے
اچھا ذرا نگاہ ملاؤ نگاہ سے

توڑا جگر کو یار نے تیرِ نگاہ سے
سب حسرتیں نکل گئیں زخموں کی راہ سے

اب آج سے امید کا بھی نام یاس ہے
آئیں گے وہ دعا سے نہ تاثیرِ آہ سے

کیوں اپنی گردشوں پہ زمانہ کو ناز ہے
پھرنا تو پہلے سیکھ لے تیری نگاہ سے

نالے تو بے اثر ہیں مرے اس میں شک نہیں
پھر کون تم کو پھیر کے لایا ہے راہ سے

زینت کے وقت یہ بھی ذرا دیکھتے رہو
آئینہ دیکھتا ہے تمہیں کس نگاہ سے

انکارِ جرم ہم سے گنہگار کیا کریں!
بوئے شراب آتی ہے فردِ گناہ سے

کیوں دیکھتے ہو سوئے فلک مسکرا کے تم
بجلی چرا نہ لے کہیں شوخی نگاہ سے

موسیٰ چلے تھے دولتِ دیدار لوٹنے
خود لٹ کے جا رہے ہیں تری جلوہ گاہ سے

صدقے ترے جمالِ دل آرا کے لاکھ بار
ظالم ادھر بھی دیکھ لے ترچھی نگاہ سے

پوچھیں کلیم سے تو ذرا چل کے حالِ طور
آئے ہیں ہوش کھو کے تری جلوہ گاہ سے

پرساں ہے مجھ سے داورِ محشر میں ہوں خموش
لب کیا کھلیں وہ روکتے ہیں نگاہ سے

ابھرا رہا زمین سے تو آسمان ہی
بچ کر نکل گیا تری نیچی نگاہ سے

برہم ہے اک جہاں مگر اس کی خبر نہیں
یہ میری آہ سے ہے کہ ان کی نگاہ سے

کیا جانے کیا ہو حشر کے دن خوف ہے بہت
معشوق کی نگاہ سے عاشق کی آہ سے

وہ دیکھنا بھی یاد ہے ان کا حیا کے ساتھ
نیچی نگاہ سے کبھی ترچھی نگاہ سے

ان کے مزار آنکھ اٹھا کر تو دیکھئے!
جو مل چکے ہیں خاک میں نیچی نگاہ سے

تھا شب کو پاس تیرے کوئی حال کھل گیا
اٹھا ہے فرش چیں بہ جبیں خوابگاہ سے

دلگیر میکدہ کا یہ انبوہ یہ ہجوم!
ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے

چینیوں کی خاندان پرستی!

جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدر آبادی

مشہور چینی محقق اور مصنف مسٹر لن یوتانگ نے حال ہی میں ایک کتاب "میرا ملک اور میرے ہموطن" شائع کی ہے۔ ذیل کے مضمون میں اسی مصنف کے مشاہدات اور تجربات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ فقط

(سید بادشاہ حسین)

چین میں مشترکہ خاندان کا چلن رواج ہے۔ وہ سب سے قدیم مشرقی معاشرت کا حامی ہے۔ خاندان کے سارے افراد کا یکجا رہنا، سارا خاندان کے سارے افراد کی آمدنیوں کا مشترک ہونا اور خرچ کا حق ہر فرد کو برابر حاصل ہونا، مصیبتوں کے وقت ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا اور راحت کے دنوں میں سب کا برابر شریک ہونا، بظاہر چینی خاندان پر ایک اشتراکی نظام کا اثر نظر آتا ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ مشترکہ آمدنی میں جتنا بھی اضافہ کر سکتے ہو کرو۔ اور خرچ صرف اتنا کرو جتنا کہ ضروری ہو، یہاں کار فرما نظر آتا ہے۔

خاندان کی عزت فرد کی عزت ہے۔ اور خاندانی بے عزتی فرد کی بے عزتی ہے۔ اس لئے ہر رکن کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اپنے خاندان کی ناک نہ کٹنے دے۔ رشتے ناتوں کی اہمیت اور قرب و بعد کا سوال یہاں نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ سارے افراد ایک ہی رشتہ میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں اور ساری شخصی وجاہتیں خاندان میں ختم ہو جاتی ہیں۔ کوئی نام کماتا ہے تو خاندان کا نام روشن ہوتا ہے۔ اور کوئی نام ڈبوتا ہے۔ تو خاندان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افراد خاندان آپس میں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ اور جس طرح بن پڑے کام آتے ہیں۔ چین میں ایسے واقعات آئے دن سننے اور دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ فلاں شخص نے اپنی ... کو ایک شخص کو ... سے بچانے کے لئے نہ صرف اپنی ... فلاں شخص اپنے ایک عزیز کو تیز حوادث سے بچانے کے لئے خود سینہ سپر ہو گیا۔ یا فلاں شخص نے اپنے ایک قرابت دار پر آنچ نہ آنے کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی۔ ان سے بھی عام واقعات پیش آتے ہیں۔ کہ خاندان کا کوئی دولتمند فرد کنبہ کے سارے مفلسوں کی مالی مدد کرے۔ نہ صرف یہ کہ یتیم بچوں اور بیواؤں کی پرورش خاندان پر واجب ہے۔ بلکہ والدین اور شوہروں کی زندگی میں بھی اگر وہ نادار ہیں۔ تو بچوں کی تعلیم و تربیت اور عورتوں کی پرورش خاندان کے مشترکہ سرمایہ سے ضروری ہے۔

خاندان کا اگر کوئی رکن تاجر ہے۔ تو اس کا فرض ہے کہ اپنے کاروبار میں سارے کنبہ کو شریک کرے۔ نہ صرف کام کاج میں بلکہ منافع اور نقصان میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ چین کے ہر کارخانہ اور دوکان میں ایک ہی خاندان کے افراد سرگرم کار نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی رکن خاندان کسی سرکاری عہدے پر مامور ہے۔ تو یہاں بھی وہ اپنے عزیز و اقارب کا سب سے پہلے خیال رکھتا ہے۔ جو جائدادیں اس کے اختیار سے پر کی جا سکتی ہیں۔ ان پر وہ اکثر و بیشتر اپنے ہی خاندانی افراد کو مامور کرتا ہے۔ اس اصول میں اتنی شدت ہے۔ کہ اگر کوئی جگہ خالی نہ ہو۔ اور فرد خاندان تلاش ملازمت میں ہو۔ تو عہدہ دار اپنے اختیارات کو کام میں لا کر نئی جگہ پیدا کرتا ہے۔ اور چاہے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اور کام کے لئے موزونیت کا سوال ہو یا نہ ہو۔ بہر حال اپنے عزیز کو مامور کر دیتا ہے۔ یہ سلسلہ اکثر مواقع پر سرکاری ملازمتوں کے معاملات میں خاص صورت حال پیدا کر دیتا ہے

خصوصاً اس وقت جبکہ محکمہ کے ایک سے زیادہ عہدہ دار چاہتے ہوں۔ کہ خالی شدہ جائداد پر ان کے اعزا مامور ہوں۔ سفارشی رقعے سبھی جائز و ناجائز سب ہی اس معاملہ میں روا سمجھے جاتے ہیں۔ اور جہاں ایک سے زیادہ کے مفاد جب آپس میں ٹکراتے ہیں۔ تو نظام حکومت پامال پاش ہو جاتا ہے۔

حکومت کا یا رعایا کا روپیہ لوٹنا عوام کے مفاد یا حکومت کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو۔ لیکن خاندانی سود و بہبود کے مدّنظر ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ عہدہ دار اگر روپیہ بٹورتا ہے۔ تو وہ سب کا سب خود ہی خرچ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا کچھ حصہ وہ اپنی اولاد پر اٹھاتا ہے۔ اور کچھ دوسرے عزیز و اقربا۔ برادر روپیہ کی یہ تقسیم جو خاندان کے غریب افراد پر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے کئی نسلوں تک خاندانی حالات بدل جاتے ہیں۔ کیونکہ معاشی نقطۂ نظر سے جبتک افرادِ خاندان کو سہارا نہ دیا جائے۔ وہ نمایاں حیثیت حاصل نہیں کر سکتے یہ خیال اور یہ منطق چینیوں میں اتنی عام ہو گئی ہے کہ وہ اس کے اخلاقی پہلو پر کبھی غور ہی نہیں کرتے۔ اور اس کو اس طرح جائز سمجھتے ہیں کہ "اوّل خویش بعدہ درویش"۔ انصاف اور ناانصافی یا حقوق رسانی اور حق تلفی کا کوئی سوال عہدہ داروں کو پریشان ہی نہیں کرتا۔ عوام بھی اس اصول کو خوب جانتے ہیں۔ اور انہیں اس کی کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ ان کے سر پر بھی کسی نہ کسی کا سایہ ہوتا ہے۔ البتہ وہ کوتاہی کرے تو وجہ شکایت پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ بدرجہا بہتر ہے اس طریقہ سے کہ جس میں انصاف، حق، اہلیت یا موروثیت کی ٹٹیوں کی آڑ میں شکار کھیلا جاتا ہے۔ اور اپنے خبث باطن کے پردوں کو پیچھے چھپایا جاتا ہے۔ ہوتا ہر جگہ وہی ہے۔ جو چین میں ہوتا ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ چینی اس کا اعلان برملا کرتے ہیں۔ اور دوسری قومیں اپنے عزیزوں کو نہ سہی تو اپنے حلقہ بگوشوں اور امین گروہوں کو ہر ہر حرکت سے ناجائز فائدہ پہنچاتی ہیں۔ مگر زبان سے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں

چین میں اگر کوئی شخص راستہ چلتے چلتے کسی کی جیب کتر لیتا ہے تو پکڑا جاتا ہے۔ اور جیل خانہ کی ہوا بھی کھاتا ہے لیکن لطف یہ ہے۔ کہ اگر کوئی عہدہ دار سرکاری خزانہ پر ڈاکہ ڈالے۔ تو وہ پکڑا ہی جاتا ہے۔ اور نہ سزا ہی پاتا ہے۔ کنفیوشس نے کہا تھا۔ کہ حکومت کی عنانیں شرفاء کے ہاتھوں میں ہوں۔ اور چینیوں نے اپنے برگزیدہ فلسفی کے قول پر صرف عمل کیا۔ بلکہ اس کا احترام بھی باقی رکھا۔ حکومت کا ہر عہدہ دار شریف سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی شرافت کو تسلیم کر کے نہ تو اس کے افعال کا مواخذہ ہوتا ہے۔ اور نہ اقوال کی جوابدہی۔ حکومت کی آمدنی اور خرچ پر عوام تناسب اور توازن کی بحث ہی نہیں کر سکتے۔ اپنے حقوق اگر وہ کچھ ہوں بھی تو ان کی حفاظت خود نہیں کر سکتے۔ اور نہ حکومت کے نمائندوں کے اختیارات کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں۔

چینی معاشیات کا نظام ایک چکر پر قائم ہے۔ جو عہدہ دار روپیہ کمانے میں وہ خرچ بھی کرتے ہیں۔ اپنے عزیز و اقارب پر حکومت کے اداروں پر مثلاً جامعات یادو اخانوں وغیرہ کو چندہ دے کر یا پھر اپنے متعلقین کی دیکھ بھال پر۔ اگر ایک عہدہ دار حکومت کے خزانہ پر ڈاکہ ڈالتا ہے تو اس کے افراد خاندان بھی اپنی اپنی مٹھیاں اس رقم سے گرم کرتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اس کا ذاتی ملازم بھی شامل ہوتا ہے۔ وہ بھی یہ سمجھ کر کہ آقا کی ہر وہ رقم جو آسانی سے جیب میں رکھی جا سکتی ہے قبول کرنے سے کبھی انکار نہیں کرتا۔ خود بھی مالک کے نقش قدم پر چل کر اس کی ہی دولت پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اور چونکہ حصول رقم کا یہ سلسلہ ایک سے دوسرے کو برابر پہنچتا ہے۔ اس لئے اس کے جواز میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ دولت کی مساوی تقسیم بہر حال ہو جاتی ہے۔ اگر مغربی طریقہ سے نہ سہی۔ تو مشرقی طریقہ ہی سے سہی۔

اس خاندان پرستی میں چاہے کوئی برائی ہو یا نہ ہو۔ لیکن اتنا تو ہر شخص کو نظر آتا ہے۔ کہ اس کی بدولت خود غرضی عام ہو جاتی ہے۔ ہر شخص تنگ خیال اور محدود ارادہ رکھتا ہے۔ سماج کے اس نظام کی پروا نہیں کرتا۔ جو سارے خاندانوں کے اشتراک کا نتیجہ اور قومیت کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس کو صرف اپنی لگی رہتی ہے۔ دوسرا دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ اس کو تو حلوے مانڈے سے کام ہے۔ اور جب تک اس کے منہ میں نوالہ پہنچ رہا ہے۔ اسے ملک کی فکر اور قوم کی یہ جذبہ خود غرضی پرورش پا کر ایک عجیب و غریب بھیانک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس سے سماج کی زندگی میں آہستہ آہستہ ضعف کے آثار

پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعد میں اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ حد یہ ہوتی ہے کہ ایک بیمار آدمی کا ہمسایہ اگر وہ خاندان سے متعلق نہیں ہے۔ تو نہ صرف مدد کا مستحق نہیں قرار پاتا بلکہ قابل بار پرس بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ وہ جینا بھی ہے یا جینے کا حق بھی رکھتا ہے۔ اس سے مطلب نہیں۔ بُرے وقت کا کیا خیال جب اچھے وقت میں بھی اس کی طرف توجہ کرنا بے ضرورت سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب اس قسم کی طرز معاشرت اور اس قسم کے خیالات قوم کے افراد میں جڑ پکڑ چکتے ہیں۔ تو سماجی نقطہ نظر سے اس کی موت دور نہیں ہوتی۔ کیونکہ جس طرح افراد کے باہم یکدگر کا نام خاندان ہے۔ اسی طرح سارے خاندانوں کے شیر و شکر ہونے کا نام قوم ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بہت دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو چینیوں کی خودغرضی کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ بارش کے موسم میں لوگوں کا کثیر مجمع "بس" کے انتظار میں راستہ پر انتظار کر رہا تھا۔ اور جب "بس" آئی۔ تو موسم کی خرابی کی وجہ سے ہر شخص کی یہ کوشش تھی۔ کہ وہ "بس" میں سوار ہو جائے۔ چونکہ ایک "بس" سب لوگ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے دھینگا مشتی شروع ہوئی ڈرائیور نیچے اتر کر کھڑا تھا۔ ایک شخص نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ ڈرائیور کی سیٹ پر قبضہ کر لیا۔ "بس کنڈکٹر" اور دوسرے متعلقین لاکھ سمجھاتے ہیں کہ وہ جگہ مسافروں کے بیٹھنے کی نہیں۔ مگر وہ ایک نہیں مانتا۔ مسافروں میں ہر شخص التجا کرتا ہے۔ کہ بغیر ڈرائیور کے بس چونکہ چل نہیں سکتی۔ اس لئے اس کو اتر جانا چاہیئے۔ مگر اس کو دوسروں کی کیا فکر؟ کوئی گھر پہنچے یا نہ پہنچے اس کی بلا سے۔ اس کو تو اپنی پڑی ہے وہ ہر بار یہی کہتا ہے۔ کہ وہ بارش سے محفوظ رہنا چاہتا ہے۔ اور جلد سے جلد گھر پہنچنے کے لئے بیتاب ہے۔

بظاہر تو خودغرضی کی یہ ایک دلچسپ مثال ہے۔ لیکن اگر اس جذبہ کا تجزیہ کیا جائے۔ اور اس کی بنیادی حقیقت کے لئے غور و فکر کی جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس کی تہ میں ایک سربستہ راز پوشیدہ ہے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ حکومت نے ساری "بسوں" کو جو غیر فوجی شہریوں کی آمد و رفت کے لئے مخصوص تھیں۔ فوجوں کی منتقلی کے لئے مامور

کر دیا۔ اور اس طرح عین اس وقت جبکہ "بسوں" کی زیادہ ضرورت تھی۔ ان کی تعداد کو غیر معمولی حد تک گھٹا دیا۔ ان حالات کے تحت شہریوں کی ذہنیتوں میں یہ خیال سما گیا۔ کہ جب ان کی غرض پوری کرنے کا خیال حکومت کو نہیں ہے۔ تو انہیں اس کی کیا ضرورت کہ وہ حکومت کی غرض پوری کریں۔ اگر "بس ڈرائیور" کے لئے جگہ نہیں ہے۔ تو ان کی بلا سے۔

گو یہ صحیح ہے۔ کہ اس قسم کی ذہنیت کا رجحان بیہودگی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن یہ بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ ماننا پڑتا ہے۔ کہ یہ تحریک اتنی عام ہے۔ کہ فرد کی خودغرضی کا بار خاندان، سماج اور حکومت پر بھی بانٹا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس کو انفرادی روشنی کی بجائے اگر اجتماعی روشنی میں دیکھا جائے۔ تو زیادہ مناسب ہوگا۔

یہی عمرانی احساس کا فقدان ہے۔ جس کی وجہ سے "بس کمپنیوں" کو نقصان ہو رہا ہے۔ اور معد نباتی کمپنیاں یکے بعد دیگرے بند ہو رہی ہیں۔ بس صرف ان ہی پر کیا منحصر ہے۔ اس قسم کی تجارت جس میں اجتماعی اشتراک عمل کی ضرورت ہے چینی ماحول میں فروغ نہیں پا سکتی۔ کیونکہ اول تو دو افراد سر جوڑ کر بیٹھتے ہی نہیں۔ اور جو اکٹھے ہوں بھی تو ان میں کا ہر ایک اپنی روٹی پر پہلے دال کھینچنے کی فکر کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ سر دماغ زاری کے سوا کچھ نہیں۔

سماجی قوانین کی در حقیقت برابر عزت و وقعت کسی چینی کے دل میں نہیں ہے۔ حکومتی قوانین کا بھی گو جیسی چاہیئے ویسی عزت نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی سزا کے ڈر سے مجبوراً گردن جھکاتے ہی بن پڑتی ہے۔ لیکن چونکہ اخلاقی اور سماجی قوانین کی خلاف ورزی پر کسی قسم کی سزا نہیں ملتی۔ اس لئے اس کی پابندی کی کسی کو فکر نہیں ہوتی۔ بڑا آدمی ہے تو بڑا قانون توڑتا ہے۔ اور چھوٹا ہے تو چھوٹا قانون توڑتا ہے۔ غرض یہ کہ ایسے قوانین جن کی پشت پر کوئی سزا و جزا کا سہارا نہ ہو۔ بغیر کسی تکلف کے نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔

چینیوں کے تحت الشعور میں یہ بات جم گئی ہے اور خدا جانے کب سے ان کی ذہنیت اور رجحان اس کی پرورش کر رہا ہے۔ کہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی حفاظت کریں گے۔ اپنے ہی افراد کو مدد پہنچائیں گے

اور اپنوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ حتیٰ کہ ان کے خاطر جان و مال سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ پس اگر قوم و ملک کا سوال درپیش ہو۔ تو "سخن درین است" والا معاملہ ہوگا۔ اس کے لئے کوئی قربانی کسی قسم کا ایثار اور کسی طرح کا لحاظ کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ حالانکہ اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ خاندان اور قوم میں اتنا فرق نہیں ہے جتنا کہ لوگ سمجھے ہیں۔ بس تدریجی فاصلہ ہے۔ جس طرح خاندان [illegible] افراد سے [illegible] دوسرے سے کسی نہ کسی طرح ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں بالکل اسی طرح قوم مشتمل ہوتی ہے متعدد خاندانوں پر جو ذرا وسیع معنوں میں ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔

قوم پرستی کا بیج جس کی نئی پود میں اب بویا جا رہا ہے اور [illegible] اثرات اس بیج کو جلد از جلد تناور درخت کی شکل میں منتقل کرنے کا باعث ہو رہے ہیں۔ جاپان کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت سمجھی ہے۔ کہ اسی کی طاقت پر ایشیا کا امن قائم ہے اور اسی میں ہمت ہے کہ وہ دنیا میں اطمینان قائم رکھ سکتی ہے۔ مگر اس کے برخلاف چینی [illegible] سارے خاندان ہی کو سمجھتے ہیں جینا اسی میں اور مرنا اسی میں۔ قوم کی فکر نہیں تو ایشیا اور دنیا کا کیا سوال؟ ۱۹۳۵ء میں جن لوگوں نے چین اور جاپان کا سفر کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ دونوں قوموں میں جغرافیائی قربت کے باوجود قومی نقطۂ نظر سے کتنا بعد ہے۔ انہوں [illegible] سواری میں ہو خواہ پیادہ [illegible] سپاہی تنی ہوئی ابروؤں [illegible] آنکھوں سے عزم بالجزم کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یاد دوسری [illegible] گویا ہی گردن میں پہننے کی ٹھان چکا ہے۔ یا پھر اپنے آپ [illegible] کا ہیا کر چکا ہے۔ برخلاف اس کے چینیوں کو سیاحوں نے [illegible] میں دیکھا ہوگا۔ کہ وہ چار خانوں اور رافیون کے اڈوں پر [illegible] دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ ان کے زرد چہروں سے [illegible] کی کوئی علامت ظاہر ہوتی ہے۔ تو وہ ایسی کہ جو [illegible] سکنے کے بعد مایوسی کے عالم [illegible] نمودار ہوتی ہے
پچھلے دو سالوں میں چینیوں نے جو اثرات قبول کئے ہیں

اور قومیت کی جس طرح شیرازہ بندی کی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ موجودہ جنگ سے ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی صورت میں ابھی کہا جا سکتا کہ ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ یا ناکام۔ تاوقتیکہ جنگ کی شورشیں کسی ایسے نتیجہ پر نہ پہنچیں۔

رُباعی

درسِ تقسیمِ زر سکھانے والے
ہر چیز کا معیار بتانے والے
آزادِ فریبِ نفس ہیں روزہ دار
جیتے رہیں یہ عید منانے والے

(از طالب الٰہ آبادی)

شاعر کی عظمت!

جناب ن۔م۔ صاحب راشد ایم۔ اے

کوئی دیتا ہے بہت دور سے آواز مجھے

چھپ کے بیٹھا ہے وہ شاید کسی سیارے میں، نغمۂ نور کے اک سرمدی گہوارے میں،
دے اجازت جو تری چشمِ فسوں ساز مجھے اور ہو جائے محبت پرِ پرواز مجھے
اُڑ کے پہنچوں میں وہاں سازِ ازل بن کے سرعتِ نور سے یا آنکھ کے پلکارے میں

کہ فلک بھی نظر آتا ہے درِ باز مجھے

پھر مجھے ڈھونڈتے رہ جائینگے دنیا کے مکیں دوربینیں بھی نشاں تک نہ مرا پائینگی
اور نہ پیکر ہی مرا آئیگا پھر سوئے زمیں عالمِ قدس سے آوازیں مری آئینگی
بحرِ خمیازہ کشِ وقت کی امواجِ حسیں اک سفینہ مرے گیتوں سے بھرا لائینگی

از حضرت ماہر القادری

نیپال کی ترائی ہو ایک [illegible]
کے چپہ چپہ پر تیندوے اور چیتے۔ بھیڑ بکری کی طرح گھومتے پھرتے ہیں شام
کے وقت ترائی کا منظر بڑا ہی بھیانک ہوتا ہے۔ گھنے درختوں کی
[illegible] زمین پر جھک کر سورج کے چھپنے سے بہت پہلے اندھیرا پھیلا
[illegible] ہیں۔ تیر چلے [illegible] گئے [illegible] ہوا
[illegible] ہیں ہر طرف [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible]
دھاڑنے کی آوازیں آتی ہیں [illegible] جنگل [illegible]
ہے۔ شیروں کی [illegible] آوازیں [illegible] ٹکرا کر
[illegible] تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بھرے ہوئے شیروں کی فوج
[illegible] بول دیا ہے۔ [illegible] کی دھاڑ [illegible] جگہ [illegible]
[illegible] ہے۔ ایسا [illegible] کہ اڑتے ہوئے پرندے بھی گھبرا کر تتر بتر ہو جاتے
ہیں۔ اسی قیامت کی سرزمین میں مہاراج گنج گاؤں واقع ہے جہاں
[illegible] اس خوفناک جنگل میں [illegible] بے خوفی کے ساتھ گھومتے پھرتے
جنگل کے رہنے والے انسانوں کے سینوں میں [illegible] کا دل
[illegible] ہے یا قدرت ان کے [illegible] کو اس قدر [illegible] اور
[illegible] دیتی ہے کہ سانپوں کی پھنکار اور شیروں کی دھاڑ سے بھی وہ متاثر
[illegible] ہوتے۔ ان لوگوں کے قریب سے شیر گذر جاتے ہیں اور ان کے
دل کی دھڑکن میں ذرا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ ان کے متعلق طرح طرح
[illegible] اور مافوق الفطرت باتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ان جنگل
[illegible] والوں کو ایسے منتر یاد ہیں کہ جن کے پڑھتے ہی شیر [illegible]
[illegible] ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ بھوت پریت ان لوگوں کی حفاظت
کرتے ہیں۔ کہیں مشہور ہے کہ جنگل کے درندوں اور جنگلی باشندوں میں
ایک دوسرے کو نہ ستانے کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ درندے
بڑے احسان شناس ہوتے ہیں جنگل کے رہنے والوں کو یہ اپنا پڑوسی
سمجھ کر کچھ نہیں کہتے۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ تو مانی ہوئی بات
ہے کہ درندے ان لوگوں کو مطلق نہیں ستاتے۔ کبھی کبھار گاؤں کی
بکری یا گائے کے پھاڑ ڈالنے کا واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے لیکن انسانی
جان کو گزند نہیں پہنچتا۔ مہاراج گنج کی آبادی مشکل سے پانسو گھر
ہوں گے۔ اس گاؤں میں نیچ ذات کے ہندوؤں سے لیکر اونچ ذات
کے ہندوؤں تک کی ہر قوم آباد ہے۔ مسلمانوں کی آبادی اتنی کم ہے
جیسے آٹے میں نمک۔ اچھوٹے بڑے عورت مرد سب مسلمان مل
ملا کر پچاس سے کچھ کم ہی ہوں گے۔ یہ لوگ گاؤں میں سب سے زیادہ
غریب ہیں۔ مگر غربت اور افلاس نے ان کی شرافت اور غیرت ایمانی
کو متاثر نہیں کیا۔ اسی چھوٹی سی کچی مسجد میں یہ لوگ دن رات میں پانچ
وقت فریضہ نماز ادا کرتے ہیں۔ شام کو جب کہ شیروں کے دھاڑنے کی
آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس کچی اور ٹوٹی پھوٹی مسجد سے اللہ اکبر کی
جلالت خیز صدا بلند ہو کر جنگل کے سناٹے میں ایک عجیب سماں پیدا
کر دیتی ہے۔ اس گاؤں کے ہندو مسلمان بہت ہی گھل مل کر رہتے ہیں
بالکل بھائیوں کی طرح آپس میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ ان درندوں
کے پڑوسی انسانوں کی زندگی تمدن و تہذیب کی گود میں پلے ہوئے
انسانوں کی ذہنیت پر مسکراتی ہے۔

کس قدر خونناک ہے ظلم و تہذیب کا غرور!

ے دوڑے۔ یہ لوگ تیزی کے ساتھ دوڑ کر بشیر کے پاس آ گئے
قریب آ چکا تھا۔ بہت سے لوگوں کو دیکھ کر شیر گھبرا سا گیا۔ وہ تیزی
ے سے زور کے ساتھ گرا۔ اس نے بشیر کی طرف پنجہ اٹھایا
ہٹ گیا۔ شیر کے چند ناخن بشیر کے جسم سے چھو گئے۔ یہ شیر کا
ی ہلکا اور کمزور حملہ تھا۔ مگر شیر اور انسان کا مقابلہ ہی کیا۔ بشیر
ر پڑا۔ اس کا سر پتھر سے ٹکرایا۔ چوٹ تو زیادہ نہیں آئی تھی
اور صدمہ کے اثر سے وہ بیہوش ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ
تھا نہ مہاراج گنج لے گئے۔ ان ہی لوگوں میں مہاراج گنج
برہمن بھی تھا جو گاؤں والوں کا جڑی بوٹیوں سے علاج
ا۔ بوڑھا برہمن بشیر کو اپنے گھر لے گیا۔ اس نے اپنے گھر کی
ے بڑی چارپائی کو کھدر کے روئی بھرے ہوئے گدے
ی گدا زاور نرم سا دیا۔ برہمن نے جنگل کی کسی جھاڑی کے
لکڑی ڈال کر پانی کو گرم کیا اور اسی پانی سے بشیر کے زخموں کو
ہن کی لڑکی منوسا اور برہمن کی بیوی نے بھی برہمن کا ہاتھ بٹایا
بشیر تو دور ہو گئی تھی۔ مگر نقاہت باقی تھی۔ وہ اسی عالم میں را
بستر کا پلنگ برہمن کے مکان کے چھپر میں بچھا ہوا تھا۔ صبح تو
طرح دھوپ پھیل گئی تو بشیر کی آنکھ کھلی اب بشیر بالکل ہوش
تھا۔ نئے مکان کو دیکھ کر اسے وحشت ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ
نئے سے مکان میں ہے۔ ایک بوڑھا برہمن اس کے پلنگ
بیٹھا ہوا ہے۔ اور ایک حسین لڑکی پیڑھی پر بیٹھی ہوئی اس کو
رہی ہے۔ بشیر نے قدرے گھبرا کر کہا۔
ہیں کہاں ہوں؟ ارے　　یہ مکان یہ پلنگ اوں
ں ــــ"!-
سن نے بشیر کو تمام واردات سنائی تو کہیں جا کر بشیر کی گھبراہٹ
بشیر نے بوڑھے برہمن کا ہاتھ تھام کر کہا۔
مہاراج! میں آپ کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ
ہیں"۔
نا نے بشیر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔
ں یہ تو میرا فرض تھا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے

تمام انسانوں کے جسموں میں ایک ہی آتما کام کرتی ہے۔ ایک انسان
کی بھلائی تمام انسانوں کی بھلائی ہے"۔
برہمن کے اشارہ کرنے پر برہمن کی لڑکی منوسا گڑوی میں گرم
پانی لے کر آ گئی۔ بشیر نے پلنگ پر تکیے کے سہارے بیٹھ کر ہاتھ منہ دھویا
اس کے بعد برہمن کی بیوی پھول کے مجھے ہوئے گلاس میں تازہ دودھ
لیکر آئی جس میں گڑ پڑا ہوا تھا گاؤں کا گلاس شہر کے نازک اور خوشنما
گلاسوں سے بڑا ہوتا ہے۔ بشیر آدھا گلاس بھی نہ پی سکا۔ برہمن کے
شدید اصرار پر اُس نے دو چار گھونٹ اور پی لئے۔ برہمن نے صبح سویرے
ایک آدمی بشیر کے ملازموں کے پاس خبر کرنے کے لئے بھیجدیا تھا تھوڑی
دیر میں کئی نوکر آ گئے۔ بشیر نے اپنے کیمپ کو جانا چاہا۔ مگر برہمن نے کہا کہ
دو تین دن میں گھاؤ اچھے ہو جائیں گے اس کے بعد چلے جایئے کیونکہ کیمپ
میں آپ کی ٹہل اچھی طرح نہ ہو سکے گی۔ بشیر برہمن کے گھر رک گیا اور
کوئی چار پانچ دن تک اسی "ہسپتال" میں رہا۔ برہمن کا گھر کروڑوں
روپیہ کی لاگت کے بنے ہوئے ہسپتالوں سے بہت سے زیادہ آرام
دہ ثابت ہوا۔ یہ جس پوس مکان پریم کی دنیا تھی۔ اس گھر کے رہنے
والے بشیر کی خاطر زمین پر بچھے جاتے تھے۔ منوسا جیسی معصوم اور ہمدرد
نرس کس مریض کو میسر آتی ہے۔ منوسا کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ شباب
کی پہلی منزل میں اس نے قدم رکھا تھا۔ منوسا حسین تو زیادہ نہ تھی مگر اس
میں دلکشی بلا کی تھی۔ اس کی اُٹھان بتا رہی تھی کہ پوری جوانی میں یہ
"قیامت مجسم" بن کر رہے گی۔ منوسا کی بھولی باتیں، سیدھی سادی کہانیاں
معصوم شوخیاں بشیر کے لئے بہت زیادہ دلچسپ ثابت ہوئیں۔ منوسا
گھنٹوں بشیر کے پاس بالکل تنہائی میں بیٹھی رہتی۔ یہ سب کچھ تھا مگر بشیر
اس کو "بہن" کہہ چکا تھا۔ وہ بھی بشیر کو "بھائی" کہہ کر پکارتی تھی۔ منوسا کا حسن
لاکھ جاذبِ نظر سہی لیکن بشیر کے لئے وہ حسن اس کی بہن کا حسن تھا اور
بہن کے حسن کو بھائی جن نظروں سے دیکھتا ہے اسے دنیا جانتی ہے۔ برہمن
نے بشیر کی بہت زیادہ خاطر و مدارات کی۔ بشیر گوشت کا بہت شوقین
تھا مگر برہمن کی بیوی کی بنائی ہوئی ترکاری دال کے آگے [illegible]
بشیر چند دن کے لئے ہرن کے کباب اور تیتر کے گوشت [illegible]
نہایت دلچسپی اور شوق کے ساتھ [illegible]

[illegible] نے بڑی [illegible] تبدیلی محسوس کی۔ برہمن کے گھر کے آم کے اچار کو
بعد اس کے گھر سے جانے کے بعد بھی یاد کرتا رہا۔ اچار کیا تھا چٹخارہ کا
پھوڑ تھا۔!

بشیر نے برہمن کے گھر سے رخصت ہوتے وقت پانچ روپیہ برہمن کی لڑکی منورما کو دینے چاہے۔ مگر برہمن نے واپس کر دیئے۔ بشیر چند دن جنگل میں رہا اس کے بعد مکان چلا آیا۔ اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے یہاں تک کہ بشیر انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پولس ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گیا اور ٹریننگ کا زمانہ ختم کرنے کے بعد وہ سب انسپکٹر بن کر ضلع بہرائچ کے کسی تھانہ میں متعین ہو گیا۔ برہمن کی لڑکی منورما اب سولہ سال کی ہو چکی تھی۔ گاؤں کے زمیندار ہرنام سنگھ کی اس پر نظر تھی۔ ہرنام سنگھ نے منورما کو پھانسنے کی بہت کچھ کوشش کی لیکن منورما کی معصومیت کو کوئی لالچ اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔ ہرنام سنگھ نے منورما کے باپ پر بھی ڈورے ڈالے مگر بوڑھا برہمن اس پاپ کے لئے کسی طرح تیار نہیں تھا ظالم اور ہوس پرست کو جب اپنے مقصد میں ناکامی ہوتی ہے تو اس کی ہوس اور ظلم کی آگ اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے ہرنام سنگھ نے ہر طرح منورما کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ موقعہ کا منتظر تھا۔ ایک دن منورما کا باپ تحصیل میں کسی مقدمہ کی پیروی کے لئے گیا ہوا تھا۔ منورما صبح سویرے کھیتوں کو دیکھنے کے لئے جایا کرتی تھی۔ ہرنام سنگھ سواریوں کا پہلے ہی سے انتظام کر چکا تھا۔ منورما کو اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعہ کھیت سے پکڑوا کر رتھ میں سوار کروا دیا۔ اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر [illegible] جا پہنچا۔ منورما نے بہت کچھ ہاتھ پیر ہلائے مگر چار مشٹنڈوں کی گرفت سے وہ کس طرح چھٹکارا پا سکتی تھی۔ رتھ کے بیل بہت ہی مضبوط تھے صبح سے شام تک رتھ برابر چلتا رہا۔ ہرنام سنگھ گھوڑے پر سوار تھا۔ شام کے وقت مہاراج گنج سے بہت دور جا کر رتھ رکا۔ جہاں جامنوں کے درختوں کے جھنڈ میں ایک پیاؤ تھی پیاؤ کے قریب چھوٹی سی دھرم شالہ بنی ہوئی تھی اور دھرم شالہ کے دروازے پر پان سگریٹ اور کھانے پینے کی چند [illegible] دکانیں تھیں۔ یہ مقام بشیر کے علاقہ میں شامل تھا۔ بشیر کسی [illegible] تحقیقات کر کے یہاں آرام کرنے کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ اتنے [illegible] گھوڑے سے اتر کر رتھ کے قریب گیا۔ رتھ سے۔ رونے کی دردناک آواز آ رہی تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں سسرال جاتے ہوئے عام طور پر رویا کرتی ہیں اسلئے بشیر نے رونے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ہرنام سنگھ نے رتھ کے قریب جا کر کچھ پوچھا اس پر رتھ سے آواز آئی۔ "ایشور کے لئے مجھے چھوڑ دو میں ہاتھ جوڑتی ہوں"۔

اس پر بشیر کے کان کھڑے ہوئے۔ بشیر ایک تو پہلے ہی سے ذہین اور ولس تھا پھر پولس کی نوکری نے اس کو اور زیادہ چالاک بنا دیا تھا۔ اس نے ہرنام سنگھ سے پوچھا "اس رتھ میں کون ہے؟"۔

ہرنام سنگھ نے ذرا رک کر اور گھبرا کر جواب دیا "اس میں میری بیوی ہے۔ آپ کیوں پوچھتے ہیں"!۔

ہرنام سنگھ کی گھبراہٹ نے بشیر کے شبہ کو اور زیادہ قوی کر دیا اس نے ذرا تیز لہجہ میں دریافت کیا "تمہاری بیوی ہے اس رتھ میں۔! لیکن تمہاری تو پچاس سال سے کچھ اوپر عمر ہو گی۔ یہ کیسے ٹھیک [illegible]

ہرنام سنگھ نے اس پریشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا "جی نہیں۔ ذرا سی غلطی ہو گئی۔ میرے لڑکے کی بیوی ہے اس رتھ میں"!۔

بشیر کی [illegible] پڑھ چکی تھی۔ اور اس کا شبہ حقیقت کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے ڈنڈے سے رتھ کا پردہ الٹ دیا اس نے دیکھا کہ وہی لڑکی جس کے باپ نے اس کی تیمارداری کی تھی۔ رتھ میں بیٹھی ہوئی آنسو بہا رہی ہے۔ بشیر نے رتھ کے پہیے پر پیر کا زور دے کر کہا "تم ہو بہن منورما تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں تمہارا بھائی بشیر ہوں [illegible] اور جو تمہارے گھر کئی دن تک تھا"

"منورما" بھائی تم ہو" کہہ کر بشیر سے لپٹ گئی۔ بشیر نے اس کو تسلی دی۔ اس [illegible] بشیر سے ایک چوک ہو گئی۔ وہ منورما سے باتیں کرنے میں محو ہو گیا۔ ہرنام سنگھ کو جو موقعہ ملا تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو گیا۔ بعد میں اس کا وارنٹ بھی جاری ہوا مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ بشیر نے منورما کو حفاظت کے ساتھ اس کے گھر پہنچا دیا۔ اس واقعہ کے چھ مہینے کے بعد منورما کی شادی ہو گئی۔ جس میں بشیر نے بھائی کی طرح حصہ لیا۔ منورما جب سسرال جانے لگی تو بشیر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ذوقِ عمل!

از محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ لودیانوی گولڈ میڈلسٹ

زبانِ حال سے کہتی ہیں موجیں نوجوانوں سے
جنھیں ذوقِ عمل ہے سر ٹپکتے ہیں چٹانوں سے

مسلماں کے امانت دار ہونے میں کسے شک ہے
خدا نے اس کو فرمایا ہے اپنے رازدانوں سے؟

تن آسانی کی حسرت کیا کہو لیجائے گی جنت میں
مسلمانوں کو ورنہ کیا غرض ان بوستانوں سے؟

وہ انساں اپنا میرِ کارواں ہے، کارواں والو
جو آگے بڑھ گیا جبریل جیسے ہمعنانوں سے؟

چمن میں ہم نے کچھ ایسے قرینے سے چنے تنکے
نکل کر آئے طائر دیکھنے سب آشیانوں سے؟

اجل نے مجھکو مہلت دی تو پہلا کام ہے میرا
تجھے آگاہ کرنا تیری منزل کے نشانوں سے؟

بگاڑی اپنے ہاتھوں آپ تعمیرِ حرم تم نے
کوئی اے زیب کیا پوچھے حرم کے پاسبانوں سے

ہندی اور عربی کے ہم معنی اشعار

ایک بلند پایہ علمی و تحقیقی مقالہ

(از جناب شمس العلما مولانا محمد امین صاحب عباسی چڑیاکوٹی مولوی فاضل پروفیسر عربی اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج ڈھاکہ)

مدت سے میرا خیال تھا کہ عربی اور ہندی کے [illegible] کو یکجا کروں جن میں معنوی مماثلت ہو لیکن [illegible] وقت کی نایابی ہی۔ اسی لئے میں بوجہ فرائض منصبی اور دیگر مشاغل علمی کے اس کام کو سرانجام نہ دے سکا۔ تاہم اس موضوع کے [illegible] جو کچھ سرسری طور سے جمع کرسکا۔ اس کو شائع کرتا [illegible] دلچسپی [illegible]

قبل اس کے کہ میں ان اشعار کو لکھوں۔ ہندی شعر کے نقطہ نظر سے حقیقت شعر اور شاعری سے بحث کرنی ضروری سمجھتا ہوں اسی کے ساتھ عربی علماء بلاغت کی آراء کو بھی مختصر طریقہ سے لکھوں تاکہ اس کے متعلق دونوں کی آراء کا موازنہ ہو۔

مسلمانوں نے جو کچھ شاعری کے متعلق لکھا ہے وہ علم معانی و بیان کے ضمن میں لکھا ہے۔ اشعار کا جہاں تک وزن سے تعلق ہے۔ وہ علم العروض تک محدود ہے۔ علم العروض میں ان اوزان کو جمع کیا گیا ہے جو شعراء عرب میں بکثرت مستعمل تھے۔ بقیہ اصناف کلام کو جن کا تعلق فصاحت اور بلاغت سے ہے علم معانی اور بیان میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ تمام قواعد کو اصول کلی کے تحت میں لایا جائے۔ مسلمانوں نے شاعری اور بلاغت دو جداگانہ چیزیں قرار دی ہیں۔ [illegible] یونانیوں کا مسلک ہے۔ اور عروض کو ایک الگ فن قرار دیا ہے۔

ہندو مصنفین نے شعر کی تعریف میں کسی جذبہ کا اظہار [illegible] شعر قرار دیا ہے۔ وزن و قافیہ کو حقیقت شعر سے الگ کر دیا ہے۔ اور نہ دونوں ان کے نزدیک حقیقت شعر میں داخل ہیں۔ بلکہ وزن و قافیہ کا تعلق جیسا کہ یونانیوں کی رائے ہے گانے سے ہے۔ جو عبارت تحریک جذبات کرے۔ ان کے نزدیک صنعت شعر میں داخل ہے خواہ اس میں وزن و قافیہ ہو یا نہ ہو۔ [illegible] نے وزن و قافیہ کو شعر کا جزو لازم قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قید نے شعر کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کی ورنہ جہاں تک جذبات سے تعلق ہے نظم اور نثر دونوں ہی سے تحریک جذبات ہوتی ہے اس میں نثر کو بھی داخل کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہندو مصنفین نے لفظ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک آواز [illegible] جو بات چیت سے پیدا ہوتا ہے [illegible] جس کو انسان تلفظ کرتا ہے جیسے ج۔ د۔ ب۔ ل۔ س وغیرہ۔ شاعر کے سامنے دو چیزیں اہم ہیں۔ ایک تحریک جذبات۔ دوسرے الفاظ پر قدرت کہ کس قسم کے جذبہ کے اظہار کے لئے کون سا لفظ درست ہے اس کے لئے سب سے مقدم الفاظ اور اس کی ترتیب کا علم ہے۔ [illegible] کو ہندی میں کوی کہتے ہیں۔ اس لفظ کا مادہ [illegible] ہے جس کے معنی [illegible] اس سے لفظ کاو بنا ہے کوی کے معنی الفاظ کو مناسب ترتیب دینے والا۔ لہذا شاعر کو الفاظ اور

لغات پر کافی اطلاع کی ضرورت ہے جس کے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی شاعر نہیں ہو سکتا۔ اس کی تفصیلی بحث آئندہ ہوگی، اسی لحاظ سے عربی مصنفین نے معانی اور بیان کو اصل قرار دیا ہے۔ اسی ترتیب الفاظ پر اظہار جذبات کا دارومدار ٹھہرایا ہے۔ اس ترتیب الفاظ کے مدارج بھی ہیں۔ جو دو حدود کے اندر محدود ہیں ایک حد اعلیٰ جو کمال بلاغت ہے۔ یہ اپنے کمال میں حد اعجاز کو پہنچتی ہے۔ جو انسانی دسترس سے باہر ہے۔ جس کا نمونہ کلام الٰہی قرآن پاک ہے۔ دوسری حد وہ ہے۔ جس میں کلام دیوانوں کی بڑ کے ... ہوتا ہے اور یہ حد انتہائے رذالت ہے۔ انہیں دو حدود کے اندر تمام مدارج ہیں جن کے اعتبار سے صناعت شعر جیّد و ردی ہوتی ہے۔ اور اسی اعتبار سے کہنے والے کی مدح ہوتی ہے۔

چونکہ شعرائے عرب نے وزن اور قافیہ کو حقیقت شعر میں داخل کیا ہے اس لئے ہر عربی شعر میں وزن اور قافیہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ متقدمین نے اس کو حقیقت شعر میں داخل نہیں کیا ہے یونانیوں کے نزدیک وزن و قافیہ اشعار میں ضروری تھا۔ اس وجہ سے کہ اس کی مواظبت سے گانے میں سہولت ہوتی ہے۔ اور راگوں کے ساتھ مطابقت۔ چنانچہ ارسطو کے نزدیک وزن کی کوئی اہمیت نہیں بخلاف اس کے افلاطون نے اس کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے یہ قانون فطرت ہے کہ وزن اور قافیہ کو تحریک جذبات میں بڑا دخل ہے جس طرح ڈراما سے آنکھوں کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح وزن اور قافیہ سے کانوں کو حظ ہوتا ہے۔ ہندوؤں کا ایک مشہور قول ہے "کاویہ ایشو ناٹکم شریشٹھم" یعنی اشعار پر ناٹک کو ترجیح ہے۔" ہندو اور عربی مصنفین نے اصول شاعری اور ترتیب الفاظ اور اسلوب کلام کو جس سے تحریک جذبات ہو، بلاغت کا حصہ قرار دیا ہے اور اشعار کو جہاں تک وزن اور قافیہ سے تعلق ہے۔ علم عروض میں شامل کیا ہے اور اس کو ایک مستقل فن بنایا ہے۔ اسی طرح حرکات اعضا و جوارح کا تناسب اس طرح کہ اس سے کسی خاص حالت کی تصویر کھنچ جائے۔ فن رقص سے تعلق رکھتی ہے۔ اس پر سنسکرت میں مستقل تصانیف ہیں۔ اس فن میں مسلمانوں کی کوئی تصنیف اب

تک میری نظر سے نہیں گذری۔ اور نہ اس کا کوئی ذکر کسی کتاب میں نظر آیا۔

ابوالفرج قدامہ بن جعفر اپنی کتاب نقد الشعر میں لکھتے ہیں کہ "شعر لفظ موزوں مقفیٰ دلالت کرنے والا ایک معنی پر۔ یہ تعریف جنس شعر سے ماخوذ ہے۔ جو عام ہے۔ اور شعر کو دوسرے کلاموں سے جدا کرتی ہے۔ لہٰذا ان امور کا شعر میں پایا جانا ضروری ہے۔ جیسا کہ تعریف کا حال ہے۔ مثلاً انسان کی تعریف زندہ ناطق اور مرنے والا ہے۔ اس تعریف میں حیات جنس انسان ہے جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے جس سے وہ احساس کرتا ہے یا حرکت کرتا ہے۔ اسی طرح نطق فصل ہے۔ جو دوسرے جانداروں سے انسان کو جدا کرتی ہے۔ اور اس میں موت کی ... کا ہونا اسی طرح ... ہے جس طرح نطق کا ہونا ... انسان کی حقیقت ... کے مخصص نہیں ہو سکتی۔ شعر کی ... جس کا ... لفظ ... حروف سے ہوتی ہے۔ جو مخارج سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی طرح وزن۔ قافیہ۔ اس کے اصول ہیں جن میں یہ باتیں پائی جائیں وہ شعر کہا جائے گا۔ اگر کسی کلام میں یہ باتیں نہ ہوں۔ تو وہ شعر نہیں کہا جا سکتا" اس سے ظاہر ہوا۔ کہ شعر کی حقیقت انہیں چار چیزوں سے متحقق ہوتی ہے۔ یعنی لفظ۔ معنی۔ وزن۔ قافیہ۔

الفکار شیکھر میں لکھا ہے "جس کلام سے تحریک جذبات ہو۔ وہ شعر ہے" سلهسه درپن میں لکھا ہے۔ کہ "واکیہ رساتمکم کاویم" (جذبات سے بھرا ہوا کلام شعر ہے) سرسوتی کنٹھا بھرن میں مہاراج بھوج لکھتے ہیں۔ کہ "جو کلام بے عیب ہو۔ اس میں کوئی صفت پائی جائے۔ اور صنائع اور بدائع پر مشتمل ہو۔ وہ شعر ہے۔" واگ بھٹ الکار یہ کوی لکھتے ہیں۔ کہ "صحیح الفاظ اور معنی سے حاصل شدہ صفت، صنعت سے آراستہ کسی رس (جذبہ)، کا شمول کلام کاویہ (شعر) ہے۔ وامن جی مہاراج لکھتے ہیں کہ بے عیب صفت اور صنعت کے مجموعہ الفاظ کو کاویہ (شعر) کہتے ہیں۔ کاویہ درش میں ڈنڈی کوی لکھتے ہیں کہ "معنی مقصود کو ظاہر کرنے

ہیں۔ یہ تو ممٹ اور نہ بین صاحب وغیرہ انگریزی شعرا اس نظریہ کے کسی تشفی بخش حل تک پہنچ سکے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ موجودہ زمانہ میں اس کا کوئی حل ہو۔

یہ بھی غور طلب مسئلہ ہے۔ کہ جوش پیدا کرنے والے۔ عقب پیدا کرنے والے، اور لطف پیدا کرنے والے مضامین کو شعر کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ شعر کی حقیقت میں جوش آئیدہ ہونا داخل کیا گیا۔ اگرچہ اس کا جواب مسٹر میکس ہارڈن نے اپنی کتاب "ڈی جنریشن" میں دیا ہے۔ اور اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ جواب کسی مفید حل تک نہیں پہنچا۔

ایک اور مسئلہ قابل لحاظ ہے۔ کہ کاویہ یعنی بلاغت شاعری کو دوسرا درجہ دیتی ہے۔ بلاغت میں شاعری کا دوسرا مرتبہ رکھا گیا ہے۔ اگرچہ مغرب میں وزن اور اس سے کمتر درجہ میں تو یہ شعر کا سردا اہم سمجھا گیا ہے ہر وقت ہیں ۔۔۔ اس ۔۔۔ کا حال ۔۔۔ ملتا ہے۔ ۔۔۔ ڈراما کو ایک حد تک شاعری کی ایک قسم تسلیم کرتا ہے۔ مسٹر والٹ ۔ مسٹر وہٹ ۔ مسٹر میں اور اس کے متبعین اسکو عملاً صحیح مانتے ہیں۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا۔ کہ یہ خیال اصولاً صحیح ہے لیکن عملاً شعر میں وزن اور قافیہ کی قید شعر کی خوبی میں ایک ناگوار اضافہ ہے۔ جس سے شعر کی ترقی میں رکاوٹ پڑ[تی] ہے۔ اسی طرح مسجع عبارت ڈراما میں اگرچہ اس کی خوبی کو بڑھاتی ہے [لیکن] پھر بھی ایک زائد چیز ہے مالبسہ زیادتی کانوں کی لذت کو بڑھاتی ہے جس طرح ڈراما کے مناظر آنکھوں کو۔ سنسکرت میں ایک مشہور مقولہ ہے "کاویہ ایشوناٹکم تر ریشٹم" یعنی اشعار پر ناٹک کو ترجیح ہے

بعض مصنفین نے اس امر سے اختلاف کیا ہے۔ کہ شعر کا انبساط خاطر ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ شاعر ایک انسان ہونے کی حیثیت سے کون سا مقصد پیش نظر رکھتا ہے۔ اور شعر کو شعر ہونے [کی حی]ثیت سے کیا ہونا چاہئے۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاعر اپنے معتقدات کو دوسروں کے ذہن نشین کرنے اور اس کو منوانے کا ذریعہ شعر کو بناتا ہے۔ اس [لی]ئے شعر کا مقصد دوسروں پر اثر ڈالنا ہے۔ لیکن اگر شعرا کے ذاتی مفاد

کو حقیقت شعر کا ایک جزو قرار دے دیا جائے۔ تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ شاعر کی ذاتی شہرت یا اس کے جذبات کا اظہار شعر کا مقصد ہے۔ جبکہ سنسکرت کے مصنفین ممٹ وغیرہ کا خیال ہے شعر کے حسن اور قبح کا سب سے بہتر معیار یہی ہو سکتا ہے۔ کہ صحیح المذاق آدمی کے دل میں جس شعر سے لذت پیدا ہو۔ وہی بہتر شعر ہے۔ عام اس سے کہ دیگر اغراض اس سے حاصل ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر کسی شعر سے صحیح المذاق سننے والے کے دل میں کوئی انبساط پیدا نہ ہو۔ وہ بہتر شعر کہے جانے کا مستحق نہ ہوگا۔ چاہے اس سے دوسرے اغراض حاصل کیوں نہ ہوں۔ یا وہ صنائع لفظی و معنوی کا جامع کیوں نہ ہو۔

شعرا پنے مرتبہ کمال میں مختلف شاعرانہ تخیل کی ترقی کا معاون ہوتا ہے۔ جس کے الفاظ کی تاثیر اس کے ظاہری معنی کی تاثیر سے بڑھ جاتی ہے۔

یہاں ایک شبہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ نظریہ حسن اسلوب کے سوال کے ساتھ کہاں تک مطابق ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں کہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ شعر کا مدعا تو تخیل ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ اگر یہی امور شعر کی عام سطح قرار پائیں۔ تو پھر شعر کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کا دارومدار محض تخیل کی حالت اور کیفیت پر منحصر ہوگا جس سے شعر حاصل ہوا ہے۔

قطع نظر بعض فرانسیسی محققین کی توجہ کے جنہوں نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ اگر کوئی کلام وزن سے خالی ہو۔ تو وہ بھی شعر کہا جا سکتا ہے۔ (یہ اصول ارسطو کی بوطیقا کی ایک عبارت کی غلط تعبیر سے مستعار ہے) یہ رائے جمہور کے فیصلے کے خلاف ہے۔ کسی عبارت نثر کو عام اس سے کہ وہ اچھی ہو یا بری یہی لوگ شعر کہتے ہیں جو کوئی قیاس مفید اس کے متعلق نہیں رکھتے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ جو کلام عام گفتگو میں استعارات و کنایات سے مملو ہو۔ لیکن اس میں شعر کی خصوصیات نہ پائی جائیں۔ اس کو ہم شعر نہیں کہہ سکتے۔ جیسے ہم کسی شخص کو جس میں مذکر و مؤنث ہونے کے صفات نہ پائے جائیں۔ انسان نہیں کہہ سکتے۔

نظم نثر سے صرف اسی وجہ سے جدا نہیں ہے۔ کہ نظم میں ایک

کی کلفتوں کی تصویر کھینچنا اس کو وہ لوگ اپنی ناواقفیت یا تعصب سے حقیقت پر محمول کر کے معشوق کو بری صورت میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً غالب نے کہا ہے۔ کہ ؎

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

اس کے معنی نادان یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ غالب کا معشوق اس قدر مخالف اور بے پروا ہے۔ کہ غالب ہر چند کوشش کرتا ہے۔ کہ معشوق اس کی طرف متوجہ ہو۔ اور اس کو جو قتل کرنے کی عادت ہے اور اس سے اس کو لطف آتا ہے۔ تو یہ ان تمام سامانوں کو مہیا کر کے جاتا ہے۔ کہ معشوق قتل کرنے کی فطری ذوق سے اس کا سامان دیکھ کر قتل کے لئے آمادہ ہوگا دوسرے یہ بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس طرح غالب کئی بار بار معشوق کے پاس اپنے قتل کئے جانے کے لئے گیا۔ لیکن ایک بار تو اس نے یہ حیلہ کیا کہ میرے پاس قتل کرنے کا کوئی آلہ نہیں۔ تجھ کو کیونکر قتل کروں تو غالب نے یہ جواب دیا۔ کہ قتل کرنے کے لئے کسی مخصوص آلہ کی حاجت نہیں۔ گلا گھونٹ کر مار ڈالو۔ اس نے نہیں مانا۔ اور اس نے یہی کہا کہ میں تو عشاق کو بجز تلوار کے اور کسی آلہ سے قتل نہیں کرتا۔ مجبوراً غالب کو واپس آنا پڑا۔ دوسری بار تلوار لے کر گیا۔ تب اس نے یہ کہا۔ کہ میرے پلے اتنے ٹکے نہیں ہیں۔ کہ میں تمہارے لئے بازار سے کفن خریدوں اور بری طرح تم بھی لاوارث ہی ہو۔ کہ تمہارے اعزہ تمہارے قتل ہونے کے بعد تمہارے تکفین کا سامان کریں۔ اس لئے تمہارے قتل کرنے کے لئے میرے پاس کوئی سامان نہیں۔ اور میرا نقصان ہے۔ مجھ کو مفت میں حرج کرنا پڑے گا۔" لہذا تیسری بار غالب تلوار اور کفن دونوں لیتا گیا۔ کہ اب وہ کیا عذر کرے گا۔ اسی سے یہ مطلب بھی نکلا کہ معشوق اپنے عشاق سے فرمائش بھی کیا کرتا ہے۔ جیسا کہ اس نے غالب سے کہا۔ جاؤ گھر سے تلوار اور کفن دونوں لیتے آؤ۔ یہ تمام سوال و جواب اس کے اس مصرعہ سے نکلتے ہیں۔ کہ ع

"آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں"

آج کے لفظ سے یہ نکلا کہ اس سے پہلے ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔ جس میں اس نے عذر کیا تھا۔ دوسری بار وہ کفن کا حیلہ کرتا ہے۔ تو تیسری بار وہ یہ کہتا ہے۔ کہ آج تیغ و کفن دونوں لے کر جاتا ہوں۔ تاکہ کوئی عذر کا موقع نہ رہ جائے۔ اب رہا یہ مضمون کہ وہ عشاق سے کیا فرمائش کرتا ہے۔ یہ دوسرے مصرعہ سے نکلتا ہے۔ کہ ع

"عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟"

اس عذر سے حقیقتاً حسن طلب ہے کہ اپنے گھر سے تلوار اور کفن لیتے آؤ۔ اگر طلب کی عادت مستمرہ معشوق میں نہیں ہے۔ تو خواہ مخواہ غالب سے تلوار اور کفن کی فرمائش میں اس کو کچھ حجاب ہوتا۔ لیکن حجاب کا نہ ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اکثر اپنے عشاق سے فرمائش کرتا ہے اور اس فعل کے بار بار وقوع میں آنے سے اب شرم باقی نہیں رہی۔

اس تاویل سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ اس کا یہ کلام جو تصویر جذبہ بیخودی میں کتنا ملیح ہے۔ کتنا مہمل ہوگیا۔

متنبی کا یہ شعر جو نہایت بلیغ سمجھا جاتا ہے ؎

أمِنَ ازدِيارَكِ فِي الدُّجَى الرُّقَبَاءُ
إِذْ حَيْثُ كُنْتِ مِنَ الظَّلَامِ ضِيَاءُ

(ترجمہ) اندھیری رات میں تیرے نگہبان تیرے اپنے عشاق سے ملنے سے بےخوف ہو گئے۔ اس لئے کہ جس جگہ اندھیرے میں تو ہوگی وہاں روشنی ہوگی اور تو چھپ نہ سکے گی۔ اس لئے کہ تیرا بدن یا تیرا چہرہ چاند کی طرح روشن ہے۔ جو اندھیرے میں چھپ نہیں سکتا۔

اب سنئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ متنبی کی معشوقہ نہایت آوارہ تھی۔ راتوں کو چھپ چھپ کر اپنے آشناؤں سے ملنے جاتی تھی۔ تو اس کے ورثاء کو جب معلوم ہوا۔ تو ان لوگوں نے اس کی نگرانی کے لئے دروازوں پر پہرہ دینے والوں کو مقرر کر دیا۔ تاکہ وہ نکلنے نہ پائے۔ خود ورثا کی نگرانی کافی نہ تھی۔ مجبوراً کچھ لوگ اس کی نگرانی کے لئے اور بھی مقرر کر دیئے۔ تاکہ کسی روز اپنے ورثا اور اعزہ کی نظر بچا کر نکل کر بھاگ نہ جائے۔ چونکہ وہ خوبصورت بہت ہے۔ اس لئے اس کے عشاق بہت ہیں۔ اور بارہا بھاگ چکی ہے۔ جس کی وجہ سے پہرہ بٹھانا پڑا۔

.. اس سے نتیجہ نکلا کہ متنبی کی معشوقہ نہایت فاحشہ بےحیا اور آوارہ ہے۔ غرضکہ عورت کے لئے جتنے بدترین صفات ہو سکتے ہیں۔ وہ سب اس میں موجود ہیں یا دیوانی ہے۔ کہ اکثر گھر سے نکل کر بھاگ جایا کرتی

ہے۔ دن کو تو کافی نگرانی ہو سکتی ہے۔ لیکن رات چونکہ آرام کا وقت ہے۔ لوگ اکثر سو جاتے ہیں۔ اور کافی نگرانی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مجبوراً پہرہ دینے والوں کو مقرر کرنا پڑا۔ لیکن چونکہ وہ خوبصورت بہت ہے۔ اس کا چہرہ چاند کی طرح روشن ہے۔ اس لئے پہرہ والوں کو اس کی نگرانی میں تھوڑی آسانی ہے۔ کہ گھر سے نکلتے ہی پکڑی جائے گی۔

اب دیکھنا چاہئے۔ کہ اس ناول سے اتنا بلیغ شعر کس قدر مہمل اور بے ہودہ ہوگیا۔ ایک شاعر کہتا ہے۔ کہ ؎

"گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد اپنی زندگی ہے"

اس سے معلوم ہوا۔ کہ شاعر یہ دکھانا چاہتا ہے کہ اس کو اپنی عمر میں صرف ایک دن ایسا نصیب ہوا تھا کہ اس میں وہ خوش تھا لیکن وہ کوسی خواہش تھی جس کے حصول سے اس کو تھوڑی دیر کے لئے مسرت حاصل ہوئی۔ اس کو وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ ممکن ہے کہ والکنایۃ ابلغ من التصریح۔ پر عمل کیا گیا ہو۔ اس لئے کہ اسی خوشی تو کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کسی امر لذت خوشی حاصل ہوگی۔ یا کسی مدعا کے حصول سے خوشی ہوگی۔ کوئی صورت بھی ہو معنی یہ مضمر ہے کہ اس خوشی کی چند گھڑیاں کو یاد کر کے ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور اسی کی یاد کھانا، پینا، سونا، جاگنا، ہم سب زندگی کی ضروریات ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی چیز کس قدر ملائے سرور ہوگی۔ جس کی وجہ سے تمام زندگی بیکار ہو جائے۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ ویسی خوشی زندگی بھر پھر کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ اب صرف اس کی یاد باقی ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس یاد سے اگر مسرت ہوتی ہے۔ تو جب خوشی کی وہ گھڑیاں یاد آتے ہی خوشی ہوتی ہے۔ تو پہلے مصرعہ کا حصہ باطل ہوتا ہے۔ اور اگر اس سے مسرت نہیں ہوتی۔ تو اس کی یاد بیکار ہے۔ اور وہ مایۂ حیات نہیں ہو سکتی۔ آیندہ کسی موقع پر اس کے متعلق مفصل لکھا جائے گا۔

کاویہ پرکاش صفحہ ۹ میں بھٹ نایک کی رائے بصورت متن کے اس عمل کے متعلق کہ رس کا ظہور یا اس کا ارتقا ہیج اور تعبیر اور معاون کے ارتباط سے حاصل ہوتا ہے" یہ ہے کہ ڈراما میں تین افراد ہو سکتے ہیں۔

ایک ہیرو۔ دوسرے مثل (ایکٹر) تیسرے دیکھنے والے۔ اب دیکھنا چاہئے۔ کہ رس کا تعلق کس سے مانا جائے۔ اگر ہیرو سے تعلق مانا جائے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حوادث اسی کی محاکات ہیں۔ اور حکایت سے محکی عنہ سے متعلق ہونا لازم ہے۔ ورنہ حکایت کا وجود باقی نہیں بلکہ اس کا یقین ہوگا۔ اور حکایت نہیں رہے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہاں ہے ناقل ہے۔ اصل نہیں ہے۔ اسی طرح ایکٹر میں بھی رس کا وجود مانا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ ہیرو موجود نہیں جس میں وہ مخصوص صفت پائی جاتی ہے۔ اور موصوف موجود نہیں۔ محبت مخصوصہ حسن کو ہیرو کی ذات سے تعلق ہے۔ یک عرض ہے۔ عرض کا وجود [illegible] ہو سکتا ہے۔ [illegible] ایکٹر میں اس کیفیت کا وجود [illegible] نہیں جا سکتا [illegible] حرکات [illegible] کا [illegible] ہوتا ہے۔ البتہ رس حدیہ [illegible] میں شامل ہوتا ہے۔ جو شاعری اور ڈراما میں مذکوروں سے پایا جاتا ہے۔ ایک عام۔ دوسری تخصیص لذت عمومی صورت میں بلا لحاظ کسی خاص کے نوعی خصوصیات کے جذبہ محبت کو عمومی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہیرو کو مطلق مرد و ہیروئن کو مطلق عورت فرض کر کے ان کے جذبات کو [illegible] جذبات کو عمومی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور ان کی حرکات [illegible] کو مرد اور عورت کے حرکات [illegible] ہوتا ہے۔

دوسرے قوت (لذت بخش) کا عمل ہے۔ کہ یہ عشق عاشق و معشوق کے حرکات سے مفہوم کلی کی شکل میں مستنبط ہوتا ہے قلب کی [illegible] کے تسلط سے حاضرین کے جذبات کو روشن کر دیتا ہے۔ اور اس جذبہ کی [illegible] لذت کا ادراک کرا دیتی ہے۔ تماشائیوں میں [illegible] مخصوص لذت کا پیدا ہونا رس کہلاتا ہے۔ یہی چیز شاعری میں [illegible] ملحوظ ہے مثلاً ایک عربی شاعر کہتا ہے۔ کہ ؎

امَاتِمِ النُّرَدِ يُقِظُ رَاعِيَ السَّمَرِ
لَعَلَّ بِالْجِزْعِ اَعْوَانًا عَلَى السَّهَرِ

ترجمہ: اے شب بیدار بجلی سے سوئے ہوئے ببول کے درخت کو

جگا دے۔ شاید اس بیقراری میں بیخوابی کی مدد ہو جائے۔ یہاں شاعر تحریکِ جذبۂ عشق کے لئے ایک تصویر کھینچ رہا ہے کہ ایک عاشق کو عشق کی بیتابی سے نیند نہیں آتی۔ رات زیادہ گذر گئی۔ سنسان میدان ہے۔ جہاں کسی انسان کی تو کیا کسی جانور کی بھی کوئی آواز نہیں ہے اور کسی شے کی کوئی آہٹ معلوم نہیں ہوتی۔ اور نہ حدِ نظر تک کسی چیز کی کوئی شکل دکھائی دیتی ہے۔ بجز چند ببول کے درختوں کے جو اس سنسان میدان میں سوئے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ یا کبھی کبھی بجلی اس اندھیری رات میں کوند جاتی ہے۔ یہی ایک چیز ہے۔ جو اس تیرہ و تار رات میں کبھی کبھی نظر آجاتی ہے۔ وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے اور پھر نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اس لئے شاعر اپنی تنہائی سے عاجز ہو کر بجلی کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ کہ "اے برق! ان سوئے ہوئے ببول کے درختوں کو جگا دے۔ کہ ان کی بیداری سے مجھے تسکینِ خاطر ہو اور میری بیخوابی میں انہیں سے کچھ مدد ملے"۔

شاعر نے تحریکِ جذبات کے لئے ان چیزوں کو مہیا کیا۔ جو عرب کی بدویانہ زندگی میں محرکِ جذبات ہوا کرتی ہیں۔ یعنی صحرا۔ سنسان میدان۔ اندھیری رات۔ ببول کے درختوں کا جھنڈ۔ خلاف اس کے ایک ہندی شاعر اپنی بیخوابی اور ہجر کی تکلیف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔ اور اس کے معدات جمع کر کے تحریکِ جذبات کرتا ہے۔

"اے ماں پپیہا پھر بولا۔ نیند جاتی رہی خیالات نے دل میں ہجوم کیا معشوق کی یاد دل میں آئی۔ ساون کا مہینہ ہے۔ بادل چھایا ہوا ہے۔ پانی برس رہا ہے۔ اٹھ کر بیقراری سے آنگن میں دوڑی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ بجلی کوند رہی ہے۔ جس سے (تنہائی کی وجہ سے) ڈر معلوم ہو رہا ہے۔ کسی نے ملار کا راگ (جو بارش کے وقت گایا جاتا ہے) الاپا۔ کسی نے خوش آیند بانسلی بجائی۔ اے سرود اس ہجراں نصیب حیراں ہو کر زمین پر گر گر کر بیہوش ہو رہی ہے"۔

یہاں شاعر ہند کی طرزِ معاشرت کو پیشِ نظر رکھ کر تحریکِ جذبات اس صورت میں کر رہا ہے۔ کہ ایک ہجراں نصیب عورت اپنے محبوب کی جدائی سے مضطرب اور بے چین ہے۔ رات کا وقت ہے۔ اس لئے وہ کہہ رہی ہے۔ کہ نیند جاتی رہی۔ بیخوابی کی تکلیف رات کو ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات کا وقت ہے۔ جس کی شاعر نے تصریح نہیں کی۔ بلکہ اس کو اشارات اور کنایات سے ظاہر کیا ہے (الکنایۃ ابلغ من التصریح)۔ پانی برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ عالمِ تنہائی ہے۔ جس سے وہ خوف زدہ ہو رہی ہے۔ کسی نے ملار راگنی گائی۔ کوئی بانسری بجا رہا ہے۔ پپیہا بھی کبھی کبھی بولتا ہے۔ شاعر نے تین چیزوں کو محرکاتِ جذبات میں ذکر کیا ہے۔ ایک ملار کی راگنی جو بارش کے وقت گائی جاتی ہے۔ اور یہ راگنی محرکاتِ جذبات میں بہت بڑی محرک سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے بانسری۔ تیسرے پپیہے کی آواز۔ ملار کا راگ اور بانسری کی آواز اور پپیہے کا شور اس حالت میں۔ پانی برس رہا ہے۔ بجلی بھی کوندتی ہے۔ اندھیری رات ہے جذبہ عشق کی تحریک کے لئے بہت بڑے معدات ہیں۔ اس کو ابو العلا معری کی نظم سے ملایئے۔ تو جو فرق دونوں میں تحریکِ جذبات کا نظر آئے گا۔ وہ اخلاق تمدن کا نتیجہ ہے۔ وہاں سنسان میدان۔ ببول کے درختوں کا جھنڈ۔ سنسان میدانوں میں بجلی کی چمک زیادہ قوی نظر آتی ہے۔ باعتبار آبادی کے عربی شاعر بجلی کو اپنا مونسِ تنہائی قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے یہاں متکلم عورت ہے۔ اس لئے اس کا خوف زدہ ہونا اور اس کی تنہائی کا بیان زیادہ موثر ہے۔

اسی طرح ام الہیثم بنت الاسود کہتی ہے ؎

تَجَافَی مَضْجَعِیْ وَمَا سَهَادِیْ

وَلَیْلِیْ مَا یُعَدُّ مِنَ السُّهَادِ

أُرَاقِبُ فِی السَّمَاءِ بَنَاتَ نَعْشٍ

وَلَوْ أَسْتَطِیْعُ کُنْتُ لَهُنَّ حَادِیْ

ترجمہ۔ کسی پہلو قرار نہیں۔ تب بیداری غالب ہو گئی۔ اور مجھے رات کو بیخوابی سے قرار نہیں۔ میں رات بھر آسمان میں بنات النعش کو آنکھیں کھولے دیکھتی رہی ہوں۔ اگر مجھے قدرت ہوتی۔ تو میں ان کو ہنکا کر چلاتی۔

اسی کو ہندی شاعر کہتا ہے۔

اے ماں! مجھ کو چاند ستانے لگا۔ کہاں وہ پیارا اور کہاں

پائیں اور کہاں وہ آرام کی رات۔ میں ستاروں کو گنتے گنتے تھک گئی۔ آنکھیں بند کرنے لگیں۔ اے دسوورداس، مالک تمہارے دیکھے بغیر مجبور کو کہاں چین ہے۔

یا ایک شاعر عربی کہتا ہے۔ کہ

أَبِيتُ أُسَامِرُ نَجْمَ السَّمَا

إِذَا لَاحَ لِي فِي الدُّجَى أَوْ غَرَبَ

ترجمہ۔ میں رات بھر آسمان کے ستاروں سے قصے کہتی ہوں۔ جب اندھیری رات میں چمکیں یا ڈوب جائیں۔

شاعر نے اس شعر میں اپنی شب بیداری کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔ کہ میں رات بھر ستاروں سے قصے کہتی ہوں۔ عام اس سے کہ وہ چمکیں یا ڈوب جائیں۔ چونکہ عرب کے تمدن میں راتوں کو قصے کہنا داخل ہے۔ بالعموم بدوی میدان میں قریب اور پاس کے گھروں کے یکجا جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ایک شخص ان میں سے جو افسانہ گو ہوتا ہے۔ کوئی طویل قصہ شروع کرتا ہے۔ اور سب لیٹے ہوئے سنتے ہیں۔ اور جب تک قصہ ختم نہیں ہوتا برابر جاگتے رہتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر سو جاتے ہیں چنانچہ الف لیلہ انہیں عرب کے افسانہ خوانوں کے قصص کا مجموعہ ہے۔ اس کا اصلی نام اسمار لیالی العرب ہے۔ یعنی عرب کے راتوں کے قصے۔ شاعر اس منظر کی تصویر کر رہا ہے۔ اور ستاروں کو افسانہ سننے والی جماعت فرض کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو افسانہ گو اور اس سے شب بیداری سے استعارہ کر رہا ہے۔ لہذا جو شخص اس تمدن سے واقف نہیں ہے۔ یا اس نے ایسی زندگی بسر نہیں کی ہے۔ اس سے اس کے جذبہ کی تحریک نہیں ہو سکتی اسی طرح عرب کا ایک بدوی جو پپیہا کی آواز اور بانسری کی تان اور ملاری کے الاپ سے واقف نہیں۔ اس سے اس کے جذبہ شوق کی تحریک نہیں ہو سکتی۔ اسی کو ایک اردو شاعر کہتا ہے۔ ؎

تارے گن گن کے ہم نے کاٹی رات

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

یہاں شاعر اپنی دلی کیفیت کو جو ہجر کی تکلیف سے اس پر گذری ہے صاف الفاظ میں ادا کر رہا ہے۔ دوسرے مصرعہ سے وہ اسے انتظار کی تکلیف کو طعن کے پیرایہ میں ظاہر کر رہا ہے۔ اور یہ دکھا رہا ہے۔ تم جو وعدہ کر کے نہیں آئے۔ اور ہمیں رات بھر انتظار میں شب بیداری کرنی پڑی۔ تو کیا تم نے یہ سمجھ لیا تھا۔ کہ ہماری رات بسر نہ ہوگی۔ تو ایسا نہیں ہے۔ ہماری بھی رات بسر ہوگئی۔ اگرچہ بہت تکلیف سے گذری۔ بصورت طعن اظہار رنج والم نے اس کیفیت کی پوری صورت سامنے کھڑی کر دی۔ اور اس شعر سے اظہار جذبہ احساس اور شب بیداری میں نہایت مکمل ہے۔ اس لیے کہ شاعر نے اس سے فطرت انسانی کی طرف رجوع کیا ہے۔ جیسا کہ انسان انتہائے رنج میں اپنے محبوب سے بطور طعن اظہار غم اور شکایت کرتا ہے۔ ایک ہندی شاعر کہتا ہے

اے سا ت اگر آپ اس کے جسم کی حالت (لاغری) کو دیکھنا چاہتے ہے۔ تو چپ چاپ اچانک چل کر دیکھ۔ اس وجہ سے کہ تجھے دیکھنے سے اس کو ایسی مسرت ہوتی ہے۔ کہ وہ اس خوشی سے موٹی ہو جاتی ہے جس سے اس کی حالت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا یہاں شاعر نے دو جذبات کی تصویر کھینچی ہے۔ ایک تو معشوق کے ہجر کی مثالی اور تکلف سے جسمانی حالت کا بالکل متغیر اور تبدیل ہو جانا جس سے شدت غم کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور جسم کی لاغری عشق کی دلیل ہو۔ دوسرا شعر دوسے عشق بامزہ ہے جیسے خمر ارری کہتا ہے

؎ ذَرَيْتُ حَتَّى صِرْتُ لَوْ زُجَّ بِي

فِي مُقْلَةِ النَّائِمِ لَمْ تَنْتَبِهْ

وَكَانَ لِي فِيمَا مَضَى خَاتَمٌ

وَالْآنَ لَوْ شِئْتُ تَمَنْطَقْتُ بِهِ

ترجمہ۔ اور میں گل گیا اور اتنا لاغر ہو گیا۔ کہ اگر کوئی شخص مجھ کو کسی سوتے ہوئے آدمی کی آنکھ کی پتلی میں چھپائے۔ تو وہ بیدار نہ ہو مجھ سے پہلے جو میری انگوٹھی تھی اب اگر میں چاہوں تو اس کو اپنا کمربند بنا لوں۔

دوسرے کمال اشتیاق کو بیان کر رہا ہے کہ محبوب کی

ملاقات سے اتنی خوشی ہوتی ہے۔ کہ اس کی حالت میں اتنا فوری تغیر ہوجاتا ہے۔ کہ وہ موٹی ہوجاتی ہے۔ اور اس وقت غم وحزن کے آثار باقی نہیں رہتے۔ یہ ایک خوشگوار مبالغہ ہے۔ جیسا کہ غالب نے بھی اسی کو لکھا ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے!

اسی طرح ایک ہندی شاعر کیفیت گریہ اور التہاب عشق جو معدات اظہار جذبہ عشق کا ایک اہم رکن ہے۔ یوں ادا کرتا ہے
ہ بجلی کے ساتھ میں بادل کو لاکر گویا جدائی نے یہاں رکھدیا ہے۔ جو برابر آٹھوں پہر آنکھیں جلتی رہی ہیں اور برسی رہتی ہیں:
مدعائے شاعر یہ ہے۔ کہ سوزش عشق سے آگ لگی رہتی ہے [illegible] کا اثر آنکھوں سے نمایاں ہے۔ اور آنسو جاری ہیں۔ سوزش [illegible] کو بادل سے استعارہ کیا اور سوزش قلب کو بجلی سے جو مناسب [illegible] استعارہ ہے۔ عربی شاعر کہتا ہے۔

[illegible]
بحر احاط به للدمع مسجور (دیکالجن)

۔۔۔ اس کے دل میں شوق کی آگ ہے۔ جس کو آنسوؤں کا گرم سمندر گھیرے ہوئے ہے اور جسے وہ بجھا نہیں سکتا۔
یہاں شاعر نے آنسوؤں کے ساتھ خون کی آمیزش کو آگ کے سمندر سے استعارہ کیا ہے۔ جو سوزش عشق سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے۔

گلابی اشک جاری ہیں ہماری چشم پرنم سے!
کوئی رگ دل کی شاید کھل گئی ہے نشتر غم سے!

شاعر نے کمال بلاغت سے اس مضمون کو ادا کیا ہے۔ اگر [illegible] شخص یہ کہے۔ کہ یہ صنف کلام اور یہ تخیل بہت پرانا ہے۔ آج تک یورپ کے محققین اس تحقیق سے عاجز ہیں۔ کہ قلب ایسے نازک عضو رئیس میں نشتر چبھویا جاسکتا ہے۔ صرف اسی شاعر کا دل ایسا ہے جسے نشتر چبھایا جاسکتا ہے۔ ورنہ یورپ اور امریکہ کے محققین جراح اس سے عاجز ہیں۔ تو کیا یہ فن تشریح کا کوئی معمہ ہے

اس موقعہ پر میں نقد کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے حقیقت انتقاد واضح ہوگی۔ ایک بار عکاظ کے میلے میں جہاں عرب کے نامی شعرا جمع ہوتے تھے۔ یمن۔ حجاز۔ نجد۔ بحرین وغیرہ مقامات کے شعرا جمع تھے اور اس سال نابغہ ذبیانی حکم تھا۔ اس کے لئے ایک خیمہ سرخ رنگ کا نصب تھا۔ نابغہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ تمام شعرا جمع تھے۔ ان میں حسان بن ثابت شاعر دربار رسالت۔ میمون بن قیس الاعشیٰ۔ تماضر بنت عمر المعروف خنساء بھی موجود تھے۔ خنساء نے اپنا مرثیہ رائیہ جس کو اپنے بھائی صخر کے رثاء میں لکھا تھا۔ پڑھ کر سنایا۔ تو نابغہ ذبیانی نے کہا۔ کہ "تو جا تو تمام شواعر (شاعر عورتوں) میں سب سے افضل ہے اگر یہ اندھا یعنی میمون بن قیس الاعشیٰ نے اپنا قصیدہ پہلے نہ سنایا ہوتا۔ اور میں نے اس کو ترجیح نہ دی ہوتی۔ تو میں اس سال کے تمام شعراء پر تجھی کو ترجیح دیتا۔ تو تمام جن وانس میں سب سے بہتر شاعر ہے"۔ یہ بات حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ناگوار گذری۔ حسان برہم ہوگئے اور کہا۔ "اے نابغہ میں تجھ سے اور خنساء دونوں سے بہتر شاعر ہوں"۔ نابغہ نے کہا۔ کہ "یہ خیال تمہارا صحیح نہیں ہے" پھر خنساء کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہا کہ "اے خنساء تو ہی ان سے بات کر" خنساء نے کہا۔ کہ "اے حسان! تم نے اس سال جو قصیدہ سنایا ہے۔ اس میں سے جس شعر کو تم سب سے بہتر سمجھتے ہو۔ اس کو سناؤ"۔

حسان بن ثابت نے یہ شعر پڑھا۔

لَنَا الْجَفَنَاتُ الْغُرُّ يَلْمَعْنَ بِالضُّحٰى!
وَاَسْيَافُنَا يَقْطُرْنَ مِنْ نَجْدَةٍ دَمًا!

ترجمہ۔ ہمارے سپید پیالے دوپہر کو چمکتے ہیں۔ (یعنی ہم بڑے مہمان نواز ہیں) اور ہماری تلواروں سے کثرت جنگ کی وجہ سے خون ٹپکتا ہے (یعنی ہم ہمیشہ معرکوں میں شریک رہتے ہیں)

باقی آئندہ

جو ہم چاہیں تو دنیا کو ہلا دیں![1]

از محترمہ ح۔ب صاحبہ

"جو ہم چاہیں تو دنیا کو ہلا دیں" فریب و کذب کی بنیاد ڈھا دیں

عمل کا ہاتھ میں کوڑا پکڑ کر، بلائے ناگہانی کو بھگا دیں!

جو ہم چاہیں تو فوجِ اہرمن کو اُٹھیں اور راہِ یزداں سے ہٹا دیں

اگر معلوم اپنا مرتبہ ہو، شہنشاہوں کو نظروں سے گرا دیں

ارادے ہوں ہمارے کوہ آسا قدم جب جادۂ حق پر جما دیں

محبت سے کریں قبضہ دلوں پر نئی اک مملکت اپنی بنا دیں

جو ہم چاہیں تو یہ سات آسماں بھی ہماری راہ سے پردہ اُٹھا دیں

سمندر راستے میں ہو جو حائل اُسے صحرا بنا کر ہم دکھا دیں

اگر کوہِ گراں ہو رہگذر میں سر پلئے خفارت سے ہٹا دیں

اگر لائیں ستارے کہکشاں سے سرِ روئے زمیں اُن کو بچھا دیں

زمینِ پست کو دیدیں وہ رتبہ ستارے شرم سے آنکھیں جھکا دیں

---

[1] یہ نظم خواتین کے ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لاہور کے زیرِ اہتمام براڈ کاسٹ کی گئی۔ (ایڈیٹر)

سائنسدان

ایک دلچسپ ڈراما،

از جناب فضل حق صاحب قریشی دہلوی

افراد:۔ خالد:۔ بحیثیت سائنسدان، عزیز:۔ اخبار کا نامہ نگار

منظر:۔ خالد اپنے مکان کی نشست گاہ میں کرسی پر بیٹھا ہوا کسی گہری فکر میں محو ہے سامنے کی میز پر ایک ریڈیو سٹ رکھا ہے۔ جو خاموش ہے۔ دروازے پر زور سے دستک دی جاتی ہے

خالد۔ (چونک کر) ایں! ۔ کون ہے؟ — اندر تشریف لائیے۔

عزیز۔ (داخل ہوتے ہوئے) کیا میں جناب کی خدمتمیں حاضر ہو سکتا ہوں؟

خالد۔ جی ہاں میں نے عرض تو کیا کہ اندر تشریف لے آیئے۔

عزیز۔ شکریہ! غالباً آپ ہی ہیں مسٹر خالد انصاری۔ عصر جدید کے سب سے بڑے سائنسدان۔ اور آپ ہی ریڈیو کی دنیا میں نئے نئے انکشافات پیش کرنے کے دعویدار ہیں؟

خالد۔ یقیناً آپ کا قیاس درست ہے۔ کرسی لیجیئے۔

عزیز۔ شکریہ! میں اخبار انڈین کرانیکل کا نمائندہ ہوں چیف ایڈیٹر کی ہدایت کے مطابق میں آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں تاکہ معلومات حاصل کر کے آپ کی حیرت انگیز ایجادوں سے عوام کو باخبر کر دیا جائے جن کی تفصیل کے لئے دلچسپی لینے والے حضرات بےچینی سے منتظر ہیں۔

خالد۔ آپ جو کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں بڑے شوق سے دریافت کیجئے میں سائنس کے خشک موضوع سے کسی قدر اکتا گیا ہوں اور اس وقت چاہتا ہوں کہ ذرا خوش طبعی کے میدان میں گھوڑے دوڑاؤں۔

عزیز۔ میری خوش نصیبی ہے کہ ایسے اچھے موقع پر آپہنچا مجھے امید ہے کہ آپ میرے سوالوں کے تسلی بخش جواب دیتے رہینگے۔

خالد۔ یقیناً میں کوشش کرونگا۔ لیکن اس کا ذمہ دار نہیں ہوں کہ میرے جواب آپ کے لئے تسلی بخش ثابت ہو سکتے ہیں۔ یا نہیں لیکن ذرا ٹھہر جایئے میں سرزمین روس کے چند نغمے سن لوں ٹھیک نو بجے ہیں اور صرف پانچ منٹ کا پروگرام ہے

[ریڈیو سٹ کا ایک بٹن گھماتا ہے ہندوستانی گیت سنائی دیتے ہیں ایک لمحہ مکالمہ بند رہتا ہے]

عزیز۔ معاف کیجیئے جناب! آپ نے فرمایا تھا کہ روسی نغمے سن لوں لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ ہندوستانی موسیقی ہے اور گیت بھی ہندوستانی زبان کے معلوم ہوتے ہیں۔

خالد۔ جی ہاں جہاں تک سننے کا تعلق ہے آپ ٹھیک سمجھے میں نے اپنے ریڈیو کا وہ بٹن گھمایا ہے جو نمبر ۴۵ پر آجانے کے بعد دوسرے ممالک کی موسیقی کو اپنے ملک کی عزیز موسیقی میں اور غیر زبانوں کو اپنے دیس کی زبان میں تبدیل کر دیتا ہے میں نے ارادۃً ایسا کیا کیونکہ میں نہ روسی زبان جانتا ہوں اور نہ ان کے تال سُر سے کسی قسم کا لطف اٹھا سکتا ہوں۔

عزیز۔ (تعجب سے) کمال ہے۔ لیکن اس سے کیا فائدہ؟ ایسے نغمے تو آپ خواہ روس کا ہو یا جرمنی کا سننے والوں کے لئے دونوں برابر ہیں۔

خالد۔ جی نہیں، اس تبدیلی کے باوجود اصل روح قائم رہتی ہے
جن لوگوں نے روسی ادب کا مطالعہ کیا ہے وہ فوراً سمجھ جائیں گے
کہ وہ اس سرزمین کی پیداوار ہے۔

عزیز۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ عام لوگوں کے واسطے اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔

خالد۔ کیوں نہیں غور کیجئے۔ یہ روس والوں کا ترانہ 'بہار' تھا جو جاڑے
کے موسم میں گایا جاتا ہے لیکن آپ نے ساون کا گیت محسوس
کیا ہوگا۔ پھر بھی بہار کا موضوع قائم رہا یعنی اس کی اصل روح
خیر میں اسے بند کئے دیتا ہوں شاید آپ پسند نہ کریں۔

[ریڈیوسٹ کا بٹن گھماتا ہے۔ آواز بند
ہو جاتی ہے]

عزیز۔ قبلہ پسند یا ناپسند کا سوال نہیں ہے۔ البتہ میرے پاس وقت
کی کمی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اگلی اشاعت میں اس ملاقات کی
مکمل روئداد شایع ہو جائے۔ تو ہاں میں معلوم کرنا چاہتا ہوں
کہ اس وقت جناب کی عمر کیا ہے۔

خالد۔ تقریباً تیس سال تاریخ پیدائش یکم اپریل ۱۸۹۰ء ہے۔

عزیز۔ (تعجب سے) یکم اپریل ۱۸۹۰ء اس حساب سے آپ تقریباً اڑتالیس
سال کے ہوئے۔

خالد۔ (مصنوعی حیرت سے) میں! ـــ اڑتالیس سال کا؟ بہت خوب
اگر آپ میری ذات کے متعلق مجھ سے زیادہ جانتے ہیں تو پھر دریافت
کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

عزیز۔ اوہو غلطی ہوئی معاف کیجئے اب میں جناب کی تعلیمی جد و جہد کے
متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں اور یہ کہ کون کون سی ایجادوں کا سہرا
آپ کے سر ہے؟

خالد۔ میں کسی کالج میں داخل نہیں ہوا۔ تمام تعلیم گھر پر حاصل کی ہے
البتہ ریڈیو کے سلسلہ میں کبھی کبھی مارکونی سے تبادلہ خیالات ہوتا
رہا ہے اس نے شروع میں میرے نظریوں کو تسلیم نہیں کیا لیکن
بعد ازاں میری شاندار کامیابی کا معترف ہو گیا۔

عزیز۔ بہ الکرم ذرا تفصیل سے بتلائیے کہ آپ نے حال ہی میں کیا کیا ایجاد
کیا ہے؟

خالد۔ کچھ نہیں۔ چند آلات جن کو ریڈیو کی ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا
ہے۔ مثلاً مروجہ ریڈیوسٹ سے آپ دور دراز کی باتیں اور
گانے وغیرہ سن سکتے ہیں لیکن ان کی اپنی اصلی حالت میں میں نے
یہ اضافہ کیا ہے کہ ہم ان کو اپنی مرضی اور اپنے ذوق کے لحاظ سے
سن سکتے ہیں۔

عزیز۔ جی ہاں! تو میں معلوم کر چکا ہوں بلکہ مشاہدہ بھی کر لیا ہے ابھی ابھی
آپ نے روسی نغمہ ہندوستانی سُروں میں سنوایا تھا۔

خالد۔ ٹھیک سمجھے! پھر دوسرے نمبر پر ٹیلی وژن ہے جس کے متعلق
کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں یہ نہ میری
ایجاد ہے۔ میں نے اس کو کسی قسم کی ترقی دی ہے۔

عزیز۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ ٹیلی وژن سسٹم تو ممالک یورپ میں بھی
پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ہے۔

خالد۔ بہت جلد رواج پا جائیگا۔ کہنا یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی وژن
انسان کے دو حواس سے متعلق ہو سکتے ہیں یعنی سننے اور دیکھنے
کی قوتیں۔ لیکن میری حال کی ایجادیں باقی حواس کیلئے سامان
نشاط پیدا کر سکیں گی۔

عزیز۔ (جوش میں) حیرت انگیز ـــ حیرت انگیز ـــ آپ کا مطلب سونگھنے
چکھنے اور چھونے کی قوتوں سے ہے؟

خالد۔ بالکل یہی مطلب ہے۔ میں نے ان کے واسطے ابھی اصطلاحی
نام وضع نہیں کئے کیونکہ پبلک کے سامنے ان کو پیش کرنے کا
فی الحال ارادہ نہیں ہے۔ آپ صرف اتنا سن لیجئے کہ ابھی ان
آلوں کے ذریعہ آپ صرف پچاس میل قطر کے دائرے کی خوشبو
ذائقہ اور لمس محسوس کر سکیں گے۔ رفتہ رفتہ یہ دائرہ وسیع ہوتا
رہیگا۔ حتیٰ کہ ایک وقت آئیگا جبکہ تمام دنیا حواس خمسہ کے
لحاظ سے ایک مرکز پر آ جائیگی۔

عزیز۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنے ملک میں ہی رہ کر سوئٹزر
لینڈ میں کھلنے والے تازہ پھولوں کی خوشبو سونگھ سکینگے؟

خالد۔ بے شک! بے شک!!

عزیز۔ اور آسٹریلیا کے پھل اور ایران کے میوے چکھ سکینگے۔

خالد۔ یقیناً — میں غلط نہیں کہہ سکتا؟

عزیز۔ اور روسی لومڑیوں کے سمور چھو کر معلوم کر سکینگے کہ وہ نرم ہے یا سخت۔

خالد۔ جی ہاں بشرطیکہ اس خوشبو، ذائقہ یا لمس کو میرے ہی ایجاد کردہ دوسرے آلوں کے ذریعہ اسی طرح نشر کیا گیا ہو جیسے مائکروفون کے ذریعہ آوازیں نشر کی جاتی ہیں۔

عزیز۔ یہ ایجادیں بلاشبہ دنیا کو غرق حیرت کر دیگی۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ درمیانی فاصلہ طے کرتے ہوئے اصل خوشبو یا ذائقہ میں کسی قسم کا فرق تو نہیں پیدا ہو جائیگا۔

خالد۔ ہرگز نہیں، کیا ریڈیو سنتے وقت آپ نے محسوس نہیں کیا کہ واقفکار لوگوں کی آوازیں صاف طور پر پہچان لی جاتی ہیں؟ بس جس طرح آواز پر فضا کا کوئی ناگوار اثر نہیں پڑتا اسی طرح خوشبو یا ذائقہ میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے گی۔

عزیز۔ بیشک آپ کی اس معقول دلیل سے بہت سی ناممکن باتوں کا امکان ثابت ہو گیا۔

خالد۔ اور سنئے، آپ نے ٹیلی گرافک ٹائپ رائٹر ضرور دیکھے ہونگے میرا تیسرا آلہ جو لسیات کو منتقل کر سکتا ہے اس قسم کی خدمات بھی انجام دیگا۔

عزیز۔ یعنی کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟

خالد۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی تحریر یا اصل خط میں دوسرے ممالک تک اسے ہی قلیل عرصہ میں بھیج سکیں گے جتنی مدت میں ریڈیو کے ذریعہ آپ کی آواز پہنچ جاتی ہے۔

عزیز۔ خدا کی پناہ — ! معلوم ہوتا ہے کہ آپ زمین و آسمان کے قلابے تک ملا دینگے۔

خالد۔ (ہنس کر) لیکن اس کے باوجود یقین مانئے کہ میں خدائی کا دعویٰ کبھی نہیں کرونگا۔

عزیز۔ یقیناً ایسا ہونا بھی چاہئے لیکن براہ کرم یہ تو بتلایئے کہ آپ اپنی ایجادات کو عوام کے سامنے کیوں پیش نہیں کر دیتے اگر تمام دنیا ان سے فائدہ اٹھانے لگے تو بہتر ہے۔

خالد۔ محض اس لئے کہ میرے بہت سے دوسرے منصوبے ابھی پورے نہیں ہوئے؟

عزیز۔ خدا کی قسم آپ کی یہ ایجادیں کیا کم حیرت انگیز ہیں جو اب آپ مزید کوششوں میں سرگرداں ہیں۔ لیکن خیر — آپ کی مرضی پھر بھی آپ کا اندازہ کیا ہے یہ کب تک پبلک میں آجائنگی؟

خالد۔ غالباً ۲۱۲۵ء تک۔

عزیز۔ ہائیں! تقریباً دو سو سال — ؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ اتنے عرصہ تک زندہ رہ سکیں گے؟

خالد۔ زندہ رہنے کے کیا معنی؟ میں اپنی دوسری ایجادوں کے ذریعہ تمام مخلوقات کو غیر فانی بنا دونگا۔ زندگی اور موت کا سوال ہی جاتا رہیگا لیکن اس کے ساتھ ہی پیدائش اور نشو و نما کا سلسلہ بھی ختم ہو جائیگا۔

عزیز۔ میں کیا سن رہا ہوں۔ عقل میں نہ آنے والی باتیں ہیں۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟

خالد۔ مجھے سخت افسوس ہوا۔ آپ کی عقل لائق ماتم ہے کیا آپ مجھسے کسی مذاق کی توقع کر سکتے ہیں؟

عزیز۔ نہیں نہیں، گستاخی معاف ہو۔ یہ میری بھول تھی۔ میں غلط کہا خیر مجھے یہ بتایئے۔ کہ کیا آپکے اور بھائی بھی ہیں اگر ہیں تو کیا وہ بھی اسی قسم کی ایجادوں میں منہمک ہیں؟

خالد۔ نہیں میں بدقسمتی سے اکیلا ہوں۔ یوں تو ہم دو بھائی جوڑواں پیدا ہوئے تھے لیکن اب اس دنیا میں صرف ایک ہے۔ میرے بھائی کی محض ایک ایجاد تھی اور وہ بھی غیر مکمل حالت میں۔

عزیز۔ دلچسپ ہو گی آپکے بھائی کی ایجاد۔ وہ کیا؟ وہ کیا ہے خدا کیلئے اس کی تفصیل بھی بیان کیجئے۔

خالد۔ کچھ نہیں، بہت معمولی اس نے ایک کیمرہ ایجاد کیا تھا۔ جس میں بجائے ایک کے تین لینس تھے یعنی تین مختلف قوتوں کے شیشے لگے ہوئے تھے۔

عزیز۔ یہ کون سی عجیب چیز ہوئی عام کیمروں پر بھی مختلف قوتوں کے لینس لگائے جا سکتے ہیں۔

خالد۔ ذرا ٹھہریئے آپ اصلیت سے ناواقف ہیں پھر بھی خواہ مخواہ اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔ ان لینسوں کی صفت عجیب تھی ایک

کے ذریعہ آواز کی تصویر کھینچی جاسکتی تھی۔ دوسرے سے خوشبو کی اور تیسرے سے ذائقہ کی کیا اب بھی اسے آپ معمولی ایجاد کہینگے ؟

عزیز۔ نہیں، نادر و نایاب، لیکن یقیناً ناقابل تسلیم۔ بھلا آواز کی تصویر آپ کیا فرما رہے ہیں وہ تو بالکل غیر مادی اور غیر مرئی چیز ہوتی ہے؟

خالد۔ جی ہاں! انسان جن باتوں کو خود نہیں سمجھ سکتا انہیں ناممکن کہہ کر ٹال دیتا ہے گراموفون کی ایجاد سے قبل کون تسلیم کرسکتا تھا کہ مسالہ کی پلیٹ پر آواز جم سکتی ہے؟

عزیز۔ مانتا ہوں جناب مانتا ہوں گراموفون کی مثال سے بات جلد سمجھ میں آگئی لیکن اب یہ بتایئے کہ اس کیمرے کے عمل کہاں ہیں اب

خالد۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے وہ تینوں لینس ایک حادثے سے ٹوٹ گئے اور جن مسالوں سے وہ تیار ہوئے تھے اس کا صحیح علم میرے بھائی کی موت کے بعد ایک راز بن گیا۔

عزیز۔ بڑا غضب ہوا شاید اب اس نقصان عظیم کی تلافی نہ ہوسکے اور ہاں آپ کے بھائی کا انتقال کب ہوا؟ غالباً یہ سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی یہ تصویر انہی کی ہے؟

خالد۔ جی ہاں! یہ بھی ہمارے خاندان کا ایک راز ہے جس کی حقیقت کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم دونوں کی عمر تقریباً چھ ماہ تھی تو ایک روز ہماری آنکھ بچا کر نہانے کے ٹب میں جا کودے اور

عزیز۔ تو کیا صرف چھ ماہ کی عمر میں آپ دونوں چلنے پھرنے لگے تھے،

خالد۔ خوب اچھی طرح! اور چونکہ ٹب میں پانی کافی تھا اس لئے ہم دونوں میں سے ایک ڈوب کر مر گیا لیکن آج تک ٹھیک طرح یہ معلوم ہوسکا کہ دونوں میں سے کون؟ میں یا وہ!

عزیز۔ (حیرت سے) ایں — اس کا مطلب؟ کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ اس وقت آپ زندہ نہیں ہیں؟

خالد۔ ہر بات ممکن ہے اور ناممکن بھی۔ میرے رشتہ داروں کو کسی قدر شک ہے تاہم میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پانی میں میرا بھائی ڈوبا تھا کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے کی ناک دونوں آنکھوں کے درمیان تھی اور میری ناک دونوں ہونٹوں کے اوپر ہے۔

عزیز۔ آپ کے رشتہ داروں کا کیا خیال ہے؟

خالد۔ وہ کہتے ہیں کہ زبردست دھوکا ہوگیا۔ زندہ بچے کو قبر میں دفن کردیا ڈوبنے والا دراصل میں تھا۔

عزیز۔ (مسکرا کر) خیر ان کی نگاہوں میں آپ مُردہ سہی لیکن نوع انسان کے لئے آپ کا وجود بہت کارآمد ثابت ہو رہا ہے کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ انیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنسدان آپ کے خیال کے مطابق کون ہوسکتا ہے؟

خالد۔ ظاہر ہے۔ ایڈیسن کے علاوہ اور کس کا نام لیا جاسکتا ہے وہ ہر اعتبار سے بڑا آدمی تھا۔

عزیز۔ میں سمجھا نہیں کہ آپ اس کو ہر اعتبار سے بڑا آدمی کیوں کہتے ہیں ذرا اس پیرایہ کو واضح طور پر بیان کیجئے۔

خالد۔ بہت مشہور بات ہے کہ جب اس کا انتقال ہوگیا اور تجہیز و تکفین کے بعد لوگ اسے قبرستان لے جانے لگے تو اس نے اپنا تابوت کے اندر سے نکال کر حاضرین سے وقت پوچھا۔

عزیز۔ کیا ایڈیسن نے وقت پوچھا؟

خالد۔ جی ہاں اور جب اسے معلوم ہوا کہ دس بجے ہیں تو بڑے اطمینان سے اٹھا اور حاضرین سے پانچ منٹ کی اجازت لے کر کمرے میں ریڈیو سننے چلا گیا کیونکہ اس وقت لارڈ بائرن کی ایک مشہور نظم ایک مشہور مغنیہ ہندوستانی سروں میں گا رہی تھی اس سے

عزیز۔ (بات کاٹ کر) بائرن کی نظم؟ ہندوستانی سروں میں؟ فرانس کی مغنیہ؟

خالد۔ جی ہاں! اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص سائنسدان ہوتے ہوئے۔ شاعری اور موسیقی کا اس درجہ دلدادہ ہو وہ یقیناً ہر اعتبار سے بڑا آدمی ہے۔

عزیز۔ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ پھر تابوت کے اندر سے نکل آنا اور ریڈیو سننا کس طرح ممکن ہے۔

خالد۔ یقیناً اس اعتبار سے بھی اس کو بڑا آدمی کہا جاسکتا ہے

عزیز۔ اور یہی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ ممکن کس طرح ہوگیا؟

آپ کی سمجھ میں نہ آسکے تو اس کا کیا علاج ہے لیکن یہ حقیقت ہے

کہ بڑے آدمی کے لئے ہر بات ممکن ہے۔

عزیز۔ آپ جو اس قدر وثوق کے ساتھ کہہ رہے ہیں تو کیا وہ ذاتی مشاہدہ تھا آپ اس خاص موقع پر بذات خود موجود تھے۔

خالد۔ جی ہاں! ذاتی مشاہدہ! ہر چند میں نے آج تک اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر قدم نہیں رکھا۔ لیکن اس جلسے میں شامل ضرور تھا۔ بلکہ . . .

عزیز۔ (بات کاٹ کر) ہیں ---؟ یہ دو متضاد باتیں بیک وقت ممکن کیسے ہو گئیں؟

خالد۔ دیکھئے پھر وہی اعتراض! میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ ممکن اور ناممکن کا سوال چھوڑ دیجئے۔ سائنس کے کرشموں کو سمجھنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔

عزیز۔ بہت بہتر! میں تسلیم کر لیتا ہوں لیکن آپ کا شکریہ ادا کرنے سے پہلے ابھی ایک بات اور دریافت طلب باقی ہے۔

خالد۔ ضرور پوچھئے بلکہ ایک نہیں دو۔ تاکہ آپ کی رپورٹ غیر مکمل نہ رہنے پائے۔

عزیز۔ ہر چند تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ اپنی ایجادات کے سلسلے میں کبھی آپ کو ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا ہے؟

[illegible] اپنی کمزوریوں کو ماں [illegible] بھی نہیں [illegible] اگر کامیاب رہا ہوں مگر عارضی طور پر۔ تاہم ایک ایجاد کے سلسلے میں ایسی ناکامیابی ہوئی کہ آج تک پچھتاتا ہوں اور دوبارہ تجربہ کرنے کی ہمت بھی نہیں ہے۔

عزیز۔ براہ کرم اس کی تفصیل ذرا واضح طور پر بیان کیجئے۔

خالد۔ جی نہیں، ہرگز نہیں، اس ایجاد کے سلسلے میں مجھ سے ایک سنگین جرم کا ارتکاب ہو گیا اور اگر آج وہ پولیس کو معلوم ہو جائے تو یقیناً میرے خلاف زبردست فوجداری مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ بلکہ

عزیز۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کرونگا اور نہ اپنے اخبار میں شائع کراؤنگا۔ صرف ذاتی معاملات کیلئے آپ سے درخواست کرتا ہوں۔

خالد۔ قطعی ناممکن ---! میں یہ راز اپنے کسی عزیز ترین دوست کو بھی نہیں بتاؤنگا۔

بہت بہتر --- آپ کی مرضی۔ میں اس سے زیادہ مجبور نہیں کر سکتا۔ اچھا آپ کی نوازشات کا شکریہ! --- اب اجازت دیجئے۔

تشریف لے جا رہے ہیں؟ بہت خوب؟ --- آپ سے مل کر حد درجہ مسرت حاصل ہوئی۔

آداب عرض۔

لیکن ذرا ٹھہرئیے میری ایک آخری ایجاد سے ابھی آپ ناواقف ہیں۔ مجھے ایک مزاحیہ اخبار کے لئے دلچسپ مکالمہ لکھنا تھا! جس کا خاکہ آپ کی ملاقات سے میرے ذہن میں تیار ہو گیا شاید ادبی رسائل میں میرا نام آپ کی نظر سے گذرا ہو! --- خالد جمالی --- مشہور ظرافت نگار۔

(انتہائی حیرت سے) تو کیا آپ مسٹر خالد انصاری مشہور سائنسدان نہیں ہیں؟

مجھے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ وہ برابر والی دوسری کوٹھی میں رہتے ہیں اور میرے نصف ہم نام ہیں۔ اچھا خدا حافظ، باہر جانے کا دروازہ سامنے ہے۔ انشاءاللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ بار بار دہ [illegible] ملاقات ہوگی۔

پردہ

ہشیار وہی ہیں آج جو دیوانے نہیں ہیں

سر دار بھی جھک سکا ان سے جو بیگانے نہیں ہیں

اسلام سے کچھ صاحب عصیاں بتانے والے

دیکھیں ذرا اپنے گریباں کو نہیں ہیں

کمال الہ آبادی

نوائے محبّت!

از جناب راجہ مہدی علی خانصاحب جائنٹ ایڈیٹر "خیام"

کبتک مری الفت سے تم انکار کروگے
کبتک یہ ستم مجھ پہ ستمگار کروگے

آ آکے لرزتی ہیں مرے لب پہ دعائیں!
کب مجھکو عطا جنّتِ دیدار کروگے

آئینۂ چشمانِ محبت کو مرے کب
حیرت زدہ جلوۂ رخسار کروگے

کب آکے سنوگے مرے فرقت کے فسانے
کب پرسشِ احوالِ دلِ زار کروگے

کب میری تباہی پہ بہاؤگے تم آنسو
کب اپنی جفاؤں کا تم اقرار کروگے

کب پیار سے ڈالوگے گلے میں مرے بانہیں،
اسطرح سے کب عشق کا اظہار کروگے

رسوائیوں کے داغ لئے جاتے ہو مہدی
اب بھی ہوسِ کوچۂ دلدار کروگے؟

اباشی

عالمگیر بکڈپو کی مشہور و معروف کتابیں
شروع سے آخر تک بغور ملاحظہ فرمائیں
اردو زبان کی ادبی و پاکیزہ کتابیں
روزنامچے
مجنوں کی ڈائری
لیلیٰ کے خطوط
چار سہیلیاں
صبح لطافت
شادی
آشوب زمانہ
ماہ پروین

ایک تنقیدی مقالہ

نظامی عروضی

(از جناب کامل رزاقی عزیزی)

کسی علمی ہستی کے سوانح زندگی لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نام ونسب، خاندانی حالات، مولد، ولادت، صغر سنی، ایام رشد جوانی، بڑھاپا، موت، تعلیم وتربیت، پایۂ علم وفضل، شغل زندگی، کارنامے، تصنیف وتالیف وغیرہ وغیرہ کی پوری تفصیل کی جائے تاکہ پڑھنے والے کو اس کی شخصیت کا کماحقہٗ علم ہو سکے اور عروضی کے لئے بھی یہی ہونا چاہئے تھا۔ لیکن یہاں حال یہ ہے ؎

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم (شاد عظیم آبادی)

یا یوں کہئے کہ ؎

سنا بیان عروضی تو درمیاں سے سنا
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اور درمیانی حالات بھی جو کچھ معلوم ہوئے وہ پورے بود ہے رہے داشت، گم شدہ، بازیافت" کی حد تک بھی نہیں پہنچتے۔

اس جلیل القدر ہستی کے ساتھ تذکرہ نویسوں نے جو ظلم روا رکھا ہے وہ باعث تعجب ہونے کے ساتھ ساتھ بغایت قابل تعریض ولائق ملامت ہے۔ جھوٹی مدح کرنے والے شعراء اور ٹکڑگدا خاتوں کی داستان سرائی ہیں تو ان کی زبانیں خشک ہوتی ہیں اور ان کی مدح طرازی میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیتے ہیں۔ لیکن تاریخ میں علمی، ادبی، سیاسی وتمدنی خدمت کرنے والوں کے لئے انکی ۔ میں گنگ، اور قلم شکستہ ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ابھی نہیں ہوتا [illegible] پہلے بھی ان کے بارے میں صحت واعتنا کے ساتھ لکھدیں۔ عروضی چھٹی صدی ہجری میں گذرے ہیں اور ساتویں صدی کی ابتدا سے آجتک کے جتنے تذکرے نویس ہیں کسی نے بھی ان کے بارے میں چار پانچ سطروں سے زیادہ لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی اور بعضوں نے تو ان کا نام لینا بھی پسند نہ کیا۔ لکھنے والوں نے کچھ لکھا بھی تو واقعات کی صحت کی طرف بالکل توجہ نہ کی۔ ایسی صورت میں آج سات سو برس کے بعد ان کے صحیح حالات کی واقفیت پیدا کرنا اور زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنی "جوئے شیر لانے" سے زیادہ دشوار ہے بہرکیف اپنی ہیچمدانی کے باوجود صحت واعتماد کے ساتھ جو کچھ بھی مجھ سے ہوسکا ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

میں نے اس مضمون میں تاریخ کی دوسری کتابوں کے علاوہ مولوی وجاہت حسین عندلیب شادانی صاحب کے انعامی مقدمہ سے جو انھوں نے "چہار مقالہ" کے اپنے مصحح نسخہ کے ساتھ شائع کیا ہے کافی مدد لی ہے۔ اور خود چہار مقالہ تو میرے سارے مضمون کا ماخذ ہی ہے۔

عروضی کے سوانح حیات کے متعلق جو کچھ معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں ان کے دو ماخذ ہیں۔ اول مختلف تذکرے۔ دوم خود ان کی تصنیف چہار مقالہ۔

عروضی کے متعلق تذکرہ نویسوں کا بیان

تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ لکھنے کے برابر ہے بلکہ اگر چہ نہ لکھتے تو زیادہ بہتر تھا۔ کیونکہ علاوہ تو یہ ہے عبارت آرائی اور بے لطف قافیہ پیمائی کے کچھ لکھا نہیں۔ جو کچھ لکھا اس میں شدید غلطیاں کر گئے ہیں۔ جس سے بجائے اس کے کہ ان کے صحیح حالات معلوم ہوں [illegible]

تحسین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کاش یہ حضرات ان کا تذکرہ کرتے وقت ان کی کتاب چہار مقالہ کا مطالعہ کر لیتے تو لکھنے کے لئے بہت کچھ مواد بھی فراہم ہو جاتا۔ اور غلطیوں سے بھی مامون رہتے

نمونہ کے لئے چار قدیم اور معتبر تذکروں سے عروضی کے حالات نقل کئے جاتے ہیں ان کے علاوہ اور تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے حالات پر مزید روشنی نہیں پڑتی۔ کیونکہ تقریباً سب نے حسب عادت ایک دوسرے کی نقل کے سوا کچھ نہیں کیا

عروضی کے حالات بیان کرنے والا سب سے قدیم تذکرہ نویس نور الدین محمد عوفی ہے۔ اس نے اپنی کتاب لب الالباب میں جو سنہ ۶۱۷ھ یعنی چہار مقالہ سے تقریباً ۶۰ برس بعد کی تصنیف ہے انہیں طغرل بن ارسلان سلجوقی کے متوسلین شعرا میں شمار کیا ہے اور ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل عبارت یہ ہے۔

سلک دودی کہ عقد ثریا از عیف وکمر جوزا را تحقیر کند اکثر شعراو مثنوی است۔ و از متقدمان صنعت است از اشعار او آنچہ در خاطر بود تحریر افتاد۔

عوفی کے بعد حمد اللہ مستوفی نے اپنی کتاب تاریخ گزیدہ میں جو سنہ ۷۳۰ھ کی تصنیف ہے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

"نظامی عروضی معاصر نظامی گنجہ بود کتاب مجمع النوادر از مصنفات اوست۔ اشعار خوب دارد [illegible] غیر از تو نظامی کیست، گفت ؎

در جہاں سہ نظامیم اے شاہ	کہ جہانے ز ما [illegible]
من بود شاد پیش تخت شہم	واں دو در مرو پیش سلطانند
بحقیقت کہ در سخن امروز	ہر یکے مفخر [illegible]
گرچہ ہمچوں رواں سخن گو شد	ور چہ [illegible]
من ہشیارم کہ شاں چوں دریابم	بردواز کار خود فرو مانند

مستوفی کے بعد دولت شاہ نے اپنے "تذکرۃ الشعرا" میں جو سنہ ۸۹۲ھ کی تصنیف ہے ان کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔[1]

ذکر مقبول الملک نظامی عروضی سمرقندی، مردے اہل فضل بود و طبع لطیف داشتہ از جملہ شاگردان معزی است و در علم شعر آ بودہ۔ داستان "ویس و رامین" را بہ نظم آوردہ۔ و گویند آں داستان را شیخ بزرگوار نظامی گنجوی نظم کردہ قبل خمسہ۔ و کتاب چہار مقالہ از تصنیف نظامی عروضی است و آں نسخہ ایست لطائف مشہور و آداب شرب و علم اعلی و دانستن آئین خدمت ملک و غیرہ ذالک۔ و در یں بیت از داستان ویس و رامین کہ از نظم نظامی عروضی است آوردہ می شود تا وزن ابیات آں نسخہ معلوم گردد ؎

ازاں خواستہ آتش را گمان گیر | کہ از آمل سرو اناداخت او تیر

دولت شاہ کے بعد امین احمد رازی نے "تذکرۂ ہفت اقلیم" میں جو سنہ ۱۰۰۲ھ کی تصنیف ہے۔ اور جس میں شہروں کی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے سمرقند کے ذیل میں لکھا ہے۔

نظام الدین احمد بن علی العروضی از نیکو طبعان زماں خود بود در آں عصر نظمش نتیجہ کان را تعبیر دادے از ترش عقد ثریا را تحقیر نمودے۔ و او در مثنوی متقدمان صنعت است و چند تالیف درآں پرداختہ مجمع النوادر و چہار مقالہ در نثر از مصنفات اوست۔ نور الدین عوفی [illegible] در سلک شعرائے سلطان طغرل بن ارسلان سلجوقی نوشتہ۔ اما در چہار مقالہ خود را از مستوفیان ملوک غور شمردہ"

اس کے بعد مقالہ سوم کی آخری حکایت نقل کر کے جس میں عروضی نے غوریوں سے اپنی نسبت کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اشعار لکھے ہیں

چاروں کے بیان کا جو حاصل نکلتا ہے وہ یہ ہے نظام الدین احمد بن علی المعروف بہ نظامی عروضی سمرقند کے باشندے تھے اور اپنے وقت کے صاحبان فضل و کمال سے گزرے ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ امیر معزی کے شاگرد

[1] دیکھئے نقل نسخی شروع ہوگئی رزاقی۔

اور نظامی گنجوی کے معاصر تھے۔ طغرل بن ارسلان سلجوقی یا ملوک غور کے دربار سے وابستہ تھے۔ نظم میں زیادہ تر انھوں نے مثنوی لکھی ہے اور اس صنف میں انھیں خصوصی تقدیم حاصل ہے کئی مثنویاں مکمل بھی کی ہیں۔

تذکرہ نویسوں کے بیان کی تنقید

اس بیان میں کئی امور تنقیح طلب ہیں

عروضی کا نام ونسب، امیر معزی کا شاگرد اور گنجوی کا معاصر ہونا، طغرل بن ارسلان سلجوقی یا ملوک غور کے دربار سے وابستگی۔ داستان "ویسی ورامین" کا نظم کرنا، نثر میں مجمع النوادر اور چہار مقالہ دو کتابوں کی تصنیف۔

دولت شاہ نے ان کا نام نظام الدین احمد اور باپ کا علی لکھا ہے۔ حالانکہ وہ خود اپنا نام صرف احمد بتاتے ہیں اور باپ کا عمر اور دادا کا علی۔ چہار مقالہ کے سبب تالیف میں لکھتے ہیں۔

"بندہ مخلص و خادم متخصص احمد بن علی النظامی العروضی السمرقندی الخ"

خود چہار مقالہ میں عروضی نے جہاں امیر معزی کی ملاقات کا ذکر کیا ہے یا اس کے علاوہ جہاں کہیں بھی معزی کا نام آیا ہے اس میں اشارۃً و کنایۃً بھی شاگردی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ملاقات کی تقریب یہ ہوئی کہ عروضی تنگدستی سے پریشان ہو کر سلطان ... سلجوقی سے ملنے کے لئے ہرات سے دشت تروق میں آئے جہاں سلطان اوقت مقیم تھا۔ امیر معزی دربار کے ملک الشعراء تھے ... سے پہلے ان سے ملے۔ مقالہ دوم کی چوتھی حکایت میں اس کا ... وہاں پر کی عبارت یہ ہے۔

"قصیدہ گفتم و بنزدیک امیر الشعراء معزی رفتم
و افتتاح او کردم و شعر من بشنید و از چند نوع
مرا بر محک امتحان زد و آمدم بزرگیہا فرمود و مہتریہا
و اجب داشت"

اس کے بعد معزی نے عروضی کو تسلی دی ہے اور دلدہی کے ... جو پیا واقعہ بیان کیا ہے اس کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ معزی سے ملاقات اور اشعار کا دکھانا۔ امتحان کا ہونا ثابت ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے۔ اس سلسلہ میں شاگردی بھی اختیار کر لی ہو کیونکہ ذکر نہ کرنے سے شاگردی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ نیز اسی حکایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معزی کے ساتھ عروضی کی یہ صحبت طویل رہی ہے جیسا کہ کہتے ہیں۔

روزے پیش او (معزی) از روزگار استزادتے ہمی
نمودم وگلہ ہمی کردم و مرا دل داد و گفت ...

اس بنا پر یہ خیال اور مستحکم ہو جاتا ہے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ فنی ضرورت کے لحاظ سے نہ بھی تو کم از کم اپنی تنگدستی کا خیال کر کے تلمذ اختیار کر لیا ہو گا کہ استاد کے واسطہ سے دربار میں کسی خدمت کا موقع مل جائے، مگر پھر بھی ان قیاس آرائیوں سے ہٹ کر اگر صرف عروضی کے بیان پر اکتفا کی جائے تو شاگردی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی ممکن ہے تذکرہ نویسوں کے پاس کوئی اور دلیل ہو لیکن موجودہ بیان کے مطابق یہی کہا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عجب ہے یہ دیکھتے ہیں کہ عمر خیام کا ذکر چہار مقالہ میں صرف ایک یا دو جگہ آیا ہے۔ لیکن عروضی نے وہاں صاف اعتراف کر لیا کہ

"او را بر من حق استادی بود" تو سخت تعجب ہوتا ہے کہ معزی کا شاگرد ہو کر باوجود متعدد جگہ اس کا نام آیا ہے کہیں بھی نہ شاگردی کا اعتراف کرتے ہیں اور نہ شاگردانہ حیثیت سے نام لیتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ معزی کی شاگردی کا افسانہ بالکل من گھڑت ہے۔

رہا نظامی گنجوی کا معاصر ہونا سو یہ دعوے بھی کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ اس لئے کہ اول تو صاحب تذکرہ نے جو اشعار نقل کئے ہیں اور جس واقعہ کا حوالہ دیا ہے وہی اس کی تردید کرتا ہے۔ مقالہ دوم کی آخری حکایت میں مذکورالصدر قطعہ سے چند سطر قبل عروضی لکھتے ہیں۔

"ہمیدون آں بادشاہ را دیدم کہ متغیر گشت و در
حال سوئے من گرد و گفت جز تو جائے نظامی ہست؟
گفتم بلے اے خداوند! دو نظامی دیگر اند یکے سمرقندی

کو علیحدہ تصنیف سمجھ لیا۔ اور یہ نمونہ ہے ہمارے تذکرہ نویسوں کی بیخبری کا۔ جب انوری کی اپنی اعتراف کردہ دس سال کی محنت کو قصیدہ کا مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے ایک رات کا سرمایہ قرار دے سکتے ہیں۔ تو جہاں مصنف نے کوئی صریحی بیان نہ دیا ہو وہاں اس قسم کی غلطی کر جانے پر کیا تعجب کیا جاسکتا ہے۔

عروضی کے حالات چہار مقالہ کی روشنی میں

آپ کا نام احمد، والد کا عمر اور دادا کا علی ہے۔ تخلص نظامی اور عروضی سے مشہور ہیں۔ سمرقند مولد ہے۔ (ص ۲۱) تخلص کے ساتھ لفظ عروضی ملحق ہوکر کس طرح مشہور ہوگیا؟ اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ ارباب تذکرہ جہاں انکے متعلق معمولی باتوں میں خاموش رہ گئے ہیں وہاں ان سے اس جزوی امر کے بارہ میں تفصیل کی توقع رکھنی بالکل بے سود ہے۔ خود مصنف نے بھی کوئی ایسا بیان نہیں دیا جس سے یہ مسئلہ روشنی میں آسکتا اور ان سے تو اس کی شکایت بھی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ انھوں نے انہیں بھی بلا واسطہ اپنے سوانح پر کوئی روشنی نہیں ڈالی بہرحال ممکن ہے کہ انھوں نے فن عروض کی کوئی خاص خدمت انجام دی ہو یا نہیں اس فن میں مخصوص شغف و انہماک رہا ہو۔ اس بنا پر آج تک اس لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

خاندانی حالات، تاریخ ولادت، اصغر سنی، ایام رشد اور تربیت کے احوال بالکل پردۂ خفا میں ہیں۔ لیکن اسقدر یقینی ہے کہ پانچویں صدی ہجری کا ثلث اخیر آپ کا ایام شباب و رشد ہے اور کم و بیش سنہ ۵۰۰ھ تک آپ تعلیم و تربیت سے فراغت ہو چکے تھے کیونکہ سنہ ۵۰۴ھ میں اپنے زاد بوم سمرقند میں رودکی کے متعلق دہقان ابو رجا سے جو حالات معلوم کئے ہیں۔ (ص ۴۰) وہ یقینی فراغ تعلیم کے بعد کا زمانہ ہے۔

چہار مقالہ میں سنہ ۵۰۰ھ سے سنہ ۵۴۷ھ تک کے جستہ جستہ واقعات جو مصنف سے متعلق ہیں ضمنی طور پر ذکر ہو گئے ہیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔ طوالت کے خوف سے میں نے کتاب کی عبارت نقل نہیں کی ہے بلکہ خلاصہ لے لیا ہے اور تفصیل کے لئے چہار مقالہ مصححہ مولوی وجاہت حسین صاحب عندلیب شادانی صاحب مطبوعہ کریمی پریس لاہور کے صفحات کا حوالہ دیدیا ہے۔ ناظرین اگر ضرورت سمجھیں تو مطالعہ کے وقت چہار مقالہ کا مذکورہ نسخہ پیش نظر رکھیں۔

سنہ ۵۰۴ھ میں تو عروضی سمرقند ہی میں موجود تھے۔ جیسا کہ ابھی بیان ہوچکا۔ اس کے بعد سنہ ۵۱۴ھ تک تقریباً دس سال مسلسل آپ نے سفر میں بسر کئے ہیں۔ اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ تمام سفر فکر معاش و تلاش روزگار کے سلسلہ میں تھا۔

سنہ ۵۰۶ھ میں بلخ پہونچکر اپنے استاد عمر خیام سے ملتے ہیں۔ اسی موقع پر خیام نے ان سے پیشین گوئی کی تھی کہ میری قبر پر ہمیشہ گل افشانی ہوتی رہے گی۔ (ص ۹۸-۹۷)

سنہ ۵۱۰ھ میں آپ ہرات سے روانہ ہوکر سلطان سنجر سلجوقی کے لشکر میں جاملتے ہیں۔ جو اس وقت دشت تروق میں خیمہ زن تھا، اور دربار کے ملک الشعراء امیر معزی چند طرح پر انکی قابلیت و استعداد کا امتحان لے کر احترام کرتے ہیں اور تسلی و تشفی کے لئے اپنے حالات ان سے بیان کرتے ہیں۔ (ص ۷۰-۶۹) اسی سفر میں طوس پہونچکر فردوسی کی قبر کی زیارت کرتے ہیں (ص ۸۲) اور اسی سال ہم انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ نیشاپور کی جامع میں ابو رضا بن عبد السلام نیشاپوری سے نسناس (بن منش) کا قصہ سن رہے ہیں (ص ۲۹)

سنہ ۵۱۰ھ میں بھی ہم انہیں نیشاپور ہی میں پاتے ہیں کہ وہاں کے "بازار عطاراں" میں محمد منجم طبیب کی دوکان پر خواجہ امام ابوبکر دقاق سے قولنج کے معالجہ کی ایک حکایت سن رہے ہیں (ص ۱۰۵-۱۰۶)

سنہ ۵۱۴ھ میں پھر امیر معزی سے ملتے ہیں جو اس وقت نیشاپور میں مقیم ہیں اور ان سے محمود و فردوسی کے بارہ میں ایک حکایت معلوم کرتے ہیں (ص ۸۱)

یہ دس سال جو آپ کے تلاش روزگار میں بسر ہوئے انمیں تقریباً پانچ سال سنہ ۵۱۰ھ سے لے کر سنہ ۵۱۴ھ تک متواتر یا کم و کم اکثر آپ کا قیام نیشاپور ہی میں رہا، غالباً اس کے بعد وہ زمانہ

سے جب آپ غوریوں کے دربار میں باریاب ہوئے ہیں
۵۳۰ھ میں آپ پھر نیشاپور پہنچتے ہیں اور عمر خیام کی
قبر کی زیارت کرتے ہیں، اور چوبیس سال پہلے جو پیشین گوئی کی
تھی اسے حرف بحرف صحیح پاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ قبر کے سرہانے
زرد آلو اور امرود کے پیڑ ہیں جن کی گل افشانی سے ساری قبر
ڈھکی ہوئی ہے (ص ۹۰)

۵۴۷ھ میں جب سلطان سنجر سلجوقی اور سلطان علاء الدین
غوری کے درمیان صحرائے اوبہ (حدود ہرات) میں جنگ ہوئی
تھی اسوقت غوریوں کے لشکر میں آپ بھی موجود تھے اور غوریوں
کی شکست پر سلطان سنجر کے خوف سے عرصہ تک ہرات میں چھپے
رہے (ص ۱۲۶)

اب اس کے ساتھ اس بیان کو ملائیے کہ عروضی کو تالیف کتاب
کے وقت غوریوں کے دربار میں رہتے ہوئے پینتالیس سال ہو چکے
تھے (ص ۲) لیکن خود عروضی نے تالیف کتاب کا سنہ ذکر نہیں
کیا ہے۔ نہ غوریوں سے تعلق متعین کیا ہے۔ اس لئے دونوں
کی تعیین ہمارے ذمہ آجاتی ہے۔

۵۴۷ھ کے واقعات صاف بتا رہے ہیں کہ اس وقت تک
ان کا تعلق غوریوں سے نہیں ہوا تھا کیونکہ غوریوں سے تعلق کے
بعد نیشاپور میں آوارہ حال پھرتے رہنے کے کوئی معنے نہیں اسلئے
زیادہ سے زیادہ ۵۱۰ھ کے لگ بھگ ان کی رسائی غوریوں
کے دربار میں ہوئی ہوگی۔ اب اگر اس پر پینتالیس سال کا اضافہ
کیا جائے تو کتاب کا سنہ تالیف ۵۵۶ھ کے قریب قریب
ہوتا ہے لیکن خود مصنف کے بعض بیان کے مطابق یہ بالکل
غلط ہے۔ سلطان سنجر جس نے ۵۵۲ھ میں وفات پائی ہے
تالیف کتاب کے وقت زندہ تھا۔ مصنف نے اس کے لئے اس
طرح دعا کی ہے۔

"اطال اللہ بقاءہ وادام الی المعالی ارتقاءہ" (ص ۲۹)
ایک جگہ سلطان سنجر اور سلطان علاء الدین غوری دونوں
کے لئے اس طرح دعا کی ہے۔ "خلد اللہ ملکہما وسلطانہما" (ص ۲)
اور سلطان علاء الدین نے ۵۵۱ھ میں وفات پائی ہے۔ اس
طرح چہار مقالہ ۵۵۱ھ کے بعد کی تالیف نہیں۔ دوسری طرف
خود مصنف نے وہ کتب انشا گنائی ہیں جن کا پڑھنا اور
یاد رکھنا دبیروں کے لئے ضروری ہے۔ ان میں "مقامات حمیدی"
بھی شامل ہے (ص ۳۵) اور حمیدی کا سنہ تالیف ۵۵۱ھ
ہے۔ اس بنا پر چہار مقالہ کا سنہ تالیف یقینی ۵۵۱ھ ہے
اس صورت میں غوریوں کے دربار سے مصنف کا تعلق اتنا
دیرپا کبھی نہیں ہو سکتا جتنا وہ بیان کرتے ہیں اور ماننا پڑیگا
کہ یا تو مصنف کی یادداشت میں غلطی ہوئی یا اس مقام پر کتاب
کی عبارت میں تحریف ہوگئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مدت تالیف
کتاب کے وقت ستیس سال ہو سکتی ہے۔

عروضی کے سنہ وفات کے متعلق بالکل بے خبری ہے
صرف قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تالیف کتاب کے بعد وہ زیادہ دنوں
زندہ نہ رہے کیونکہ حسب بیان بالا اس وقت ان کی عمر ۷۵، ۸۰
کے قریب یقینی ہوگی اور عمر طبعی کی بنا پر یقینی یہ مرنے کے دن تھے
تعجب ہے کہ عوفی نے بھی اس باب میں کچھ نہ لکھا۔ حالانکہ اس کا عہد
عروضی سے بہت قریب ہے

پایۂ علم و فضل

شاہی دربار سے وابستگی ہی بتا رہی ہے کہ
ان کو تبحر علمی حاصل تھا، نیز چہار مقالہ
ان کے علمی و ادبی، سیاسی و تمدنی کارناموں پر شاہد عدل ہے
اور اس بات کی روشن دلیل ہے کہ آپ دبیری، شاعری، نجوم اور
طب چاروں فن پر پورا عبور رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ماننا
پڑیگا کہ قرآن و حدیث، منطق و فلسفہ وغیرہ وغیرہ میں بھی مہارت
تامہ رکھتے تھے کیونکہ ان کی دانست مذکورہ بالا فنون کے لئے
ناگزیر ہے۔

دبیری۔ چہار مقالہ کا عہد تالیف وہ ہے جبکہ فارسی انشا
پردازوں کی تحریر ایک نرالی روش پر جارہی تھی۔ اس عہد
کے جملہ انشا پردازوں کا طرز امتیاز یہ تھا کہ مرادفات کی
کثرت، لغات عربیہ کی بہتات، اپنے مطلب کو قافیہ پیمائی اور لفظی

صنعتگری کے ذریعہ عبارت کو جس قدر ہو سکے پیچیدہ بنایا جائے
تاکہ پڑھنے والوں کو دقت نظر سے کام لینا پڑے اور بغیر دماغ سوزی
کے فحوائے کلام تک پہنچنا دشوار ہو[5] مختصر مفہوم کے لئے الفاظ کے
گورکھ دھندوں کا ایک لق و دق طلسم خانہ کھڑا کر دیتے تھے اور وہ
اس کے اس حد عادی ہو گئے تھے کہ سیدھی طرح بات کرنے کو اپنی قدرت
تحریر کے خلاف تصور کرنے لگتے تھے عروضی نے چہار مقالہ کے اندر
جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے باعث
تعجب ہے اور یہی تعجب ہمیں ان کی قوت تحریر اور قدرت کلام کا قائل
بنا کر چھوڑتا ہے۔ صفائی و سادگی ان کا خاص طرز نگارش ہے اور
مختصر لفظوں میں طویل مفہوم ادا کر جانا ان کی ممتاز خصوصیت ہے، عبارت
کی بے ساختگی و روانی، عنوان بیان کی دلکشی و شیرینی، لفظوں کی
تراش خراش، جملوں کا جوڑ توڑ، بندشوں کی چستی، فقروں کی ہم
آہنگی، غرض عبارت کے جملہ اجزائے ترکیبی کی باہم آمیزش کچھ اس طور
پر واقع ہوئی ہے کہ جس نے ساری کتاب کو بغایت مقبول[2] اور گوارا
بنا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے نہ طبیعت اکتاتی
ہے نہ دماغ تھکن محسوس کرتا ہے کہیں کہیں رنگینی سے بھی کام لیا
گیا ہے مگر ایسے اعتدال کے ساتھ جس سے عبارت کا حسن اور
چمک گیا ہے۔

شاعری: صنعت دبیری کے علاوہ فن شعر میں بھی ان کو دستگاہ کامل
حاصل تھی اور مقالہ دوم کی آخری حکایت میں اپنے علاوہ دو اور نظامیوں
کا جو قطعہ انھوں نے نقل کیا ہے وہ ان کی بدیہہ گوئی کی زندہ مثال
ہے۔ پوری روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں عروضی ملک الجبال
شاہ غور کی خدمت میں تھے ایک دفعہ عید الفطر کے موقعہ پر امیر
عمید صفی الدین ابوبکر محمد بلخی دربار میں آگئے۔ نظامی اس وقت دربار میں موجود
تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا نظامی کو بلاؤ۔ امیر نے پوچھا یہاں نظامی بھی ہے؟
جواب ملا ہاں! امیر سمجھے النظامی منیری ہے کہنے لگے، کیا ہی بہتر
شاعر اور صالح جوان ہے۔ اتنے میں نظامی آئے اور اپنی جگہ جا بیٹھے
جب شراب کے چند دور گزر چکے تو امیر نے پوچھا نظامی نہیں آیا؟ بادشاہ
نے نظامی کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ دیکھو سامنے بیٹھا ہے! امیر نے
کہا نہیں میں اس نظامی کو میں نہیں کہتا وہ نظامی دوسرا ہے اسے
تو میں پہچانتا بھی نہیں۔ بادشاہ یہ سنکر آزردہ ہو گیا اور نظامی سے
پوچھا، واقعی تیرے سوا اور بھی نظامی ہے؟ عروضی نے نظامی
منیری اور نظامی اشری کا ذکر کیا، بادشاہ نے پھر پوچھا، تو بہتر
ہے یا وہ؟ اور امیر سے مخاطب ہو کر بولا، تم نے اسے دیکھا ہے۔ بادشاہ
نے نظامی کو اشارہ کیا۔ انھوں نے قلم اٹھایا اور ابھی دو دور بھی گزرنے
نہ پائے تھے کہ یہ پانچ شعر سنائے ؎

در جہاں سہ نظامیم اے شاہ   کہ جہانے ز ما بافغانند
من بود ستاد پیش تخت شہم   واں دو در مرو پیش سلطانند
بحقیقت کہ در سخن امروز   ہر یکے مفخر خراسانند
گرچہ ہمچوں رواں سحر دانند   ور چہ ہمچوں خرد سخن دانند
من شرابم کہ شاں چو نوشیدم   ہر دو از کار خود فرو مانند

قطعہ سنتے ہی امیر ان کے کمال شعری اور بدیہہ گوئی کا قائل ہو گیا
علم میں ان کی کوئی تصنیف پائی نہیں جاتی۔ چند ہجویہ قطعے اور
متفرق اشعار تذکرہ نویسوں نے نقل کئے جاتے ہیں۔
رودکی پر کسی نے جہالت و نادانی کا طعن کیا تھا۔ اس کے جواب
میں کہتے ہیں ؎

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی   ایں طعن کردن تو ز جہل و ز کودکیست
کاں کس کہ شعر داند داند کہ در جہاں   صاحب قران شاعری استاد رودکیست

شکایت زمانہ میں ایک قطعہ ہے ؎

سلامت زیر گردوں گام ننہاد   خدا راحت دریں ایام ننہاد
ز گردوں آرمیدہ چوں تو د خلق   کہ خود ایزد درو آرام ننہاد
جہاں بر وفق نام خود جہان است   خرد او را گزاف ایں نام ننہاد
خنک آں را کہ از میدان ارواح   قدم در عالم اجسام ننہاد

---

[1] وہ دیکھنا ہو تو خود اسی عہد کی تالیف مقامات حمیدی ملاحظہ کیجئے۔ مذاقی۔

[2] دبیری کے ثبوت میں یہ عبارت آمیز بیتیں نہیں کیا ہے اور کیا پیش کیا جائے ساری کتاب ایک ساتھ ہے۔ جس کو اس کا لطف اٹھانا ہو اصلی کتاب اٹھا کر پڑھے۔

(مذاقی)

[illegible] مدح اور شاہوں کے بقائے دوام کا ذریعہ ہے ؎

بسا کاخا کہ محمود شہ بنا کرد | کہ از رفعت ہمی با مہ مرا کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت بر پائے | مدیح عنصری ماند است بر جائے

ایک اور شعر ہے ؎

وے دارم کہ در فرمان من نیست | تو پنداری کہ آں دل زان من نیست

چند اور شعر ہیں ؎

مرا مادر دعا کرد است گوئی | کہ از تو دور [illegible]
نگارا [illegible] | [illegible]
بیا آں سرخ گل [illegible] | [illegible]
اگر [illegible] | [illegible]
اگر [illegible] بیت یک یک بر شمارم | [illegible]
ہمہ مہری [illegible] | [illegible]

نجوم:- مقالہ سوم کی آخری حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو [illegible] میں پوری مہارت حاصل تھی اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے عمر خیام آپ کے استاد تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے [illegible] کی تحصیل یقینی عمر خیام ہی سے کی۔ عمر خیام کی [illegible] ہے۔ جس کے ثبوت میں خیام کی خود اپنی قبر کے متعلق پیشین گوئی اور حکایت جو مصنف نے اپنی کتاب میں ذکر کی ہے (ص ۹۰-۹۹) پیش کی جا سکتی ہے مصنف نے جو اپنا قصہ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

[illegible] کی جنگ میں جو سلطان سنجر سلجوقی اور سلطان علاء الدین غوری کے درمیان ہوئی تھی خود سلطان علاء الدین مغلوب ہو کر گرفتار ہو گیا تھا۔ اور شاہزادہ شمس الدین محمد بن مسعود غوری بھی گرفتار ہو کر ہرات کے اسپہسالار کے ہاتھوں میں پڑا۔ شاہزادہ کی رہائی کے لئے پچاس ہزار دینار رقم مقرر ہوا کہ جس دن یہ رقم ہرات پہنچ جائیگی شاہزادہ آزاد ہو جائیگا۔ انہیں دنوں عروضی شاہزادہ سے ملنے آئے۔ نہایت افسردہ ہو کر عروضی سے پوچھا آخر یہ رقم کب تک یہاں پہنچیگی۔ میں کب تک رہوں گا۔ عروضی نے جائے قیام پر واپس آ کر زمین [illegible] اعمال [illegible] میں لائے معلوم ہوا کہ تیسرے روز رہائی ہوگی

دوسرے روز شاہزادہ کے پاس گئے اور بیان کیا کہ کل ظہر کے وقت رقم آ جائیگی اور آپ آزاد ہو جائیں گے۔ شاہزادہ اس دن صبح سے منتظر رہا، عروضی بھی موجود تھے۔ یہاں تک کہ ظہر کی [illegible] شہزادہ نے [illegible] وقت تو آ گیا اور تمہارا وعدہ اب تک پورا نہیں ہوا۔ اسی اثنا میں ایک قاصد دوڑتا آیا اور مژدہ سنایا کہ رقم آ گئی۔ دوسرے دن شاہزادہ رہا ہو کر اپنے دار الخلافہ میں آیا اور عروضی کا منہ اشرفیوں سے بھر دیا۔ لیکن چونکہ منہ میں [illegible] زیادہ نہ آ سکتی تھیں اس لئے آستین میں اشرفیاں بھر دیں۔

طب:- مقالہ چہارم کی آخری حکایت بتاتی ہے کہ آپ فن طب میں بھی [illegible] رکھتے تھے [illegible] روایت کا خلاصہ یہ ہے۔

[illegible] میں جب آپ سلطان سنجر کے ہمراہ [illegible] میں پھرتے تھے [illegible] ایک شخص کے مکان [illegible] باتیں [illegible] کھانے [illegible] امر گئے تو جس کے [illegible] یہاں [illegible] تھے [illegible] ان کی تعریف شروع کر دی کہ لوگ انہیں [illegible] شاعر مانتے [illegible] حالانکہ [illegible] نجوم طب [illegible] اس کے علاوہ بہت سے علوم میں [illegible] جب عروضی واپس آئے تو صاحب خانہ نے ان کا احترام کیا اور اسی طرح کیا جیسے کوئی حاجتمند اس شخص کا احترام کرتا ہو جس سے کار برآری کی امید ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے قریب آ بیٹھا۔ اور کہنے لگا میری ایک لڑکی ہے جس کے سوا میرا کوئی نہیں اور دولت کافی ہے اس کو ایک مرض ہے کہ [illegible] دس پندرہ من خون جاتا ہے اور ضعف بہت ہو جاتا ہے میں نے طبیبوں سے مشورہ کیا اور بہتوں کا علاج کرایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا [illegible] پیٹ میں [illegible] اور درد ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر سے سیلان کے باعث ضعف غالب آ جاتا ہے عروضی نے کہا اب کے وقت پر مجھے اطلاع دو چنانچہ چند دنوں کے بعد ان کو اطلاع دی گئی تو انہوں نے لڑکی کی نبض دیکھی، حالات کا معائنہ کیا طبی اصول سے جو دس چیزیں قابل لحاظ ہیں وہ سب درست تھیں بظاہر مرض کا کوئی سبب نہیں ہوتا تھا آخر انہوں نے فصاد کو بلوایا اور رگ باسلیق کھلوا کر خون فاسد نکلوا دیا۔ اس کے بعد معمولی مفرحات و معدلات

کے ذریعہ ایک ہفتہ کے معالجہ میں تندرست ہو گئی اور کوئی شکایت باقی نہ رہی۔ درست کی کمی [illegible] معاملات [illegible] تمام مقالہ کے متعلق کچھ رکھا جا سکا [illegible] سلسلے میں [illegible] وقت [illegible] خواہ ہوں انشاء اللہ [illegible] تحقیق [illegible] پیش کیا جائیگا [illegible]

اعجازِ تغزّل

حضرت بیخود دہلوی

کرامت یہ ہوئی ظاہر چمن میں بادہ خواروں سے
برس کر جب کھُلا تو پھُول برسے شاخساروں سے

تجلی تیری کب کرتی ہے پردہ جاں نثاروں سے
نکلتی دیکھ لی ہے روشنی اکثر مزاروں سے

بہار ابکے نئی آئی ہے کچھ اگلی بہاروں سے
بجائے غنچہ نکلے شاخسانے شاخساروں سے

سُنا ہے ہم نے ظالم ہیں بہت دلکش تری آنکھیں
مزا جب ہے کہ یہ دل چھین لیں پرہیزگاروں سے

رسائی آہ سوزاں کی فقط اتنی نظر آئی
چمک جاتی تھی اک بجلی سی کچھ اونچی ستاروں سے

سمٹنا پھیلنا جھکنا سنبھلنا ان کا حصّہ ہے
تڑپنا سیکھتی ہے برق تیرے بیقراروں سے

جلایا خرمنِ گل کو تری برقِ تبسّم نے
یہ وہ بجلی ہے جو بچکر گری گلشن میں خاروں سے

نہ آنکھوں کو خبر تیری نہ دل آگاہ ہے تجھسے
چھپایا راز تیرا ہم نے ایسے رازداروں سے

شہیدانِ وفا کی خاک پر کیسے گل نرگس
تمھارے شوق میں آنکھیں نکل آئیں مزاروں سے

اگر تخمِ محبت باغباں گلشن میں بو دیتا
بجائے برگِ گل شعلے نکلتے شاخساروں سے

نہ چھیڑو بیخود مضطر کو تم اچھا نہیں دیکھو
ستانا دلفگاروں کو، اُلجھنا بیقراروں سے

طبعزاد افسانہ

شادی

(از جناب چودھری عبدالرشید صاحب تبسم۔ بی اے)

آج سے کئی برس پیشتر کا ذکر ہے کہ میں لاہور شہر کے ایک گمنام محلے میں مقیم تھا۔ اس محلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخلوط آبادی تھی۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ مذہب کی بنا پر ان لوگوں میں کبھی کشیدگی پیدا نہ ہوتی تھی۔ مگر یہ یقینی بات ہے کہ میرے وہاں آٹھ سال کے قیام کے دوران میں ایک دفعہ بھی کوئی ناخوشگوار بات نہ ہوئی۔ محلے کے تمام لوگ اپنے آپ کو ایک برادری تصور کرتے تھے۔ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے اور آڑے وقت کام آتے تھے میرے پڑوس میں ایک طرف خان بہادر حبیب احمد کا مکان تھا اور دوسری طرف ناتھ بابو کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ خان بہادر بڑے امیر آدمی تھے اور ناتھ بابو کا تیس روپے ماہوار میں بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ جیسے میرا مکان ان دو پڑوسیوں کے درمیان میں واقع تھا۔ اسی طرح میری حیثیت بھی ان کی حیثیتوں کے بیچ میں تھی۔ مگر وہاں امارت اور افلاس کا کسی کو احساس ہی نہ تھا سب ایک دوسرے کو اپنا گویا دوست سمجھتے تھے۔ محلے میں مشہور تھا کہ مجھ میں اور خانبہادر میں گاڑھی چھنتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خانبہادر کی نسبت میرے تعلقات ناتھ بابو سے زیادہ تھے۔ مجھے جو خوشی ناتھ بابو سے مل کر ہوتی وہ خانبہادر سے ملنے پر نہ ہوتی۔ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے اور ناتھ بابو کے درمیان کسی بات کا کوئی پردہ نہ تھا۔ آپ کہیں گے کہ وہ ہندو تھا اور میں مسلمان پھر اتنا میل کیسا؟ دراصل بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے نہ تو مجھے ہی مسلمان رہنے دیا تھا اور نہ ناتھ بابو ہی ہندو رہا تھا۔ گویا لامذہب ہونے کی حیثیت سے ہم دونوں کا مذہب ایک تھا۔ البتہ جہاں تک ظاہر ہے کا تعلق تھا میں مسلمان تھا اور ناتھ ہندو۔ ہم مذہبی رسوم میں باقاعدہ حصہ لیتے تھے۔ مگر خدا کے خوف سے نہیں بلکہ ہم انسانوں کے ڈر سے ایسا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کا ٹریسماجی زندگی تک ہی محدود ہوتا ہے۔ ہم ہی سماج کی نظروں میں ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے۔ مگر دراصل ہم میں بعد موجود نہ تھا۔

ناتھ بابو کی اولاد صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کا کوئی قریبی رشتہ دار موجود نہ تھا۔ اگر موجود بھی تھا تو وہ ناتھ بابو جیسے غریب آدمی سے اپنا تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال میں نے کبھی نہ دیکھا کہ ناتھ بابو کا کوئی قریبی رشتہ دار اس سے ملنے آیا ہو۔ ناتھ بابو کی ماہوار آمدنی تیس روپے تھی۔ اس میں بات بڑی مشکل سے گزارہ کرتے۔ پھر بھی آفریں ہے ناتھ بابو کو کہ اس نے لڑکی کو تعلیم دلانے میں کوتاہی نہ کی۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا یا نہ ہوتا مگر لڑکی کی فیس وقت پر ادا ہو جاتی۔

میں ابھی نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ دفتر میرے نزدیک ایک قفس تھا۔ جونہی دفتر کا وقت ختم ہوتا۔ میں سمجھتا کہ قفس کا دروازہ کھل گیا ہے۔ جس طرح مہینوں کا اسیر پرندہ یکدم رہا ہو جانے پر فوراً اپنے آشیانے کی طرف پرواز کر جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں دفتر سے فارغ ہو کر جلدی جلدی گھر پہنچ جاتا۔ گھر میں میرے لئے سوائے اس کے

اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بیشمار کتابیں موجود تھیں۔ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا۔ میری شادی ابھی ہوئی نہ تھی۔ اس لئے مجھے گرہستی زندگی کے بکھیڑوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

ایکدن ناتھ بابو نے مجھ سے کہا۔

"بھیا! اگر مانو تو ایک بات کہوں"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ناتھ! تم عجیب آدمی ہو۔ اس قسم کے بےمعنی سوال نہ کیا کرو۔ کون سی بات ہے جو میں تمہاری خاطر کرنے کو تیار نہیں"۔

ناتھ بولا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ مجھے تمہاری مصروفیتوں کا خیال آتا ہے۔ تم مصروف آدمی ہو۔ لیکن تمہیں تکلیف نہ دوں تو کس کو دوں۔ تم شیلا کو انگریزی پڑھا دیا کرو۔ وہ انگریزی میں ذرا کمزور ہے اور امتحان بہت قریب آ چکا ہے"۔

میں نے وعدہ کر لیا کہ ہر روز ایک گھنٹہ شیلا کو انگریزی پڑھا دیا کروں گا۔ دوسرے ہی دن سے شیلا باقاعدہ مجھ سے سبق لینے لگی بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ شیلا نسوانی حسن ہی کا ایک مکمل ترین شاہکار نہیں بلکہ حسن اخلاق کے لحاظ سے بھی وہ ایک دیوی ہے۔ صبح کے وقت جب وہ ماتھے پر قشقہ لگا کر کتابیں ہاتھ میں لئے سکول کو جاتی تو یوں معلوم ہوتا کہ ایک دیوی سنسار کو درس حیات دینے جا رہی ہے

شیلا بلا کی ذہین لڑکی تھی۔ جو سبق ایکدفعہ پڑھ لیتی۔ اُسے قیامت تک نہ بھولتا۔ خدا جانے وہ انگریزی میں کیوں کمزور رہ گئی تھی۔ بہر حال میں نے چند ہی دن میں اس کی کمی پوری کرا دی۔ آخرمیں امتحان ہوا اور وہ کامیاب ہو گئی۔ ناتھ بابو میں اتنی طاقت نہ تھی کہ شیلا کو کالج میں داخل کرا سکتا۔ اس لئے چاروناچار اس کا سلسلہ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔

اب ناتھ بابو کو شیلا کے بیاہ کی فکر تھی۔ پہلے بھی کئی دفعہ میں نے سنا تھا کہ شیلا کی منگنی ہو رہی ہے۔ مگر ہر بار بعد میں یہی سننے میں آتا۔ کہ اس کی منگنی ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ شیلا کا معاملہ ناتھ بابو کا خاص ذاتی معاملہ تھا۔ اس لئے میں نے اس باب میں

ناتھ بابو کا خاص ذاتی معاملہ تھا۔ اس لئے میں نے اس باب میں ناتھ بابو سے کچھ پوچھنا روا نہ جانا۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ روز بروز ناتھ بابو کے چہرے پر تفکرات کے بادل چھا رہے تھے۔ انتہائی مشکلات کے وقت بھی ناتھ بابو مسکراتے رہنے کا عادی تھا۔ لیکن اب وہ کوشش کے باوجود مسکرانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ شیلا کا گلاب سا چہرہ بھی کملا کر رہ گیا تھا۔ یا تو وہ باتیں کرنے کا بہانہ سوچتی رہتی تھی۔ یا اب اس کے منہ کو بالکل ہی مہر سکوت لگ گئی میرے ہاں اب اس کا آنا جانا تو کم تھا۔ مگر دو ایک بار وہ ضرور نظر آ جاتی۔ ناتھ بابو بدستور ہر روز شام کو میرے ہاں آتا۔ اب وہ چپ چاپ آتا۔ اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چپ چاپ ہی واپس چلا جاتا یہ صورت حالات میں زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ آخر ایکدن میں نے پوچھ ہی لیا۔

"کیوں ناتھ؟ یہ کیا بات ہے۔ تم ہر وقت خاموش رہتے ہو۔ شیلا بھی کچھ غمگین رہتی ہے۔ میں عرصہ سے اس ٹوہ میں تھا کہ تمہاری اس بےچینی کی وجہ معلوم کر سکوں مگر میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھ سے تمہاری کون سی بات چھپی ہے۔ جو یہ بات چھپاؤ گے سچ سچ بتاؤ بھیا"۔

ناتھ بابو پہلے تو کچھ ہچکچایا۔ پھر میرے اصرار پر بولا۔

بھیا مظفر کیا بتاؤں۔ دنیا نے بہت ذلیل کر دیا ہے۔ تم جانتے ہو شیلا جوان ہے۔ میں دو سال سے کسی اچھے بر کی تلاش میں ہوں۔ اوّل تو ٹھکانے کا بر ہی نہیں ملتا۔ لیکن جو ملتا بھی ہے وہ لڑکی کے ساتھ روپیہ بہت مانگتا ہے۔ میں ٹھہرا غریب آدمی تیس روپے ماہوار میری آمدنی ہے۔ بڑی مشکل سے تھوڑا بہت جہیز تیار کیا ہے۔ نقد رقمیں کہاں سے دوں۔ کئی دفعہ بات بن بن کر بگڑ چکی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں"

اتنا کہکر ناتھ رونے لگا۔ مجھ سے اس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ پھر بھی اپنے دل کو کڑا کر کے میں نے ناتھ کو تسلی دی۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جس شخص کو کسی مادی چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ الفاظ دیا کرتی ہے۔ میرے [illegible]

[illegible] کے لئے بھی ہمدردی تھی۔ مگر اس وقت میں بھی پکا دنیا دار بنا ہوا تھا۔ اسے روپے کی ضرورت تھی اور میں الفاظ اس کے کانوں میں ٹھونس رہا تھا۔

ناتھ نے ایک آہ بھری اور اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے بھی اصرار نہ کیا کہ وہ زیادہ دیر بیٹھا رہے۔ اس حالت میں اس کا چلا جانا ہی بہتر تھا۔ وہ چلا گیا تو میں دنیا کی ذہنیت اور اس کے رسم و رواج پر غور کرنے لگا۔ شیلا ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اسے کوئی شخص محض اس لئے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ کہ اس کا باپ اس کے ہمراہ نقد روپیہ نہ دے سکتا تھا۔ گویا دنیا کی نظر میں سب سے زیادہ وقعت روپے کی ہے جو صوری قابلیت اور خوش اخلاقی کسی شمار میں نہیں۔ میں نے سوچا کہ ہمارے ملک میں کتنے گھر اس قسم کی مصیبت سے دوچار ہوں گے۔ ہم اپنے آپ کو مہذب اور پڑھے لکھے کہلاتے [illegible] کوئی انتہا نہیں۔ ہم ہر چیز کو روپے [illegible] اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جو چیز اس پیمانے پر پوری نہ اترے اسے ہم ذلیل اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔

میں بڑی دیر تک ناتھ کی اس مصیبت پر افسوس کرتا رہا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں ناتھ کی مدد کروں۔ مگر میں ابھی نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ میرے پاس روپیہ بالکل جمع نہ تھا۔ تنخواہ بھی کچھ اتنی زیادہ نہ تھی۔ اس میں سے ایک تہائی کتابوں کا بل ادا ہوتا۔ ایک تہائی مکان کا کرایہ، نوکر کی تنخواہ اور دیگر ضروریات زندگی صرف ہو جاتی۔ اور باقی روپے دوستوں کی دعوتوں، سنیما اور دیگر فضول خرچیوں میں ضائع ہو جاتے۔ بھلا میں کس طرح ناتھ کی مالی مدد کر سکتا تھا۔ سب کچھ دیکھا اور ناچار خاموش ہو رہا۔

ایک دن شام کے وقت میں کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھا کہ میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو ناتھ بابو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی اور ناتھ بابو سے باتیں کرنے لگا۔ ناتھ بابو نے چھوٹتے ہی کہا۔

"مظفر! تم یہ سنکر خوش ہو گے کہ شیلا کی منگنی ایک بڑے ہی اچھے گھرانے میں ہو گئی ہے۔ میں نے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی ہے۔ بس آئندہ ماہ کی چودھویں کی مہورت ہے۔ لڑکا نوکر ہے کوئی اسی روپے تنخواہ پاتا ہے۔"

یہ سنکر میں بہت خوش ہوا۔ ناتھ کو میں نے مبارکباد دی اور بڑی گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ہم بڑی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اب ناتھ بابو پھر وہی پرانا ناتھ بابو تھا۔ اسے شگفتہ خاطر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے پر سے ایک بہت بڑے بوجھل پتھر کی سل کسی نے اٹھا دی ہو۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ شیلا کے چہرہ پر بھی اداسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

جوں جوں شیلا کی شادی کا دن قریب آتا گیا۔ ناتھ بابو کی مصروفیتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر بات میں وہ مجھ سے ضرور مشورہ [illegible] کام چھوڑ کر بھی اس کی مدد کے لئے حاضر رہتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ محلے کے لوگ میری اور ناتھ بابو کی دوستی کے متعلق در حقیقت کیا رائے رکھتے تھے۔ لیکن جہاں تک ظاہریت کا تعلق تھا۔ تمام لوگ ہماری اس دوستی پر صاد کرتے تھے۔ میں ناتھ کے ہر کام میں شریک رہا۔ یہاں تک کہ براتیوں کے لئے ہر چیز تیار ہو گئی۔

آخر شادی کا دن آ پہنچا۔ برات بڑی دھوم دھام سے آئی۔ اب ناتھ بابو کا صرف اتنا کام تھا کہ وہ برات کو کھانا وغیرہ کھلائے۔ میری مدد کی اسے ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی میں نے دفتر سے ایک دن کی رخصت لے لی۔ اور گھر ہی پر موجود رہا۔ ناتھ بابو سے میں نے کہہ دیا۔ کہ اگر میں کوئی اور خدمت کر سکوں تو وہ مجھے آواز دے کر بلا لے۔

فرصت کو غنیمت سمجھ کر میں نے ایک نئی کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگا۔ یہ عرب شاعر متنبی کا دیوان تھا۔ اس کے متنوع خیالات مجھے ایسے پسند آئے کہ میں دیوان کو پڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دن ڈھل گیا۔ کوئی تین بجے کا وقت ہو گا کہ ناتھ بابو کے ہاں کچھ [illegible] ہوتی مجھے سنائی دی۔ میں نے اٹھ کر ادھر کی کھڑکی بند کر دی اور پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ

ناتھ بابو میرے کمرے میں داخل ہوا۔ مگر اس طرح کہ اس کی پگڑی اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ناتھ بابو کو اس حالت میں دیکھ کر میرے ہوش و حواس معطل ہو گئے۔ مجھے پتہ نہیں کہ میں اپنی کرسی سے کب اٹھا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ میں نے ناتھ بابو سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ ناتھ بابو نے لکنت آمیز لہجہ میں کہا۔

"میرا سمدھی لڑکی کے ساتھ دو ہزار روپیہ مانگتا ہے۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ میں دو ہزار کہاں سے دوں۔ اب وہ لڑکے کو بن بیاہے واپس لے جا رہا ہے۔ ہائے میری ناک کٹ گئی۔"

میں نے پوچھا۔

"مگر روپے کے متعلق پہلے کوئی بات طے نہ ہوئی تھی؟"

ناتھ بابو نے جواب دیا۔

"پہلے نہ تو انہوں نے اس کا ذکر کیا اور نہ میں نے ہی کچھ کہا۔ اب انہوں نے جہیز دیکھا تو بولے لاؤ روپیہ کہاں ہے۔ جب میں خاموش رہا تو بولے ہم اس لڑکی کو لے کر کیا کریں کہ جس کے ہمراہ روپیہ نہیں۔ یا تو ہمیں دو ہزار روپیہ دو۔ ورنہ ہم لڑکے کو یونہی واپس لے جاتے ہیں۔ ہمیں لڑکیوں کا کال نہیں"۔

یہ سنکر میں سناٹے میں آگیا۔ اسی وقت ناتھ بابو کو ہمراہ لے کر باہر آیا۔ محلے کے چند اور آدمیوں کو ساتھ لیا اور ناتھ بابو کے سمدھی کے پاس پہنچا۔ ہم سب نے اس کی لاکھ منت کی مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ جب وہاں سے مایوسی ہوئی تو میں سیدھا خانبہادر کے پاس پہنچا۔ خان بہادر کی جائداد اور نقد دولت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اگر وہ دو ہزار روپے ناتھ بابو کو دے دیتا تو اسے محسوس تک نہ ہوتا کہ اس کی دولت کچھ کم ہو گئی ہے۔ اور ناتھ بابو کی آبرو بچ جاتی۔ خانبہادر سے میری اچھی خاصی بے تکلفی تھی۔ میں نے تفصیل کے ساتھ سارے واقعات خانبہادر کو سنائے اس کے بعد دو ہزار روپے کی مدد طلب کی۔ میری تمام گفتگو کے جواب میں خان بہادر مسکرا دیئے اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔ میں نے سمجھا کہ وہ روپے لینے گئے ہیں۔ مگر جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ درحقیقت میری اس گفتگو سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میں اپنے آپ کو کوستا ہوا کہ ایسے آدمی کے پاس کیوں آیا۔ واپس لوٹ آیا۔ برات سچ مچ لڑکے کو بن بیاہے واپس جا رہی تھی۔ ناتھ بابو ایک گوشے میں بیٹھا اپنے سر کو پیٹ رہا تھا۔ اور شیلا؟ اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ اندر سے غیر مسلسل ہچکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھ پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ میں نے دل کھول کر دنیا اور اس کے رسم و رواج پر لعنت بھیجی۔ میں ناتھ بابو کو ذلت سے بچانا چاہتا تھا۔ مگر میرے پاس طاقت نہ تھی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ نہ صرف ناتھ بابو ہی اس بر کو پسند کرتے تھے بلکہ شیلا بھی وہیں شادی کرانا چاہتی تھی۔ تو میرا دل ٹوٹ ہی گیا۔

برات واپس چلی گئی تو میں نے ناتھ بابو کو تسلی دی۔ شیلا کو بھی اندر سے بلایا اور بہت کچھ سمجھایا۔ میرے دل میں ان کے لئے بے پناہ ہمدردی تھی۔ مگر میں ان کے کسی کام نہ آ سکتا تھا۔ ناتھ یہ ذلت اس طرح دور ہو سکتی تھی کہ فوراً ہی شیلا کو کسی اور شخص سے بیاہ دیا جاتا۔ مگر بغیر روپے کے کوئی شخص اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں مسلمان تھا اور شیلا ہندو تھی۔ ہمارے درمیان مذہب کی دیوار حائل تھی۔ میں کہہ چکا ہوں کہ درحقیقت ہمارا مذہب ایک تھا۔ تو یوں کہو کہ رائے عامہ کی دیوار ہمارے درمیان حائل تھی۔ محض دنیا کے ڈر سے ہم رشتہ میں منسلک نہ ہو سکتے تھے۔ مجھے شیلا کو قبول کرنے میں تامل نہ تھا اور غالباً شیلا کو بھی عذر نہ تھا۔ رہا ناتھ بابو۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی خیال کرتا۔ ایک کنبے کو اس قسم کی کشمکش سے نجات دلانا کتنی بڑی نیکی ہے؟ مگر میں بندوں کے ڈر سے یہ نیکی نہ کر سکا۔ چاہا کہ ناتھ بابو سے اپنی اس خواہش کا اظہار کروں لیکن جرأت نہ ہوئی۔ ناچار خاموش رہا۔ اس واقعے نے میرے دل میں ایک ناسور سا ڈال دیا۔

دوسرے ہی دن میں دفتر سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر اپنے وطن پہنچا اور اپنی جائداد فروخت کر دی۔ رشتہ دار پیچھے کہتے رہ گئے۔ باپ دادا کی پیدا کی ہوئی جائداد کو کوڑیوں کے مول

[illegible] مگر میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ مجھے معلوم نہیں اس جائداد کی
[illegible] قیمت کیا تھی۔ مجھے دو ہزار روپے پیش کئے گئے۔ میں نے
پیشکش فوراً قبول کرلی۔ ابھی ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ دو
ہزار روپے لے کر میں واپس لاہور پہنچ گیا۔ دوسرے دن
ناتھ بابو مسکراتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔

"بھیا! ایک راز کی بات ہے۔ آج صبح اٹھ کر دروازہ
کھولا تو دہلیز پر ایک گٹھڑی پڑی ہوئی پائی۔ کھول کر دیکھا تو
اس میں دو ہزار کے نوٹ تھے۔ سوچتا ہوں یہ کون پھینک گیا
کہیں مجھے پھنسانے کے لئے کسی دشمن نے چال نہ چلی ہو۔ جو تم
کہو کروں"

میں نے کہا۔

"ناتھ بابو۔ تم اس روپیہ کو خدا کی دین سمجھو۔ یہ تمہاری
شیلا کی شادی کے لئے ہیں۔ کیا پتہ ہے خانبہادر کو تم پر ترس
آگیا ہو۔ اپنے ہاتھ سے روپیہ دینے کی بجائے اس نے تمہیں
یوں بھجدیئے ہوں۔ میری مانو تو اس بات کا کسی سے ذکر
نہ کرو۔ خاموشی سے شیلا کی شادی کردو"

ناتھ بابو نے میرا مشورہ قبول کرلیا۔ اس نے اسی دن
اپنے سمدھی کو لکھ بھیجا کہ دو ہزار روپیہ تیار ہے تم برات لے کر
آؤ اور لڑکا شیلا کو بیاہ لے جائے۔ ایک ہفتہ میں شیلا کی شادی
اسی لڑکے سے ہوگئی۔ جو اسے چھوڑ گیا تھا۔ اس پر میرے دل کو
جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ناتھ بابو بہت سادہ
آدمی تھا۔ شادی کے دوسرے ہی دن وہ خانبہادر کے ہاں گیا
دو ہزار روپے کی گٹھڑی والا معاملہ سنا کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا
خانبہادر نے پہلے تو تیوری چڑھائی مگر پھر مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

اب میری اپنی شادی کا معاملہ درپیش تھا۔ کیا میں بھی
لڑکی کے ساتھ دو ہزار روپیہ مانگتا؟ میرے حالات ایسے تھے
[illegible] کوئی نہ کوئی شخص واقعی لڑکی کے ساتھ روپیہ دیدیتا
میں نے تہیہ کرلیا۔ کہ میں کسی امیر آدمی کی لڑکی کی شادی
[illegible] کروں گا۔ جہاں سے بھی روپیہ ملنے کی توقع ہوگی۔ بس اسے
ٹھکرا ہی دوں گا۔ چنانچہ کئی جگہ سے میرے لئے رشتے آئے۔ مگر
میں نے نہایت غرور کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ جب میں کسی کو
جواب دیدیتا تو وہ روپیہ کی مقدار اور بڑھا دیتا۔ گویا کہ
پہلے اس نے کم رقم بتائی تھی۔ اس پر مجھے اور بھی غصہ آتا۔
میں نے بیسیوں نہیں سیکڑوں رشتوں کو ٹھکرا دیا۔ خانبہادر کی
لڑکی حسن آرا بھی جوان تھی۔ اس نے اسی سال بی اے کا
امتحان پاس کیا تھا۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور سلیقہ شعار
بھی۔ پھر خان بہادر مجھے پسند بھی کرتے تھے۔ میرے دوستوں نے
مجھے بارہا مشورہ دیا کہ میں خانبہادر سے درخواست کر دیکھوں
مگر میں نے صاف انکار کردیا۔ دو ایک ایسے آدمیوں نے بھی
مجھے یہ مشورہ دیا۔ جو میرے بھی دوست تھے۔ اور خانبہادر کے
ہاں بھی ان کا آنا جانا تھا۔ مگر میں نے ان کو اپنے خیالات سے
آگاہ کردیا۔ اس پر وہ خاموش ہوگئے۔

ایکدن صبح ہی صبح میں روزانہ "انقلاب" پڑھ رہا تھا۔ یکایک
میری نظر ایک اشتہار پر جا پڑی۔ اشتہار کے الفاظ یہ تھے۔

رشتہ کی ضرورت

ایک نہایت غریب لڑکی کے لئے رشتہ کی ضرورت ہے
لڑکی کو جہیز وغیرہ کچھ نہیں دیا جائے گا۔ لڑکی چنداں خوبصورت
بھی نہیں۔ صرف وہی حضرات درخواست کریں جو محض
رحمدلی سے کام لے کر شادی کرنے کے خواہشمند ہوں۔ خط و
کتابت اخبار "انقلاب" کی معرفت کی جائے۔

یہ اشتہار پڑھ کر مجھے ناتھ بابو کا ماجرا یاد آگیا۔ میں نے
دل میں سوچا بھلا اس لڑکی کو کون قبول کرے گا۔ جو غریب
ہونے کے علاوہ بدصورت بھی ہے۔ میں اس لڑکی سے شادی کرکے
اپنے تمام رشتہ داروں اور امیر دوستوں کی گردنیں ندامت سے
جھکا دوں گا۔ آئندہ کم از کم میرے متعلقین میں سے کوئی شخص
لڑکی کے ساتھ روپیہ نہ مانگا کرے گا۔ میں نے فوراً قلم اٹھایا اور
بغیر سوچے سمجھے اخبار "انقلاب" کو ایک خط لکھ دیا۔ اپنی درخواست
میں میں نے اپنے حالات مفصل بیان کردیئے۔ تیسرے دن مجھے

ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ لڑکی کے والد نے گفت وشنید کے لئے
ایڈیٹر صاحب "انقلاب" کو اختیار دے دیا ہے۔ میں ان سے مل کر معاملہ
طے کروں۔ دوسرے دن میں "انقلاب" کے دفتر میں پہنچا۔ ایڈیٹر سے
اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے عینک میں سے گھور کر مجھے سر سے
پاؤں تک دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہا۔

"تم اچھے پڑھے لکھے نوجوان معلوم ہوتے ہو۔ یہ بلا کیوں مول
لے رہے ہو؟ لڑکی بے انتہا غریب ہے۔ جہیز بالکل نہیں ملے گا۔
نقد روپیہ کی تو شکل تک نہ دیکھو گے۔ لڑکی ناخواندہ بھی ہے۔ ان
حالات کے ہوتے ہوئے اگر تم یہیں شادی کرانا چاہو تو تمہیں اختیار ہے"

میں نے جواب دیا۔

"مجھے ایسی ہی بیوی کی ضرورت ہے"

انہوں نے پھر کہا۔

"مگر اس کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں۔ اس کی صورت
دیکھ کر متلی آتی ہے۔ چونکہ کوئی شخص اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا
اس لئے اشتہار دیا گیا۔ یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ اس اشتہار کے
جواب میں سوائے تمہارے کسی دوسرے شخص کی درخواست
نہیں آئی۔ اب بھی وقت ہے۔ تم اپنی درخواست واپس
لے سکتے ہو"

میں نے سامنے ٹنگے ہوئے کلاک کی طرف گھونسا تانتے ہوئے
کہا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں اسی لڑکی سے شادی کروں گا
میں دنیا کو سبق دینا چاہتا ہوں۔ میرے اس ارادہ میں کوئی
طاقت حائل نہیں ہو سکتی"

"بہت اچھا۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ شادی کے وقت کن
رسموں کی پابندی کریں گے" ایڈیٹر صاحب نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔

"میں کسی رسم کی پابندی نہیں کروں گا۔ لڑکی کے والد کو
جو سی تاریخ منظور ہو اس دن میں اکیلا ان کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا
یا وہ اپنی لڑکی کو میرے ہاں بھیج دیں۔ بس اس سے زیادہ کوئی رسم
نہ ہو گی"

ایڈیٹر صاحب پھر مسکرائے۔ اتنے میں ایک مولانا کمرے
میں داخل ہوئے۔ ایڈیٹر صاحب نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مولانا! یہ مسٹر مظفر ہیں۔ یہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی کے
والد نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں ان کی وکالت کرتے ہوئے انکی
لڑکی کا نکاح ان سے کر دوں۔ اتفاق سے آپ بھی آ گئے ہیں
یہاں دفتر میں سے ایک آدمی اور بلا لیتے ہیں۔ دو گواہ اور
ایک قاضی۔ بس ابھی نکاح ہو جائے"

مجھے اس عجلت پر حیرانی تو ہوئی مگر میں نے ان کی اس
تجویز کو فوراً قبول کر لیا۔ اسی وقت میرا نکاح پڑھ دیا گیا۔ میں
اپنے خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ مجھے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا
کہ انہوں نے لڑکی کا کیا نام بتایا اور اس کے باپ کا کیا نام لیا۔
مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ میں نے "مجھے منظور ہے" کہا تھا۔ دو
منٹ میں یہ ساری کارروائی ختم ہو گئی۔ جب میں وہاں سے
روانہ ہونے لگا تو ایڈیٹر صاحب نے اٹھ کر بڑے زور سے مجھ سے
معانقہ کیا۔ جیسے گویا کہ مجھے صوبے کے کسی بڑے آدمی نے اپنی فرزندی
میں لے لیا ہے۔

ایڈیٹر صاحب نے مجھ سے کہہ دیا کہ آئندہ جمعہ کی شام کو تمہاری
بیوی تمہارے گھر پہنچ جائے گی۔ میں نے کوئی بات تفصیل کے
ساتھ پوچھنا نہ چاہی۔

میرے لئے اشتہار کی عبارت اور ایڈیٹر صاحب کی گفتگو کافی تھی
میں اپنی قسمت پر خوش تھا۔

جمعہ کی شام کو میں بیٹھا اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ یکایک
ایک برقعہ پوش لڑکی سیڑھیوں پر سے ہوتی ہوئی میرے کمرے
میں پہنچ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی کاپی تھی۔ وہ کاپی
اس نے میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔
یہ امپیریل بنک کی پاس بک تھی۔ میرے نام پچاس ہزار روپیہ جمع
تھا۔ حیرانی سے میں نے برقعہ پوش لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس نے

تجدیدِ محبت

حضرت آزاد انصاری مالیگانوی

میرے احساساتِ خوابیدہ ہوئے بیدار پھر
دل کی دُنیا میں وہی ہے گرمیٔ بازار پھر

سازِ دل پر آج پھر پڑنے لگی مضرابِ شوق
دمبدم افزوں ہوا جاتا ہے پیچ و تابِ شوق

ضوفشانی کر رہا ہے پھر چراغِ آرزو
ہم کنارِ موسمِ گل پھر ہے باغِ آرزو

مائلِ لطف و کرم ہے پھر پشیمانِ ستم
پھر مری جاں ہے اسیرِ اضطرابِ کیف و کم

حسن کی تابش سے غم خانہ مرا معمور ہے
آج ہر داغِ جگر رشکِ چراغِ طور ہے

دیدۂ پرنم سے جاری ہے سرشکِ انبساط
آ رہا ہے محفلِ عشرت میں پھر دورِ نشاط

شب کی تاریکی میں پھیلی تابشِ خورشید پھر
عشق و الفت کے فسانے کی بندھی تمہید پھر

آج تک تھا دامنِ صبر و سکوں چھوٹا ہوا
نامہ و پیغام کا رشتہ رہا ٹوٹا ہوا

ہر نفس میں مضطر و غمگیں تھا ان کی یاد سے
ہر گھڑی تھا کام مجھ کو نالہ و فریاد سے

کام رونے کے سوا شام و سحر کچھ بھی نہ تھا
آہ و زاری کا مگر میری اثر کچھ بھی نہ تھا

تھا نہ صبر و ضبط سے واقف دلِ ایذا طلب
جھیلتا تھا سختیٔ فرقت بصد رنج و تعب

آج میری غم نصیبی کا ہوا احساس انہیں
خیر! پیمانِ محبت کا ہوا تو پاس انہیں

بمدت جانِ جاں نے یاد فرمایا مجھے
ان کے خط نے صورتِ سیماب تڑپایا مجھے

آج ہیں مجبور وہ تجدیدِ الفت کے لئے
اے خوشا میرے سیہ خانے کی زینت کے لئے

سازِ دل مضطر ہے نغمہ آفرینی کے لئے
باغِ حسن و دلکشی کی خوشہ چینی کے لئے

جب سے ان کا نامۂ جاں بخش ہے آیا ہوا
آ رہا ہے یاد ہر اک واقعہ گزرا ہوا

یادِ ایامِ گذشتہ خوں رلاتی ہے مجھے
چاندنی راتوں کی صحبت یاد آتی ہے مجھے

کیسی فرحت بخش ہوتی تھی گلستانوں کی سیر
کوہ و صحرا، آبشاروں اور دریاؤں کی سیر

لوٹ آئیں کاش وہ گذرے ہوئے ایام پھر
تم ہو، میں ہوں اور وہ پرلطف صبح و شام پھر

وسط ایشیا

ایک مغربی سیّاح کا دلچسپ سفرنامہ

از جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب بسمل

وسط ایشیا ہندوستان کی طرح ایک وسیع ملک ہے اور بحیرۂ خزر سے لے کر کوہستان الطائی تک پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں دریائے اوب بہتا ہے اور جنوب میں البرز کی پہاڑیاں اس کی قدرتی حد بناتی ہیں۔ اس علاقہ کو توران، تاتار اور ترکستان بھی کہتے ہیں۔ اس کا مغربی حصہ روس کے زیر اثر ہے اور مشرقی علاقہ برائے نام حکومت چین کے ماتحت ہے۔ چند سال گذرے وہاں عثمان اور اس کے جانباز ساتھیوں نے چینیوں کو شکست دیکر توحید کا پھریرا لہرادیا۔ بعد میں مجاہدین میں پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے از خود حکومت چین کا برائے نام اقتدار تسلیم کرلیا۔ اس سال چین اور جاپان کی آویزش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاتاریوں نے ... یارقند پر قبضہ کرلیا ہے اور چینی گورنر بوریا بستر لپیٹ کر وہاں سے رخصت ہوچکا ہے۔ مشرقی ترکستان کے مجاہدین نے غیرملکی حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے مغربی بھائیوں کے لئے ایک قابل تقلید مثال پیش کی ہے اور آثار کہہ رہے ہیں کہ عنقریب مغربی ترکستان میں جہاد کے شعلے روس کے قصر اقتدار کو سپرد خاک کردیں گے۔

وسط ایشیا ہم سے زیادہ دور نہیں مگر بلند اور دشوار گذار پہاڑوں اور ذرائع آمدورفت کی دشواریوں کی وجہ سے ہم وہاں کے حالات سے بہت کم واقف ہیں۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں حضرت آدم نے حیات مستعار کے ایام بسر کئے۔ وسط ایشیا کے ریگ زار بنی نوع انسان کا گہوارہ ہیں۔ آرین قوم انہی مرغزاروں سے اُٹھ کر تمام دنیا پر چھاگئی تھی۔ اسی علاقہ نے افراسیاب[1] کا عروج دیکھا۔ اسی ملک میں دریائے جیحون کے کنارے رستم اور سہراب کی لڑائی ہوئی۔ کیکاؤس[2] اور کیخسرو کی معرکہ آرائی، سیاوش[3] کا قتل اور اشکبوس[4] کی پہلوانی سب اسی سرزمین سے متعلق ہیں۔

آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے سکندر ایران کو فتح کرنے کے بعد وسط ایشیا کی طرف بڑھا مگر جنگجو تورانیوں نے اس کی سٹی گم کردی اور وہ ناکام و نامراد واپس لوٹا۔ اس کے بعد تورانی قبائل پے درپے ایران پر حملے کرنے لگے۔ اور آخر کار ان کی روک تھام کے لئے کوہ البرز کے دروں میں وہ مشہور دیوار تعمیر ہوئی جسے آج سدّ سکندری کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

۱۔ ایران کے کیانی خاندان کا ایک بادشاہ

۲۔ ایران کے کیانی خاندان کا ایک بادشاہ

۳۔ کیکاؤس کا ایک لڑکا جس سے افراسیاب والئی توران کی لڑکی سے شادی ہوئی تھی۔

۴۔ توران کا ایک پہلوان جس نے رستم کا مقابلہ کیا تھا۔

بعد میں مشرقی ترکستان میں چند یونانی قبائل آباد ہوئے اور انہوں نے باختر کے مشہور شہر کی بنیاد ڈالی جسے اب بلخ کہا جاتا ہے چار سو برس تک جنوب مغربی ترکستان، ایران، افغانستان اور مغربی ہندوستان کے ممالک یونانیوں کے ماتحت رہے۔ اس عرصہ میں سد سکندری کی اینٹیں تورانی قبائل میں بٹ چکی تھیں راستہ کھلا تھا اس لئے بحیرہ خزر کے مشرقی ساحل سے پار تھیں قبائل موت کا سامان بنکر امڈے اور یونانیوں کی حکومت اس سیل رواں میں غرق ہو گئی، ادھر ایران میں ساسانیوں نے تخت و تاج سنبھالا اور وسط ایشیا پر متعدد بار فوجکشی کی۔ آخر صدیوں کی کشمکش کے بعد دریائے جیحون اور دریائے گورگن دونوں ممالک کے درمیان حد فاصل قرار پائی۔

حضرت عمرؓ فاروق کے عہد خلافت میں عرب مجاہدین نے ساسانی خاندان کا تختہ الٹا ایران اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا گیا نوشیرواں کے زمانہ میں تورانی قبائل خودسری کا مزہ چکھ چکے تھے مگر ساسانی خاندان کے زوال کے بعد دوبارہ ایران پر حملے کرنے لگے حضرت عثمانؓ کے عہد میں عربوں نے وادیٔ جیحون کو فتح کر لیا اور جنوبی ترکستان میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم ہو گئی اسی خاک پاک میں حضرت بہاء الدین نقشبندی پیدا ہوئے اور خانہ بدوش تاتاریوں میں اسلام کی دولت تقسیم کی ابھی ایک زمانہ نہ گزرا تھا کہ چنگیز کا کفر نواز اور وحشی لشکر ایران پر حملہ آور ہوا اس سر زمین سے ہلاکو خاں کا طوفان ہلاکت امڈا تیمور اور بابر نے اسی گہوارہ میں پرورش پائی اور اسی علاقہ میں عبداللہ شیبانی ازبک نے اپنی وسیع سلطنت قائم کی۔

ایران اور توران مدت سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے چلے آتے ہیں رستم اور افراسیاب کی لڑائی اور شاہ عباسؒ اور شیبانی خان کی معرکہ آرائی سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں پرانے زمانے میں ان کی لڑائی کا سبب رقابت یا حسد ہوگا مگر بعد میں ایران کا شیعہ مذہب اور ترکوں کا اہل سنت والا عقیدہ دونوں ممالک میں آتش جنگ کو بھڑکاتا رہا۔

آج وسط ایشیا روس کا محکوم ہے۔ اس کے عظیم الشان قلعوں کے بلند میناروں پر سرخ پرچم لہراتا ہے۔ مساجد میں لینن کی تصاویر آویزاں ہیں۔ روسی ترکوں کی روح حریت کچلنے کے لئے ہر ممکن تدبیر عمل میں لا رہے ہیں۔ وہاں روس ریلوں کا جال بچھا رکھا ہے اور نئی تہذیب کی مادی روشنی بتدریج وہاں داخل ہو رہی ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود ترکستان ایشیا کی سیاسی بیداری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا عنقریب جہاد حریت کا آغاز ہوگا۔ اور بالشویک حکومت کے کھنڈروں پر تاتاری سلطنت قائم کیجائیگی۔

پچھلی صدی کے وسط آخر میں ویمبرے نامی ہنگری کا ایک عیسائی ماتسرہ عثمانی درویش کا بھیس بدل کر وسط ایشیا کی سیاحت کے لئے گیا اور وہاں کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی جسمیں خیوا بخارا اور ہرات کے مفصل حالات درج ہیں۔

خیوا

ویمبرے قسطنطنیہ سے ایران گیا اور وہاں سے مازندران ہوتا ہوا فورٹ ساس پہونچا اور بحیرۂ خزر کو بادبانی جہاز کے ذریعہ عبور کر کے دریائے گورگن کے دہانے کے قریب ساحل ترکستان پر جا اترا۔ ساحل کے قریب لاتعداد یونانی آثار قدیمہ بکھرے پڑے تھے۔ وہیں ایک پہاڑ کے دامن میں شہرۂ آفاق سد سکندری کے نشانات ہویدا تھے۔ ویمبرے حاجیوں کے ایک قافلے کے ہمراہ

۱۔ ترکستان کا ایک دلاور سردار جس نے بابر کو سمرقند سے نکالا تھا

۲۔ ترکستان کا مشہور بادشاہ

۳۔ ایران کے صفوی خاندان کا نامور بادشاہ جس نے بابر کی حمایت میں عبداللہ شیبانی [illegible] سے لڑائی کی تھی اور بابر کو سمرقند کے تخت پر بٹھایا تھا چونکہ بابر شیعوں کی [illegible] سے کامیاب ہوا تھا اس لئے [illegible] کی حکومت پائدار ثابت نہ ہوئی

۴۔ روس کی بالشویک [illegible]

جنم [illegible]

۵۔ خیوا (خوارزم) کا حکمران

سفر کر رہا تھا۔ کارواں بحیرۂ خزر کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف بڑھا اور مشرق کی طرف مڑ کر ایک غیر آباد بیابان میں سفر کرتا ہوا ایک ماہ کے بعد خیوا پہنچا

ویمبرے لکھتا ہے۔

جب ہم خیوا کے قریب پہنچے تو جسم میں ایک نئی روح دوڑ گئی عطر بیز ہوا نے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا اس لق و دق صحرا میں خیوا ایک شاداب فردوس ہے جس کا نظارہ قوت احساس کو ایک نئی زندگی بخشتا ہے خیوا کے سرسبز مرغزار اور گھنے کنج دیکھ کر لمبارڈی کے زرخیز میدان نگاہوں سے گر گئے خیوا کے محلات اور باغات دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں میرا عقیدہ ہے کہ اگر ایران کے خوش نوا شعرا فارس کے چٹیل بیابانوں کی بجائے یہاں آکر اشعار لکھتے تو دنیا ان کے کمالات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی خیوا کا شہر لاتعداد باغوں اور کنجوں کے درمیان ایک حسین پری کی طرح کھڑا ہے اور درمیان میں سنہری مینار اور خوبصورت گنبد چاند تاروں کی طرح چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں

جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو میرا دل زور سے دھڑک رہا تھا رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اگر میرا بھید کھل گیا تو جان کی خیر نہیں میں نے سن رکھا تھا کہ خان ہر اجنبی کو اپنا غلام بنا لیتا ہے چند روز پہلے ایک ہندوستانی خیوا میں پہنچا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چغتائی خاندان کا فرد ظاہر کیا تھا اور ہندوستان میں آل تیمور کی تباہی کی دردناک کہانی سنائی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ خان کے عتاب سے محفوظ نہ رہ سکا اور جاسوسی کے الزام میں ہلاک کر دیا گیا

بازاروں میں خوش آمدید کے نعرے گونجنے لگے اور ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کارواں میں جا پہنچے۔

خوش عقیدہ تاتاریوں نے حاجیوں کے کپڑوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ تھوڑی دیر کے بعد خان کا ملازم ہمیں دیکھنے کے لئے آیا۔ اس وقت شہر کی خلقت ہمیں گھیرے ہوئے تھی اور اکثر آدمی ہمارا اسباب اتارنے میں مصروف تھے۔ سرکاری آدمیوں کو دیکھ کر میرا دیرینہ دشمن افغان آگے بڑھا اور بلند آواز سے کہنے لگا۔

ہم اس دفعہ خیوا میں دو نادر اشیا لائے ہیں۔ ان میں سے ایک بھینس ہے۔ اور دوسرا یہ فرنگی ہے۔ فوراً چاروں طرف "روسی" اور "جاسوس" کے الفاظ گونجنے لگے۔ میں نے جواب دینے کی کوشش کی مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ میں فوراً شکر اللہ کے ہاں گیا مگر ملاقات نصیب نہ ہوئی۔ وہاں سے آکر میں نے اپنا اسباب ایک حجرہ میں رکھا اور دوبارہ شکر اللہ کے ہاں جا کر اپنا تعارف ظاہر کیا۔ بوڑھے تاتاری نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور باب عالی اور سلطان کے متعلق متعدد سوالات کئے۔

"افندی بخدا کسی چیز نے تمہیں استنبول جیسے بہشت ارضی سے نکلنے پر مجبور کیا" شکر اللہ نے پوچھا۔ میں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا "میرے پیر نے مجھے تمام دنیا میں سفر کرنے کا حکم دیا"

تم کس حلقہ میں ہو؟

"نقشبندی"

"اچھا بخارا کا عزم ہے" بوڑھے تاتاری نے کہا اور میں نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔

میں نے قسطنطنیہ کے قیام میں ترکستان کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچالی تھیں وہاں شکر اللہ نامی خیوا کا ایک باشندہ دربار سلطانی میں ملازم تھا میں نے اسکی وساطت سے علی پاشا وزیر خارجہ کے ہاں جا کر اپنا تعارف کرانا چاہا۔

جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو تمام خلقت ہمارے استقبال کے لئے امنڈ آئی۔ اور ہمارے اونٹ لذیذ میووں سے لد گئے۔

۱۔ ایک مغرور اور دانا افغان صحرا میں ویمبرے کی بیت بن گیا تھا اسے راز کا کچھ شبہ ہو گیا تھا۔

۲۔ خوانین خوارزم دمہ کے بیمار تھے طبیب نے بھینس کا دودھ بطور دوا تجویز کیا تھا۔ چونکہ خیوا میں اس کا وجود معدوم برابر تھا اس لئے کارواں بخشی ایران سے ہمراہ لایا تھا۔

۳۔ افغان نے ویمبرے کی طرف اشارہ کیا

دوسرے دن بادشاہی خادم میری تلاش میں آیا اور مجھے امیر خوارزم کے دربار میں لے گیا۔ شکر اللہ میرے ہمراہ تھا۔ اس نے مجھے ضروری آداب سے آگاہ کر دیا۔ بدقسمتی سے شکر اللہ اور مہتر[1] میں خلاف تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے والئی خوارزم کے دربار[2] میں قدم رکھا اتفاق سے وہ عرض بیگی کا وقت تھا اور بہت سے آدمی محل میں جمع تھے۔ مجھے دیکھکر ہجوم نے راستہ دیدیا۔ اور ترک آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

یہ عثمانی درویش ہے اور خان کو دعا دینے آیا ہے۔

مہتر مجھے دیکھکر حقارت سے مسکرایا مگر میں نے کوئی پرواہ کی اور دعا پڑھتا ہوا آگے بڑھا۔

کیا تمہارے پاس امیر المومنین کی کوئی تحریر موجود ہے؟ مہتر نے پوچھا۔

ہاں میرے پاس ایک فرمان موجود ہے اور اس پر طغرا کا نشان ہے۔

یہ کہہ کر میں نے اپنا پاسپورٹ نکالا۔ مہتر نے اسے ادب سے چوما آنکھوں سے لگایا اور محل میں جا کر خان کو دکھلایا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں سعد محمد خان والئی خوارزم کے روبرو کھڑا تھا میں جھک کر آداب بجا لایا۔ ہاتھ اٹھا کر دعا پڑھی اور تمام دربار نے آمین کہی۔ بادشاہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میں نے اسے بوسہ دیا۔ بعد میں شاہ نے بیشمار سوالات کئے میں نے جواب میں کہا۔

میں متعدد آفتیں جھیل چکا ہوں مگر ظل سبحانی کی زیارت ان کا بہتر معاوضہ ہے۔

خان نے میرے پروگرام کے متعلق دریافت کیا میں نے کہا۔

میں اولیں فرصت میں خیوا کے اولیاء کے مقابر کی زیارت کروں گا اور پھر بخارا کی طرف چلا جاؤں گا۔

بادشاہ نے مجھے زادراہ عطا کرنا چاہا مگر میں نے انکار کر دیا۔

"فقیر کو زر و جواہر کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "میرے پیر کی دعا میرے لئے کافی ہے"

میرے انکار کے باوجود ملازم اشرفیوں کی ایک تھیلی اور ایک سفید خچر لے آیا میں نے اشرفیاں شکریہ سے واپس کر دیں اور خچر لے لیا بادشاہ پر اس ملاقات کا کافی اثر ہوا اور میں جب تک خیوا رہا روزانہ میرے اخراجات کے لئے خزانہ سے رقم ملتی رہی۔

ترکستان میں ہر گھر میں کھانا کھانے کے وقت ایک وسیع دستر خوان بچھایا جاتا ہے اور اس پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے ہیں۔ خیوا میں عمائدین شہر ہر روز حاجیوں کی دعوت کرتے اور لذیذ کھانے پیٹ بھر کر کھانے کو ملتے۔ میرا خیوا کا زمانہ قیام بہت آرام سے گزرا مگر ایک دقت ہر وقت پریشان کرتی رہتی تھی وہاں کے علماء مجھے عثمانی درویش سمجھکر شرعی مسائل دریافت کرنے آتے تھے بھولے بھالے تاتاری خیال کرتے تھے کہ امیر المومنین ایک بڑا سفید عمامہ پہنتے ہیں ان کی داڑھی ناف سے نیچے لٹکی رہتی ہے اور لباس خالص عربی ہوتا ہے اگر میں ان سے کہدیتا کہ سلطان کے کپڑے پیرس میں سلتے ہیں اور وہ ہر روز داڑھی منڈاتا ہے تو کوئی آدمی میرا اعتبار نہ کرتا۔ وہاں کی عورتیں جرمنی کی عورتوں سے مشابہ ہیں اور ہر جگہ مردوں کے پہلو بہ پہلو کام کرتی نظر آتی ہیں وہ اکثر اپنے بیمار بچوں کو میرے پاس لے آتیں اور میں سورۃ فاتحہ پڑھکر دم کر دیتا

وہاں کے قہوہ خانوں میں ہر وقت ایک عجیب رونق رہتی ہے اور آجتک ان کا نظارہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ جب کبھی میں کسی قہوہ خانہ میں جا نکلتا تو لوگ مجھے گھیر لیتے اور عجیب و غریب سوالات کرتے۔

"کیا امیر المومنین کا کھانا مکہ شریف میں تیار ہوتا ہے؟" "کیا امیر المومنین ہر روز کعبہ کا طواف کرتے ہیں؟" میں ان کے جواب میں ہاں کہدیتا یا چپ رہتا

مہتر بدستور میرا مخالف تھا۔ ایک دن اس نے بادشاہ سے میری چغلی کھائی۔ دوسرے دن شاہ خوارزم نے مجھے طلب کیا۔ موسم

۱۔ وزیر اعظم

۲۔ دربار عام

زم تھا۔ میں حجرے میں لیٹے رہنے کو بہتر سمجھتا تھا مگر شاہی حکم سے مجبور ہو کر میں پہونچا اور بادشاہ نے مجھے اپنے خاص کمرہ میں بلا لیا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم بہت خوش خط لکھتے ہو" بادشاہ نے مہتر کے ایماء سے کہا "ہمیں کچھ لکھ کر دکھاؤ" میں نے کاغذ کا ایک پرزہ لیا اور مندرجہ ذیل عبارت لکھی:۔

"شاہ شاہاں، خاقان زماں، صاحب قرآں"

آپ کا ناچیز اور جاں نثار خادم ایک درویش ہے میں نے آج تک کبھی خوش خط لکھنے کی کوشش نہیں کی مگر ارشاد سلطان کے مطابق یہ چند سطریں لکھ کر پیش کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں"

القاب نے بادشاہ کو خوش کر دیا اور بلا ٹل گئی۔ اس کے بعد والئی خوارزم نے مجھے خلعت دے کر رخصت کیا۔

خیوا میں چھ دارالعلوم ہیں جنہیں بادشاہ کی سرپرستی حاصل ہے بازار بارونق ہیں۔ پولیس کا انتظام تسلی بخش ہے اور شہر ہر لحاظ سے بہشت ارضی ہے۔

ایک مہینے کے بعد ہمارا قافلہ بخارا کی طرف روانہ ہوا اور میں نے دوستوں کو الوداع کہہ کر قسمت کی رہنمائی میں اس شہر کی طرف بڑھا جو کسی زمانہ میں تمام دنیا کا مرکز تھا۔

بخارا

حاجیوں کا قافلہ خیوا سے چل کر دو ہفتوں میں بخارا پہونچا راستے میں بعض مقامات پر اونٹوں کے کجاوے اور اسباب کے ڈھیر لق و دق صحرا میں پڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ بعض بدنصیب مسافروں کو سفر میں موت نے آلیا اور ان کی ملکیت صحرا میں باقی رہ گئی۔ تاتاری دوسروں کے مال کو اپنے لئے حرام سمجھتے ہیں اور وہاں کی پڑی چیز اٹھانا جرم عظیم سے کم نہیں ہے۔ سفر کے دوران ایک متمول ترک نے ایک دوسرے ترک کو کچھ روپیہ قرض دیا۔ یادداشت کا کاغذ مقروض کے حوالہ کر دیا تاکہ اسے یاد رہے۔

بخارا سے ایک میل کے فاصلہ پر دریائے زرفشاں بہتا ہے۔ زمانہ میں وہاں پتھر کا پل تھا مگر اس وقت زمانہ کے ہاتھوں سے برباد ہو چکا تھا۔ اس لئے کارواں نے دریا کو پایاب عبور کیا۔ ہم دروازۂ امام سے شہر میں داخل ہوئے۔ جا بجا پرانی عمارتوں کے شاندار کھنڈر بخارا کی گذشتہ شان و شوکت کے آئینہ دار تھے۔ ہم شہر میں ایک تکیہ میں ٹھہرے جس کا خلیفہ حضرت امام حسینؓ کی اولاد میں سے تھا۔ اور بخارا کی شاہی مسجد کا امام تھا شاہ بخارا دارالسلطنت سے باہر قوقند کی مہم پر گیا ہوا تھا اس لئے اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ قسمت مجھے اس شہر میں لے آئی تھی جو اسلام کا گہوارہ، ایشیا کا مرکز اور دنیا کا پراسرار گوشہ ہے۔ ارکان حکومت مجھے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر مقدس تکیہ میں کوئی دنیاوی طاقت میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتی تھی۔

میرے قلبی دوست حاجی صالح نے میرے متعلق وزیر اعظم کو

ا۔ انیسویں صدی کے وسط آخر میں روس وسط ایشیا کی تسخیر کا ارادہ کر چکا تھا اس دور میں وسط ایشیا میں قوقند، بخارا اور خیوا جیسی زبردست سلطنتیں قائم تھیں اگر ان میں اتحاد ہوتا تو یورپ کے کسی جور ان کی جانب دیکھنے کی ہمت نہ کرتے مزید برآں تینوں سلطنتوں میں سے ہر ایک تن تنہا روس کا مقابلہ کر سکتی تھی آخر کار روس نے یورپ کی حکمت عملی کا از سبق دہرایا والئی قوقند کو والئی بخارا سے بھڑا دیا۔ مدتوں لڑائی ہوتی رہی انجام کار دونوں ممالک تباہ ہو گئے والئی قوقند لڑائی میں ہلاک ہوا اور بخارا میں فتح کا جشن منایا گیا

چند روز کے بعد روس نے قوقند پر قبضہ کر لیا۔ والئی بخارا اپنی تمام قوت لڑائی میں صرف کر چکا تھا۔ اس لئے منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد روس نے سمرقند کو دبا لیا اور امیر بخارا اپنی نااتفاقی اور کمزوری کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا کچھ عرصہ کے بعد روس کے ایماء سے خیوا کے علاقہ میں ازبک ترکوں نے بغاوت کر دی۔ جب والئی خوارزم ان کی سرکوبی میں طاقت صرف کر چکا تھا تو روس نے خوارزم کو بھی اپنے علاقہ میں شامل کر لیا۔ آغاز میں امیر خوارزم کو سبز باغ دکھائے گئے۔ تخت و تاج کی بشارت دی گئی۔

بعد میں زار نے آنکھیں پھیر لیں۔

والئی خوارزم غریب الوطنی، پریشانی اور تنگدستی میں ہلاک ہوا۔

... دیا۔

... رشید دولیبرے، پکا اور سچا مسلمان ہے اور متعدد بار حرم کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے!

دوسرے دن میں اپنے دوستوں کے ہمراہ شہر کی سیر کے لئے گیا بخارا کے بازاروں میں ایرانی، چینی، تاتاری، ملتانی، افغان، یہودی ہر قوم کے لوگ اپنا قومی لباس پہنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ شہرہ آفاق بخارا کے بازار فرش سے خالی ہیں اس لئے ہر وقت گرد کا ایک بادل سا چھایا رہتا ہے۔ بخارا میں بسنے والے ہندوستانی اپنے ماتھے پر ایک نشان بناتے اور گلے میں ایک دھاگا پہنتے ہیں دوکانوں میں خال خال یورپین مصنوعات بھی نظر آتی ہیں جب میں نے کپڑوں کے تھانوں پر مانچسٹر اور برمنگھم کے الفاظ پڑھے تو میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ بخارا کے رنگین کپڑے اور دیسی مصنوعات یورپ کی بنی ہوئی چیزوں سے ہر حالت میں عمدہ ہیں اور اسی وجہ سے یورپین وہاں قدم نہیں جما سکے۔ میں نے وہاں بازار میں بوٹ بنتے دیکھے ہیں، جو بہت خوبصورت اور مضبوط ہوتے ہیں عورتوں کے جوتے سبک اور عمدہ ہوتے ہیں اور ریشم سے کاڑھے جاتے ہیں بخارا میں لوگ سرسراہٹ پیدا کرنے والے لباس کے شائق ہیں۔ اور میں نے متعدد بار کوچہ و بازار میں مردوں کو نئے لباس کی سرسراہٹ سے محظوظ ہوتے دیکھا ہے۔ بخارا ایشیا کے لئے تمدن اور تہذیب کا سبق ہے اور یورپ بھی وہاں کے باشندوں سے دیانت، مساوات، خوش گوئی اور سادگی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ایک دن میں چائے کے بازار میں گیا۔ وہاں بازار کے وسط میں ایک غیر معمولی خوشگوار باغیچہ ہے اور ایک دلکش تالاب بنا ہوا ہے۔ جسے حوض دیوان بیگی کہتے ہیں۔ تالاب کے چاروں طرف چائے کی دوکانیں ہیں۔ اور سایہ دار درخت کھڑے جھوم رہے ہیں۔ مغرب کی طرف مسجد دیوان بیگی ہے۔ جس کے قریب گھنے درختوں کے ایک کنج میں داستان گو ... بخارا کے بہادران ملت کے کارنامے سناتے ہیں۔

... اتفاق سے نقشبندی درویش ایک جلوس کی شکل میں ... ذوق و شوق محبت میں جناب حضرت بہاؤ الدین نقشبندی کے مزار مبارک کی طرف جا رہے تھے اور وہ نظارہ ایسا دلچسپ تھا کہ مدت العمر مجھے یاد رہیگا

میری تبدیل ہیئت مکمل تھی، میرے سر پر ایک بڑا سبز عمامہ تھا گلے میں قرآن شریف حمائل تھا مگر بخارا شریف کے باشندے مجھے ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے، میں ہر روز جامع مسجد میں شیخ عبد القادر جیلانی کے سوانح حیات پر وعظ کہتا اور دور دراز سے لوگ سننے کے لئے آتے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بہت سے بخاری میرے مسلمان ہونے پر ایمان لے آئے۔

میں روز بروز بخارا کے باشندوں میں مقبول ہو رہا تھا مگر حکومت مجھے برابر شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ امیر بخارا کے قائم مقام رحمت بے کے جاسوس ہر وقت میرے ارد گرد منڈلاتے رہتے اور باتوں باتوں میں فرنگستان کا ذکر چھیڑ دیتے مگر میں ہر دفعہ ہوشیاری سے گفتگو کا موضوع بدل دیتا۔ "مجھ سے اس شیطانی مملکت کا ذکر نہ کرو" میں جواب دیتا۔ میں فرنگیوں سے دور رہنے کے لئے قسطنطنیہ سے چلا آیا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ اب میں بخارا شریف میں حضرت بہاؤ الدین نقشبند کے مزار اقدس کے سایہ میں ایام زندگی بسر کر رہا ہوں"

میں نے وہاں سے چند نایاب پرانی فارسی کی قلمی کتابیں خریدیں مگر افسوس کہ میں یورپ کو ان سے روشناس نہ کر سکا۔

ایک دن بخارا کے گورنر رحمت بے نے مجھے طلب کیا۔ اس وقت اس کے گرد اگرد علمائے اسلام تشریف رکھتے تھے دربار میں داخل ہوتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا میرے امتحان کے لئے مکمل انتظام کیا گیا تھا۔ اور میری زندگی میں سب سے نازک وقت آپہنچا تھا۔ خوش قسمتی سے میں سنت اور فرض کے مسائل پر کافی عبور رکھتا تھا اس لئے میں نے ٹھیک جوابات دئے۔ آخر کار احادیث کے متعلق گفتگو چھڑ گئی۔ میں اس بحر ناپیدا کنار کا شناور نہ تھا۔ اس لئے میں نے تسلیم کر لیا کہ اس معاملہ میں بخارا کے علماء قسطنطنیہ کے علماء پر فوقیت رکھتے ہیں۔ وہاں ایک ہندی خانہ

---

(۱) ہندوستانی (۲) ہندو (۳) قشقہ (۴) زنار

میں تین یورپین قید وبند کے مصائب جھیل رہے تھے اور ان کی زرد صورتیں دیکھ کر رحم آتا تھا۔ صدر دروازے کے قریب توپ کے چودہ گولے رکھے تھے جو امیر بخارا نے والئی خوقند کو شکست دے کر چھینے تھے محل کے مغرب میں وسط ایشیا کے زبردست حکمران عبداللہ خان شیبانی کی عظیم الشان مسجد اپنے بانی کے جاہ وجلال کی آئینہ دار اور ان بہادر ترکوں کی یاد میں سوگوار ہے جنہوں نے ایک زمانہ میں تمام دنیا کو لرزا دیا تھا۔

بخارا میں ایک خاص قسم کا کھانا تیار کیا جاتا ہے جسے زن لوسہ کہتے ہیں وہ اس قدر لذیذ ہے کہ یورپ کا بہترین طعام اس کے سامنے بے حقیقت ہے۔ بخارا میں سولہ اقسام کی چائے بکتی ہے۔ اور بہت کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔

بخارا میں بخاری رشتہ نامی بیماری بہت عام ہے۔ پہلے پہل جلد میں خارش ہوتی ہے پھر وہاں ایک داغ پیدا ہوجاتا ہے اور بعد میں اس کے مرکز سے دھاگہ کی طرح ایک کیڑا نکلتا ہے وہاں کے حجام اس کے علاج میں ماہر ہیں۔ اس لئے کسی کو تکلیف نہیں ہوتی۔

بخارا میں پینے کا پانی دریائے زرفشاں سے لیا جاتا ہے دروازہ مزار کی راہ ایک نہر شہر میں داخل ہوتی ہے۔ اور ہر ایک محلہ میں پانی پہنچایا جاتا ہے۔

بخارا اسلام کا گہوارہ ہے اور وہاں بیسیوں مکاتب میں ہزاروں طلبا علم دین کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن وہاں کے باشندے امیر المومنین سلطان ترکی سے زیادہ عقیدت نہیں رکھتے۔ وہ اکثر اعتراض کرتے۔

۱۔ سلطان غیر مسلم فرنگیوں سے جزیہ کیوں نہیں لیتا۔
۲۔ سلطان جہاد کیوں نہیں کرتا۔
۳۔ ترک عمامہ کیوں نہیں پہنتے۔

اور میرے پاس ان اعتراضوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

بخارا کے رہنے والے بہت حد تک شاہ پرست ہیں موجودہ حکمران مظفر الدین شاہ عادل اور رحمدل بادشاہ ہے اور ہر روز مساجد میں اس کی درازئ عمر کی دعا مانگی جاتی ہے[1] سردار کل شاہرخ مرزا ایران کے شاہی خاندان سے ہے مگر دیر سے بخارا کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہے۔ شاہرخ مرزا نے بخارا میں ایرانی طرز کا محل بنوایا ہے جسمیں شیشہ کی کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں اور پندرہ ہزار تلا خرچ آیا ہے۔ حرم شاہی میں بادشاہ کی حکمرانی ہے۔ جائے حیرت ہے کہ شاہی حرم کے اخراجات قریبًا صفر ہیں۔ بیگمات اپنا اور امیر کا لباس خود تیار کرتی ہیں۔ کھانا پکاتی ہیں اور خانہ داری کے تمام فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ بخارا میں غلاموں کی تجارت عام ہے مگر سنی مسلمان وہاں کبھی غلام نہیں بنایا جاتا یہودی قوم غلامی کی زد سے محفوظ ہے اور ہندو بھی عمومًا غلام نہیں بنائے جاتے۔

بخارا میں چند روز قیام کرنے کے بعد میں حضرت بہاء الدین نقشبندی[2] کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے گیا وہاں سے واپس آکر حاجیوں نے سفر کی تیاری شروع کردی اور بائیس روز قیام کرنے کے بعد ہمارا قافلہ سمرقند کی طرف روانہ ہوگیا

بخارا میں ہندوؤں کے پانچسو گھر ہیں۔ اور شہری آبادی میں یہ لوگ حقیقی معنوں میں سرمایہ دار ہیں۔ اور سود پر روپیہ قرض دیتے

۱۔ شاہ کے عدل کے متعلق میرے پاس کوئی تاریخی سند موجود نہیں مگر اسکی سادہ لوحی اور سفاکی کے متعلق امیر عبدالرحمٰن مرحوم کی خود نوشت سوانحعمری ایک مستند شہادت ہے امیر مرحوم مدتوں بخارا میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے ایک دفعہ غیور ترکمانوں نے روس کے خلاف علم جہاد بلند کیا امیر بخارا نے روس کے حکم سے مجاہدین پر حملہ کیا۔ مدتوں ان سے لڑکر انہیں گرفتار کیا۔ اور ہزاروں غیور مسلمانوں کو آزادی کے جرم میں قتل کروادیا۔ امیر عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے کہ صحرا میں میلوں تک خون سے لالہ زار کا عالم تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر امیر موصوف کا دل خون رونے لگا۔ اس نے امیر بخارا کے جانے کے بعد مجاہدین کی قبروں کے نشانات بنائے اور باچشم نم فاتحہ پڑھا۔ امیر بخارا کو وفاداری کا یہ صلہ ملا کہ اسے انجام کار جلاوطن اور ذلیل کیا گیا (۲) وزیر اعظم (۳) مسلمانوں نے ہمیشہ روسیوں پر مہربانی کی اور انھوں نے ہر موقع پر غداری کی۔

[illegible] بخارا میں مشکل سے کوئی گاؤں ایسا ہوگا جہاں ہندو یا یہودی نہ ہو۔ وہ سود کا کاروبار کرتے ہیں زمین کے مالک ہیں اور حکومت ان کی سرپرستی کرتی ہے۔ یہودی شہر میں دس ہزار کے قریب ہیں اور لڑائی کے وقت ان کی تعداد دوگنی ہو گئی ہے۔

سمرقند

حافظ نے سمرقند اور بخارا کو ترک شیرازی کے خال رخ کے بدلے بخش دیا تھا میرا خیال ہے کہ شاعر نے اس حسن کا دو دیکھا نہ ہوگا اور اگر وہ ترکان سمرقند ہی کے حسن بے پناہ کو دیکھ پاتا تو عمر بھر ان کے عشق میں خاک بسر رہتا اس شہر میں مالک حسن کے ایسے قاتل جلوے نظر آتے ہیں کہ شیراز کا حسن ان کے سامنے پانی بھرتا ہے سمرقند کا نام آتے ہی تصور نگاہوں کے سامنے ایک سا عالم پیش کرتا ہے تیمور کی سپاہگری، ترکوں کی جاں بازی بیرونی افواج اور ایک غیر فانی تمدن سمرقند کی داستان کے مختلف عنوان ہیں سمرقند کا شہر دریائے زرفشاں کے قریب واقع ہے اور اس کے ہر ایک ذرے میں قوموں کے عروج و زوال کے افسانے مضمر ہیں چونکہ میں اس شہر کی زیارت کے لئے بے چین تھا اس لئے بخارا سے سمرقند تک تمام راستہ آنکھوں میں کٹا۔ راستہ کے ہر دو جانب سرسبز چراگاہیں تھیں جن میں چوپائے کلیلیں کر رہے تھے۔ تیمور کے زمانہ کے میلوں کے پتھر بدستور قائم تھے اور شکستہ کھنڈروں سے خاندان چغتائیہ کی شان و شوکت ہویدا تھی۔ جب تک تیمور کی اولاد وسط ایشیا میں حکمراں رہی سمرقند دار الخلافہ رہا مگر جب عبداللہ خان شیبانی نے بابر کو ترکستان سے نکالا تو اس نے سمرقند کے بجائے بخارا کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ اگرچہ پانچسو برس سے بخارا شاہی شہر چلا آتا ہے مگر سمرقند کی شان بالکل نرالی ہے

تیمور کا شہر دلکش مرغزاروں اور باغات کے وسط میں واقع ہے ہمارا قافلہ تمام سفر کرنے کے بعد صبح کے قریب شہر میں پہنچا۔ اونچے رنگین مینار اور گنبد سورج کی طلائی کرنوں میں عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ یورپ کے باشندے سمرقند کو شہر عجائبات خیال کرتے ہیں۔ مگر میں نے جو کچھ دیکھا وہ میرے وہم و گمان سے بڑھکر تھا دور سے ایک عالیشان عمارت دکھائی دی جس کے چار گنبد بے حد جاذب نظر تھے معلوم ہوا کہ وہ مدرسہ تیموریہ کی عمارت تھی جس میں سینکڑوں طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ اس کے علاوہ جامع تیموریہ کی عمارت بھی دور سے نمایاں تھی۔ اس کے قریب مقبرہ تیمور واقع تھا اور شہر کے جنوب مغربی کونے پر تیمور کا شاہی محل کھڑا تھا جس کے متعلق یہ کہدینا کافی ہے۔

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

ہم دروازۂ بخارا کی راہ شہر میں داخل ہوئے اور کارواں سرائے میں جاکر ٹھہرے توقند کے غیور مجاہد روسی حکمت عملی کے راستہ میں غیر متحرک چٹان کی طرح حائل تھے اور ان کو سامنے سے ہٹانے کے لئے روسی حکومت نے امیر بخارا پر ڈورے ڈالنے شروع کئے اور مظفر الدین امیر بخارا والئی توقند سے جا بھڑا۔ ان دنوں لڑائی ختم ہو چکی تھی اور امیر توقند ہر دو جانب دشمنوں کا ہجوم دیکھ کر پسپا ہو چکا تھا سمرقند اور بخارا میں چراغاں ہو رہا تھا مگر مجھے ترکوں کی سادگی پر رحم آتا تھا والئی توقند کی شکست ان سادہ لوح تاتاریوں کی موت کا وارنٹ تھی روسی توقند اور تاشقند پر قانع نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی چھاؤنی دریائے جیحوں کے کنارے قائم کرنا چاہتے تھے اور جلد یا بدیر سمرقند و بخارا پر بھی روسی پرچم لہراتا نظر آئیگا۔

میرے ہم سفر کاشغر کے رہنے والے تھے اور میں ہرات کیطرف جانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں قافلہ سے علیحدہ ہوگیا اور ہرات کی طرف جانے والے کارواں کا انتظار کرنے لگا۔ چونکہ روانگی میں چند دن باقی تھے اس لئے دل کھولکر سمرقند کی سیر کی۔ وہاں پر ایک عمارت بے مثل تھی۔ مگر مندرجہ ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مقبرۂ حضرت شاہ زندہ آپ کا اصلی نام قاسم بن عباس ہے۔ آپ عربی نژاد ہیں۔ اور آپ نے حضرت عثمان کے عہد میں سمرقند اور بخارا کو فتح کیا اور یہاں اسلام کی شمع روشن کی تمام عمارت سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور حیرت انگیز ہے۔ میں جا بجا

قدیم ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ

مگر پھر بھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملا۔ رات کو سردی بہت زیادہ ہوتی تھی اور میرے پاس لباس ناکافی تھا مگر وطن پہنچنے کی امید جسم کو گرم رکھتی تھی۔ میں نے سنا کہ ایرانی سفیر محمد باقر خان مشہد جانے والا تھا میں اس کے پاس گیا مگر اسے میرے حال زار پر رحم نہ آیا۔ میں اور میرا رفیق ملا اسحاق دن کو بھیک مانگتے۔ شام کو کھانا پکاتے اور رات کو آگ کے قریب لیٹ رہتے۔ ایک دن میں ملا اسحق کے ہمراہ ہرات کے صوبیدار سردار یعقوب خان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سردار موصوف کی عمر سولہ برس کے قریب تھی اور چار باغ کے محل میں دربار منعقد کیا کرتا تھا۔ جب میں ایوان میں داخل ہوا تو شہزادہ فوجی لباس پہنے جھروکہ کے قریب آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ باہر میدان میں افغان فوج قواعد کر رہی تھی اور شہزادہ اسکو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ افغانستان کی افواج فرنگستان کی طرح قواعد دان اور تربیت یافتہ تھی اور فوج کے افسر انگریز جبریوں کی طرح احکام دیتے تھے۔ ترک اپنی فوجوں کو مدت سے قواعد سکھلا رہے ہیں مگر افغان فوجیں مستعدی اور چستی میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ جب قواعد ختم ہوئی تو شہزادہ میری طرف متوجہ ہوا کرسی کے ایک جانب وزرا اور سردار اور دوسری جانب علما بیٹھے تھے۔ میں جھک کر آداب بجا لایا۔ شہزادہ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور جب فارغ ہوا تو مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔ شہزادہ کچھ دیر تک میری طرف بغور دیکھتا رہا۔ پھر کرسی سے اٹھا اور میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "واللہ شما انگلس ہستید"

تمام درباری ہنسنے لگے مگر شہزادے نے کوئی پروا نہ کی وہ اس وقت اس بچہ کی مانند تھا جس نے کوئی عجیب چیز دریافت کی ہو۔ وہ کستاں کشاں میرے پاس آیا اور میری آنکھوں کے سامنے انگلی کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"حاجی بخدا شما در تبدیل انگلیس ہستید"

میرے ہوش و حواس گم ہو گئے والئی خوارزم مجھے پہچان سکا میں نے امیر بخارا سے ملاقات کی اور مدتوں سمرقند میں شہزادہ رہا لیکن ترکمان یا تاتاری میری اصلیت کو جان نہ سکا۔ حاجی حیرت تھی کہ وہ افغان بچہ کہ ایک نگاہ میں مجھے پہچان گیا میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مگر میں نے اپنے آپکو سنبھالا اور کہا،

"صاحب عالم۔ حدیث شریف میں لکھا ہے کہ اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کی نسبت دل میں شک لائے تو وہ کافر ہے۔ میں جہاں گرد فقیر ہوں مجھے کچھ عنایت کر تاکہ اپنا سفر جاری رکھ سکوں"

مقدس حدیث کے الفاظ کے کافی اثر پایا گیا شہزادہ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"تم تاتاری نہیں ہو"

"میں قسطنطنیہ کا رہنے والا ہوں اور ترک ہوں" میں نے جواب دیا۔ اپنا پاسپورٹ دکھایا اور اس زمانہ کا ذکر کیا جب شہزادے کا چچیرا بھائی جلال الدین بن اکبر خان قسطنطنیہ گیا تھا اور سلطان نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا آخرکار شہزادے نے مجھے تھوڑی سی نقدی عنایت کی اور میں وہاں سے چلا آیا

اس واقعہ کے بعد مجھے شہر میں رہنا دوبھر تھا اور میں بہت جلد وہاں سے روانہ ہو گیا۔

کارواں کی روانگی سے چند روز پہلے میں حضرت عبداللہ انصاری کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گیا۔ راستہ میں مصلیٰ کے کھنڈر بکھرے تھے وہاں میں نے سلطان حسین مرزا کی خوبصورت مسجد دیکھی جو درحقیقت سمرقند کی شاہی مسجد کی نقل تھی۔ وہیں امیر کبیر امیر دوست محمد خان والئی افغانستان مدفون تھے آخرکار میں حاجیوں کے قافلہ کے ہمراہ ہرات سے مشہد پہنچا وہاں میں نے درویش کا لباس اتار پھینکا۔ اور ایک انگریز کی معیت میں گھوڑے پر سوار طہران پہنچا اور پھر چند روز دمشق اور بیت المقدس میں ٹھہرتا ہوا آخرکار انگلستان جا پہنچا۔

آثارِ قدیمہ

"[illegible] مسجد" اور "[illegible] خیبر کے سلسلہ کی [illegible]" [illegible] مزار سیا حضرت [illegible] کی [illegible] جب سکندر یونانی کے جانباز سپاہیوں نے افغانستان اور

[illegible] فتح کیا تو بدخشاں میں ایک نئی آبادی بسائی جس کا نام باختریہ رکھا گیا۔ یہ شہر صدیوں تک یونانی سلطنت کا مرکز رہا اور آخر کار تاتاریوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بعد میں قرنوں تک یہ شہر ایک ویرانہ بنا رہا۔ جب سلطان سنجر کے اقتدار کا پھریرا عادی جیحون میں لہراتا تو باختریہ کے کھنڈروں کی قسمت جاگی۔ سلطان نے اس طرف عنان توجہ موڑی اور وہاں ایک نئی آبادی قائم کی گئی جس کا موجودہ نام بلخ ہے۔ کھدائی کے دوران میں ایک قبر ملی جس پر مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا تھا

"یہ مزار اسد اللہ علی ابن طالب صحابی رسولؐ کا ہے"

اس دریافت عظیم کے بعد وسط ایشیا سے عقیدتمند ولاکے گروہ جوق در جوق مزار کی زیارت کے لئے آنے لگے اور اس وقت سے آج تک وہ علاقہ مزار شریف کہلاتا ہے۔ سلطان سنجر سلجوقی نے وہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی اور اس شہر کا نام قبۃ الاسلام رکھا۔ مزار شریف کے علاقہ کا گلاب اپنی خوشبو اور رنگ کے لحاظ سے تمام دنیا میں بے مثال ہے اور اس علاقہ کے باشندوں کا عقیدہ ہے کہ یہ ساری برکت حضرت علیؓ کے مزار کی ہے۔ مختلف سلاطین نے اس کے گلاب کی کاشت ایران اور توران کے دوسرے علاقوں میں کرنی چاہی مگر ناکام رہے

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت علیؓ کا مزار مقدس نجف اشرف میں واقع ہے۔ اگر مزار شریف کے مزار مقدس کو حضرت علی کرمؓ کی خوابگاہ سمجھا جائے تو نجف اشرف ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے اور اگر نجف اشرف کے مزار مبارک کو اصلی خیال کیا جائے تو مزار شریف واقع بدخشاں کی ہستی موہوم نظر آتی ہے

مزار شریف کے پاس خیبر اور علی مسجد کا واقع ہونا بھی خالی از علت نہیں۔

امیر شیر علی والئی کابل اپنی وصیت کے مطابق بلخ میں دفن ہے۔

امیر عبدالرحمن مرحوم نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں جابجا بدخشاں میں حضرت علی کرمؓ کے مزار مقدس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک برس بعد حوالئی شہر میں تختہ پل کے مقام پر میرے لئے ایک باغ تیار کروایا گیا اور وہ مقام میرا مکتب قرار پایا۔ وجہ یہ تھی کہ بلخ میدانی قسم کا شہر ہے اور اس کی آب و ہوا اچھی نہ تھی اس کے علاوہ میرے والد سلطان الاولیاء علی مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر نہایت اکثر اوراد و وظائف کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور یہ مقدس مقام بلخ کی نسبت تختہ پل سے زیادہ قریب ہے۔"

افغانستان کے باشندوں کا عقیدہ ہے کہ امام حسنؓ مزار شریف سے میاں ہو کر لوٹتے ہیں اور وہاں ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے

خان محمد حسین بی اے مصنف انقلاب افغانستان لکھتا ہے کہ اگر کوئی افغان وطن سے سینکڑوں میل دور فوت ہو جائے تو اس کے رشتہ دار اس کی لاش وطن میں لے آتے ہیں۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے حفظ صحت کے خیال سے اس کی ممانعت ہے مگر افغانستان میں یہ رسم عام ہے

ختلان میں حضرت علی کے مزار مقدس کے علاوہ ایک قصبہ وگرامی میں ابو مسلم خراسانی کا مزار اور اس پر کوفی خط میں یہ کندہ ہے

یہاں [illegible] ابو مسلم پہلواں
ترکوفت برفرق مروانیاں
ز حد سمرقند تا مصر و [illegible]
برآورد دریغ خوارج زپے

جامیؒ نے کہا ہے

گویند کہ مرقد علی در نجف است
در بلخ بیا ببیں چہ زار الشرف است

یہ عجیب خیال ہے۔ حضرت علیؓ اور ابو مسلم خراسانی کی نعشوں کو ان کے عقیدتمند معتقد افغانستان لے آئے۔

ابو مسلم خراسانی نے بنو عباس کی حمایت میں بنو امیہ سے جنگ کی اور ان کی سلطنت کو مٹا دیا۔ مگر انجام کار عباسی خلیفہ

کے ہمراہ زیارت کو گیا ہم نے ہر ایک کمرے میں دو رکعت نماز ادا کی وہاں ایک کمرے میں حضرت قاسم بن عباس کی ڈھال اور تلوار موجود تھی اور قریب ہی ان کا قرآن مجید رکھا تھا ہم نے ادب سے ان اشیاء کو بوسہ دیا۔ ایک دوسرے کمرے میں امیر تیمور کی زرہ خنجر اور تین علم پڑے تھے

۲۔ جامع تیموری یہ مسجد شہر کے جنوبی حصے میں ہے اور اصفہان کی شاہی مسجد سے زیادہ خوبصورت ہے دیواروں پر سونے کے حروف میں قرآن شریف لکھا ہوا ہے میں نے تمام عمر میں ایسے حیرت انگیز حروف نہیں دیکھے تھے۔

۳۔ شاہی محل ارک کافی دلچسپ ہے امیر بخارا جب کبھی سمرقند آتا ہے تو اسی میں قیام کرتا ہے تیمور کی خوابگاہ بلوری سی ہوئی ہے اور اس کو دیکھ کر عقل گم ہوتی ہے۔

۴۔ دربار عام۔ اس ایوان کے فرش میں ایک حیرت انگیز سبز پتھر گڑا ہوا ہے۔ جو ساڑھے چار فٹ اونچا ہے اس پتھر پر امیر تیمور کا تخت رکھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امیر نے وہ پتھر بروصہ سے حاصل کیا تھا۔ دیوار میں ناریل کی شکل کا ایک پتھر لگا ہوا ہے جس پر سونے کے حروف میں عربی الفاظ کندہ ہیں مذکورہ پتھر امیر نے سلطان ... یلدرم کے خزانہ سے لیا تھا۔ وہاں نمائش کے لئے دو قالین رکھے تھے ایک سلطان محمود کی جانب سے تھا ... سلطان عبدالحمید سلطان ترکی کی طرف سے تھا

بخارا امیر المومنین سے نماز جمعہ کے لیے باقاعدہ اجازت لیتا ہے سمرقند میں لوگ تیمور کے متعلق اس طرح باتیں کرتے ہیں گویا وہ زندہ ہے قیلولہ کر رہا ہے۔ اور چند گھڑیوں کے بعد بیدار ہو کر وسط ایشیا کے ... خفتہ کو بیدار کر دیگا

۵ مقبرۂ تیموری تیمور وسط ایشیا کا مایۂ ناز ہیرو ہے اور سمرقند کی تمام شان و شوکت اسی کی مرہون منت ہے مگر وہ اسلام کا ناخلف ... ہے اس نے مسلمانوں کو ہلاکو اور چنگیز سے بڑھ کر نقصان پہنچایا ... نے سلطان بایزید یلدرم کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور اس کا یہ گناہ اسلام کبھی معاف نہیں کر سکتا اگر وہ ایک مسلمان کی طرح سلطان یلدرم کی مدد کرتا تو آج مسلمان فرنگستان کے مالک ہوتے اور یورپ کے گرجوں میں تکبیر کے نعرے سنائی دیتے۔ یلدرم ایک طوفان تھا جو مسیحی یورپ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا۔ اس نے یورپ کا بہت سا حصہ فتح کر لیا تھا اور باقی فرنگستان اپنی ہلاکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ عین اس وقت تیمور نے یلدرم کے علاقہ پر چڑھائی کر دی سلطان جرمنی کی سرحدوں پر جنگ آزما تھا۔ یہ خبر سنکر گرما گیا اور فوج کو وہیں چھوڑ کر اپنے محافظ دستے کے ہمراہ تین ماہ کا راستہ پندرہ روز میں طے کر کے انقرہ کے قریب کی فوج پر حملہ آور ہوا تیمور کا لشکر یلدرم کی فوج سے سو گنا تھا۔ مگر یلدرم نے بہادری سے مقابلہ کیا اور آغاز میں تیمور کا منہ پھیر دیا۔ مگر انجام کار اس نے شکست کھائی اور اس کی ناکامی سے مغرب میں اسلام کی قسمت سربمہر ہو گئی۔ اگر تیمور یلدرم سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتا تو آج تمام یورپ میں ہر جگہ اسلام کا بول بالا ہوتا تیمور کا مقبرہ ایک خوبصورت باغ میں واقع ہے جب ہم وہاں گئے تو دو قبریں نظر آئیں ایک پر گہرے سبز رنگ کا پتھر گڑا تھا اور وہ مزار تیمور کی ابدی خوابگاہ ہے۔ دوسری قبر میر سعید کی ہے جو تیمور کا پیر تھا۔ ارد گرد متفرق کمروں میں تیموری خاندان کے افراد کی قبریں ہیں بعض پر عربی فارسی کے کتبے ہیں اور گورگاں کا لفظ ہر ایک پر عیاں ہے امیر کی وصیت کے مطابق خوگئی جیل کے ترک مزار کی حفاظت کرتے ہیں اور وہاں کئی حافظ ہر وقت قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ امیر تیمور کا اصلی مزار سنگ مرمر کے عین نیچے ایک تہ خانہ میں واقع ہے۔ اور وہاں روشنی کا کافی انتظام ہے اور وہاں ہرن کی کھال پر لکھا ہوا قرآن شریف کا ایک نسخہ رکھا ہوا ہے۔ مجاور نے ہمیں بتلایا کہ وہ قرآن شریف حضرت عثمان غنیؓ نے تحریر فرمایا تھا اور تیمور اس نسخہ کو بروصہ سے یلدرم کے خزانہ سے لے آیا تھا دیوار پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا

"عمل العقیر عبد اللہ محمود الاصفہانی"

وہاں مجھے ایک کمرے میں پیغمبر اسلام کا موئے مبارک دکھلایا گیا جس کی بہت حفاظت کی جاتی ہے۔

۱۔ امیر تیمور کا قبیلہ

۲۔ اب وہ نسخہ لینن گراڈ کے عجائب گھر میں ہے

باغ شمال تیمور کے زمانہ کا ایک خوبصورت باغ ہے اور شہر پناہ کے باہر واقع ہے۔

ہم سمرقند سے روانہ ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کہ امیر بخارا کی آمد کا غل ہوا۔ میں حاجیوں کے ہمراہ اس کی زیارت کے لئے گیا۔ امیر سیدھا سادھا آدمی تھا۔ سفید عمامہ اور معمولی لباس پہنے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کی رعایا نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ دوسرا دن عرض کے لئے مقرر ہوا۔ امیر نے حاجیوں کو بلا بھیجا جب میں حاضر خدمت ہوا تو امیر ایک قالین پر بیٹھا تھا۔ اور چاروں طرف کتابوں کے انبار تھے۔ میں تعریف و ثنا کہتا ہوا آگے بڑھا اور بادشاہ کے لئے دعائے خیر کی۔

"حاجی میں نے سنا ہے کہ تم روم سے آئے ہو۔" امیر نے [illegible] کیا

"حضرت میں جہاں گرد ہوں۔" میں نے جواب دیا "اور حضور کا شوق دیدار مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔"

"اے تم لنگڑے ہو کر جہاں گرد کیسے بن گئے؟" امیر نے پوچھا۔

"امیر تیمور جہاندار تھے اور وہ بھی لنگڑے تھے" میں نے جواب دیا

امیر نے بہت سے سوالات کئے اور مجھے خلعت دیکر رخصت کیا

اب روانگی کا وقت قریب تھا۔ میرے ہمسفر جنہیں مجھ سے دلی محبت تھی مشرق کی طرف جا رہے تھے اور میں اکیلا اجنبی آدمیوں کے ہمراہ ہرات کی طرف جانے والا تھا۔ میرا دل بھر آیا اور رخصت کے وقت زار زار رویا۔ کچھ عرصہ کے بعد قافلہ ہرات کی طرف روانہ ہوا اور میں سمرقند کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہاں سے بادل ناخواستہ چلا۔

ہرات

ہرات دریائے ہری رود کے کنارے افغانستان کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس کی آب و ہوا ایران اور توران کے تمام شہروں سے زیادہ خوشگوار ہے۔ اور مناظر کی خوبصورتی تمام دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

میں جس زمانہ میں ہرات میں وارد ہوا وہاں امیر شیر علی خان والیٔ افغانستان کا جگر گوشہ سردار یعقوب خان حکمران تھا۔ اور یمن کے حکمران سے لڑائی ہو رہی تھی۔ میں سمرقند سے قرش اور یمن کی راہ ہرات پہنچا۔ راستہ پہاڑی تھا مگر مناظر دلفریب تھے۔ جب قافلہ عبداللہ انصاری کی پہاڑی کی اوٹ سے نکلا تو ہرات کا خوشنما منظر نگاہوں کے روبرو تھا شہر کے اردگرد کی زمین بے انتہا زرخیز اور [illegible] بھی ہرات کئی دفعہ اجڑا اور آباد ہوا۔ موجودہ شہر آبادی کے قریب تیمور کے ہرات کے کھنڈر بکھرے پڑے تھے۔ اور ان میں مصلائے گول مینار اصفہان کی یاد دلاتے تھے

ہم دروازۂ عراق سے شہر میں داخل ہوئے بازاروں میں ہندو، تاتاری، ترکمان ایرانی پہلو بہ پہلو چلتے پھرتے نظر آتے تھے افغان سپاہی خوبصورت وردیاں پہنے ادھر ادھر گھوم رہے تھے ہر شہری اور فوجی ہتھیار بند نظر آتا تھا۔ مدرسہ مزار سلطان حسین مرزا گورگانی نے بنوایا تھا اور چار سو برس بعد بھی اس کی خوبصورتی بدستور قائم تھی [illegible]۔ گور در دروازۂ عراق سے دروازۂ قندھار تک چلا گیا تھا۔ افغان تاتاریوں کی طرح محض سادہ لوح نہیں ہیں بلکہ عیاری اور عقلمندی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے مسافروں کے مال واسباب پر بھاری ٹیکس وصول کیا گیا۔ اور حاجی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے شہر میں زیادہ تر خراسانی اور ایرانی آباد ہیں اور ترکمانوں کے چند ایک قبائل بھی رہتے ہیں۔ ایرانی تجارت پیشہ ہیں اور افغان فوج میں ملازم ہیں۔ پٹھانوں کی فوجی وردیاں انگریزی فوجی وردیوں سے کم شاندار نہیں میں نے ہرات میں پہلے پہل مسلمانوں کی منڈی ہوئی ڈاڑھیاں دیکھیں اور مجھے خوشی ہوئی کہ یورپی تہذیب بتدریج ایشیا میں اپنا اثر پیدا کر رہی ہے میں تبدیلی ہیئت سے اکتا چکا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی انگریز سے ملکر اسے اپنا راز بتاؤں مگر تلاش کے باوجود مجھے مایوسی ہوئی میری نقدی ختم ہو چکی تھی اس لئے میں نے اپنا گدھا بیچ دیا۔

۱۔ [illegible] عامہ

۲۔ ویسے [illegible] تھا۔

نے ابومسلم کو قتل کروا دیا چونکہ اس کے لاکھوں فدائی تھے۔ اس لئے عجب نہیں ہے کہ انھوں نے اس کی لاش کو افغانستان کے ایک غیر معروف گوشے میں دفن کر دیا ہو۔

سلطان حسین مرزا والیٔ ہرات کے علم دوست وزیر امیر علی شیر نے اپنے زمانۂ اقتدار میں بدخشاں میں حضرت علی کے مزار کی جستجو کرنے کے لئے حکم دیا اور اس کا وہ حکم بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔

حضرت بہاؤالدین کا مزار مبارک

حضرت بہاؤالدین نقشبند کا مزار مبارک بخارا سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ حضرت نقشبند نے ترکستان میں دین اسلام کی اشاعت کی اور آج تک ترکمان ان کے نام پر والہ و شیدا ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت بہاؤالدینؒ بلاگردان کو تمام آفات سے بچنے کے لئے کافی ہے دور دور سے زائرین ان کے مزار کی زیارت کے لئے آتے ہیں ہفتہ میں ایک بار بخارا سے زائرین مزار مبارک کی طرف جاتے ہیں۔ اس روز کارواں سرائے میں ہزاروں گدھے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور زائرین ان پر سوار ہو کر زیارت کے لئے چلتے ہیں۔ اگرچہ راستہ میں بڑی گہری ریت ہے مگر گدھے خود بخود تیز رفتاری سے اڑتے چلے جاتے ہیں۔ واپسی میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ گدھے مزار کی طرف بھاگتے ہیں اور مالک شہر کی طرف ہانکتے ہیں۔ آخر کار بڑی مشکل سے مارتے پیٹتے ان کو واپس لاتے ہیں تاتاری اسے حضرت نقشبند کا معجزہ خیال کرتے ہیں۔ مزار مبارک ایک باغ میں واقع ہے۔ جس کے ایک کونے پر ایک وسیع مسجد ہے۔ مزار پر کوئی گنبد نہیں ہے مختلف سلاطین نے متعدد بار مضبوط گنبد بنوانے کی کوشش کی مگر ہر بار گر گیا۔ تھوڑے فاصلہ پر حضرت نقشبند کے پیر میرؒ کا مزار ہے اور عوام کی زیارت گاہ ہے

تخت سلیمانی

علاقہ قوقند میں ایک شہر اوسہ واقع ہے۔ اس شہر کے وسط میں ایک سطح مرتفع ہے جو توران میں ایک مشہور زیارت گاہ ہے۔ وہاں ایک پرانی عمارت کے کھنڈروں میں سنگ مرمر کا ایک تخت رکھا ہے جس کو تخت سلیمانی کہا جاتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت سلیمانؑ اس پر بیٹھ کر داد حکمرانی دیا کرتے تھے۔ اسی شہر میں وہ مقام واقع ہے جہاں پہلے پہل حضرت آدم نے کاشت کی تھی اور زائرین ہزاروں کوس سے اس مقدس زیارت کے لئے آتے ہیں۔

یورپین محققین کا خیال ہے کہ اوسہ کا شہر سکندر یونانی کی سلطنت کی سرحد پر واقع تھا وہاں اس نے یونانیوں کی نوآبادی بسائی تھی اور وہاں کے کھنڈر یونانی عمارتوں کے بقایا ہیں۔ واللہ اعلم۔

سد سکندری

سکندر یونانی نے شہرۂ آفاق دیوار تورانی قبائل کے حملوں کی روک تھام کے لئے بنوائی تھی۔ دیوار چالیس میل لمبی تھی۔ جابجا برج تعمیر کئے گئے تھے۔ جن میں جنگجو یونانی سپاہی رہتے تھے موجودہ زمانہ میں دیوار کے صرف نشانات باقی رہ گئے ہیں۔ اینٹیں سرخ گول اور پتلی ہیں۔ اینٹوں کو جوڑنے میں جو مصالحہ لگایا گیا ہے وہ نادر قسم کا ہے اینٹوں کا توڑنا آسان ہے مگر ایک دوسری سے الگ کرنا مشکل ہے۔ تورانی اس دیوار کی اینٹوں سے مساجد تعمیر کرنا اپنا مقدس فرض سمجھتے ہیں۔ دیوار کے نزدیک جابجا بہت اونچے نیچے ٹیلے ہیں۔ وہ خدا معلوم اپنے سینے میں کونسے اسرار پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ترکمانوں نے بعض چھوٹے ٹیلے کھودے ہیں۔ ان سے مٹی کے برتن نکلے ہیں۔ جو کاغذ کی طرح پتلے ہیں ان برتنوں میں نیلی راکھ سونے کے سکے اور قیمتی اشیاء ملی ہیں۔

مشہد مصریان

دریائے ایترک کے شمال میں بحیرۂ خزر کے مشرقی ساحل کے

[illegible] واقع ہے جو مدت وسط ایشیا میں یونانی اقتدار کی یادگار ہے چند منچلے یونانی قبائل نے سکندر کی افواج سے علیحدہ ہو کر وہاں اپنی حکومت قایم کی تھی مگر ان کا اقتدار دیر تک قایم نہ رہ سکا اور آخر کار ان کی ہستی تورانیوں میں گم ہو گئی۔ جا بجا کھنڈر اور ٹوٹی ہوئی دیواریں نمایاں ہیں۔ شہر پناہ آٹھ فٹ چوڑی اور پچاس فٹ اونچی ہے اور یونانی طرز کی اینٹوں سے بنی ہے کسی زمانہ میں اس دیوار نے تورانیوں کا مقدور بھر مقابلہ کیا ہو گا وہاں ایک شکستہ یونانی قلعہ ہے جس کے گرے ہوئے ایوان تورانیوں کی جوانمردی کے شاہد ہیں۔ دریائے ایترک وہاں سے ایک سو پچاس میل کے فاصلہ پر ہے مگر یونانی پانی کی بہم رسانی کے لئے وہاں سے نہر کاٹ کر لائے تھے جس کے نشانات ابھی تک موجود ہیں۔ تورانیوں کا خیال ہے کہ یہ عمارت کسی نبی کی عبادتگاہ تھی اور دریائے جیحون اس کی دیواروں کو چومتا ہوا بہا کرتا تھا کفار نے نبی کو شہید کر دیا جس کی وجہ سے عمارت ٹوٹ پھوٹ گئی۔ دریائے جیحون سینکڑوں میل دور چلا گیا اور یہ علاقہ صحرا بن گیا

سر عبدالقادر بالقابہ نے سفر یورپ کے دوران میں لوبلی لیٹ کے مقام پر ومبیرے سے ملاقات کی تھی ملاقات کے مفصل حالات انتخاب مخزن جلد دوم میں درج ہیں۔

طرزِ قدیم

جناب شیخ محمد مظہر الحق صاحب مظہر سلطانپوری

گلے پر مرے تیغ چلتی نہیں — کوئی دل کی حسرت نکلتی نہیں

طبیعت جدھر آ گئی، آ گئی — قضا ہے کہ آئی تو ٹلتی نہیں

جوانی کا رہنا ہے دو دن عروج — یہ دولت حسینوں کو پھلتی نہیں

یہ ناخواندہ مہماں ہے حسرت مری — نکالے سے دل کے نکلتی نہیں

نہیں دل سے جاتا ہے سودائے زلف — یہ کالی بلا سر سے ٹلتی نہیں

مدارات رندوں نے کی شیخ کی — کہ پگڑی سنبھالے سنبھلتی نہیں

تری آرزو بھی ہے پردہ نشیں — کبھی دل سے باہر نکلتی نہیں

نرالی زمانہ سے ہے کشتِ عشق — یہ جب پھولتی ہے تو پھلتی نہیں

پڑھیں ہم نے مظہر بہت سورتیں — مگر کوئی صورت نکلتی نہیں

شبِ وصل

ایک دردناک افسانہ

(از جناب سید شمیم صاحب - عزمی - الہ آبادی)

(۱)

اکتوبر کی ایک سرد ترین رات تھی - لندن میں ویسے ہی کیا کم سردی پڑتی ہے - لیکن اس روز تو اس قیامت کی سردی تھی کہ الاماں و الحفیظ ساتھ ہی کہر اس شدت سے پڑ رہی تھی - کہ رات اور دن میں تفریق ناممکن ہو گئی تھی - ۲ بجکر ۴ منٹ پر کہر پڑنی شروع ہو گئی تھی - اسکے بعد سے اس وقت تک جبکہ رات کے ۱۰ بجکر ۵۵ منٹ ہو چکے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت آفتاب غروب ہوا - اور کس وقت رات ہوئی - جیسی تاریکی اس وقت تھی ویسی ہی اسوقت تک موجود ہے - لیکن کچھ بھی ہو لندن جیسے عظیم الشان شہر میں یہ ناممکن تھا کہ کسی وقت بھی جمود طاری ہو - کسی وقت بھی اس کی گہما گہمی میں سستی پیدا ہو - البتہ بیرونی مضافات میں کامل سکوت رہتا ہے - چاہے دن ہو یا رات - اسی لئے ٹینٹ پیٹرک اسٹریٹ جو شہر سے باہر واقع ہے اور بیرونی مضافات میں سب سے بڑا محلہ سمجھا جاتا ہے - اس وقت بالکل خموشی کا مسکن بنا ہوا تھا - کبھی کبھی سرمئی رنگ کی ہموار پختہ سڑک پر سے گذرتے ہوئے موٹر کے ٹائروں کی مدھم آواز جو ٹائروں اور سڑک کے اتصال سے پیدا ہوتی ہے - وہاں کی قیامت خیز خموشی میں مخل ہو جاتی تھی ورنہ پھر ایک طویل خموشی کا دور دورہ۔

سڑک کے مشرقی ... نئی تعمیر شدہ خوبصورت کوٹھیاں میں سب سے زیادہ جاذبِ نظر کوٹھی اکونٹ الفریڈ مارک کی تھی - جو سینٹ پیٹرک اسٹریٹ کی سب سے زیادہ خوبصورت کوٹھی تھی اکونٹ الفریڈ لاج کی یوں تو بہت سی خصوصیات تھیں - لیکن اس میں سب سے زیادہ دلکش و دلچسپ حصہ کونٹ کا نگارخانہ تھا - جو دنیا کی نادر تصاویر سے مزین تھا - اور ساتھ ہی یہ ان لوگوں کے لئے باعثِ تحیر بھی تھا - جو کونٹ کو نہایت خشک، مذاق اور غیر شاعرانہ طبیعت کا مالک سمجھتے تھے - کونٹ کے بس میں ایک لڑکی ہی تھی - مس ہیلن مارک جسے وہ دنیا کی ہر قیمتی چیز پر ترجیح دینے کو تیار تھا - اور جو اس کی خشک صحرا سی زندگی میں ایک گلِ بے خار تھی - جو باوجود قلتِ آب کے ایک سرسبز و شاداب پودے کی طرح صحرائی ہواؤں میں بھی بہار کی تمام جان ہوا کا مزا لے کر جھوم رہی تھی - وہ خوب صورت ہرنی تھی - جو کونٹس مارک اور کونٹ مارک کی آغوشِ محبت میں کلیلیں کرتی پھرتی تھی یا سمجھ لیجئے ! ایک حسین تیتری ! جو آزادی سے چمنستان ہستی میں پرواز کر رہی تھی - وہ بے حد حسین تھی - لیکن خود اپنے حسن سے بیگانہ - وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کتنی خوبصورت ہے - نہ تو اس سرو قد نازنین نے کبھی اپنے ہرن جیسے چست و گداز جسم پر غور کیا تھا - نہ اپنی اس کمر پر جس کی لچک دورانِ رقص میں ایک قیامت برپا کر دیتی تھی - اور جس کی نزاکت شعراءِ مشرق کے تخیل سے

بھی بالاتر تھی۔ ہاں! وہ اکثر اپنی نیلی آنکھوں اور بھوری بھوری دراز زلفوں کو دیکھا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کے احمریں لب انہیں دیکھ کر متبسم بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن وہ فوراً ہی کچھ دیر کے بعد اپنے ہجوم خیالات کو ایک بلند آہنگ نقرئی قہقہے کے ساتھ فضا میں منتشر کر دیتی تھی ؛

طفلی ہی میں اس قدر آزادی کے ساتھ اتنے خوشگوار ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے فطرت نے اس کے دل و دماغ میں کوٹ کوٹ کر شعریت بھر دی تھی۔ اس کو اب ہر چیز میں ایک جذبۂ شعریت رقص کناں نظر آتا تھا۔ اس کا دل شعریت پر نثار تھا۔ وہ ہر وقت اشعار پڑھ پڑھ کر سر دھنتی تھی۔ اس کے دل میں شاعرانہ جذبات کے سمندر موجیں مار رہے تھے۔ لاطینی اطالوی۔ فرانسیسی اور انگریزی جیتی زبانوں سے بھی وہ واقف تھی۔ ان زبانوں کے شاید ہی کسی قابل ذکر شاعر کا کلام اس نے نہ پڑھا ہو۔ ورنہ یورپ کے ہر استاد سخن کے چیدہ اشعار ہر وقت اس کی نوک زبان رہتے تھے۔ رباعیات عمر خیامؔ اور یونان کے ان باکمال شعرا کا کلام جن کے تراجم لاطینی، اطالوی، فرانسیسی یا انگریزی زبانوں میں سے کسی میں بھی ہو چکے تھے۔ اس کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ اور وہ ان کو پڑھ پڑھ کر سر دھنتی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ اسی ذوق کے زیر اثر رسالہ "پوئیٹ" کی ایک دلکش نظم کے پڑھنے میں محو تھی۔ جس کے ایک ایک شعر کو خدا معلوم اس نے کتنی مرتبہ پڑھا تھا۔ آخر اس نے اکتا کر رسالہ کو رکھ دیا۔

"الحفیظ الحفیظ" ہیلن نے رک رک کر کہا۔ "کیا خیالات ہیں کس قدر لطیف جذبات ہیں۔ خدا کی قسم اگر ولیم بارٹلے نے ایسی ہی دو چار نظمیں اور لکھ دیں۔ تو میں مر جاؤنگی! ورنہ پاگل ضرور ہو جاؤنگی معلوم اس کی نظموں میں کیا سحر ہوتا ہے۔ جب پڑھتی ہوں دل تھام کر رہ جاتی ہوں"

یہ کہتے ہوئے حسین ہیلن نے لیٹے ہی لیٹے ایک زہد شکن انگڑائی لی۔ اور پھر دوشیزہ گال کر کے محو خواب ناز ہو گئی۔

(۲)

از دفتر دی منتھلی پوئیٹ۔
پرنسز گیٹ۔ مشرقی لندن۔
۲۲ نومبر ۱۹۳۶ء

ڈیر میڈم

آپ کا خط ملا۔ ہمیں نہایت افسوس ہے کہ آپ کی دریافت کردہ آمد سے ہم خود قطعی لاعلم ہیں۔ ولیم بارٹلے! اس سے آگے ہم کچھ نہیں جانتے کیونکہ اسکی نظموں اور اس کے مضامین میں صرف اس کا نام ہی ہوتا ہے۔ ہمنے بارہا کوشش کی کہ اس کا پتہ معلوم کر سکیں لیکن ہماری ہر سعی ناکامی کا پیام لائی۔ (ایڈیٹر)

دی لٹریری میگزین۔ لندن
بائرن اسٹریٹ۔ جنوبی لندن
۲۲ نومبر ۱۹۳۶ء

مائی ڈیر میڈم

ہم یہ لکھتے ہوئے نہایت شرمندہ ہیں۔ کہ آپ کے جواب طلب امر کے جواب سے ہم خود بے خبر ہیں۔ البتہ اس کے خطوط پر مشرقی لندن کے پوسٹ آفس کی مہر ہوتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ مشرقی لندن کے کسی محلہ میں رہتا ہو۔ ہمیں بے حد مسرت ہوگی اگر آپ نے اس کا پتہ دریافت کر لیا

آپ کا خیر اندیش ایڈیٹر

یہ اور اس قسم کے اور متعدد خطوط جو مختلف رسائل اخبارات کے دفاتر سے موصول ہو رہے تھے اور ہیلن کی پریشانیوں میں اضافہ کرنیکو کافی تھے۔

"میرے معبود! ولیم بارٹلے کسقدر پُر اسرار شخصیت کا مالک ہے" ہیلن نے خطوط پڑھنے کے بعد ایک تھکن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "جس سے پوچھو وہی لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے؟ وہ کون ہے؟ یہ

(خاموش ہو کر دیوار پر لگی ہوئی ایک حسین تصویر کو گھورنے لگتی ہے۔ اور پھر جیسے چونک کر)

او ہو! میں تو شاید دیوانی ہو جاؤنگی! دیوانی! ہاں اب مجھے زیادہ غور نہ کرنا چاہئے (پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) "ٹھیک! بالکل ٹھیک!! شاید یہ ترکیب کامیاب ثابت ہو" اسے بے انداز مسرت جھوم کر کہا۔ "شاید اس طرح سے میں کامیاب ہو سکوں ——— !"

"کون ——— ؟ کون ہے؟ روزی؟ جولیا؟ آخر کون ہے؟ مارگریٹ ——— ؟

نہیں! نہیں ٹھیک ہے۔ ہیلڈا۔ الس بس چھوڑ دو۔ میں سمجھ گئی"۔

ایک بلند نقرئی قہقہے کے ساتھ ہی مس میری آرل نے ہیلن کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لئے۔

"بیوقوف! شریر لڑکی" ہیلن نے کچھ تعجب کر کہا۔ "یہ لو ہے؟"

"آہاہا!" میری ہنسی کے مارے لوٹنے لگی۔ "خوب! خوب! میری خوبصورت چڑیا۔ آج کہاں گئیں ما دھوکا؟"

"تو کیا ہوا" ہیلن نے متبسم ہو کر کہا۔ "تو کیا ہوا بس ایک ہی دفعہ تو نا؟"

میری پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ "آہا! خوب مزہ آیا جب میں اپنی میری جیسی حسین سہیلی سے سورن وصول کرونگی۔ دھوکا دینے کا دلچسپ انعام۔ تو! تو کتنا مزا آئے گا۔

سورن! پورا! ایک سورن! ۲۰ شلنگ اور ——— اور ......" (میری ہنستے ہوئے ایک کمانی دار کرسی پر گر جاتی ہے)

"بیوقوف نہ بنو!" ہیلن نے خود بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "سورن اتنی آسانی سے نہیں ملتا"۔

"آہاہا! آہا! دیکھو میری پیاری تم کتنی جلدی بھول جاتی ہو" میری نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ "شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں [illegible]"

[illegible] ذرا سنجیدہ بنو" ہیلن نے اس کی [illegible] ہنسی سے اکتا کر کہا۔ "مجھے تم سے کئی باتوں میں مشورہ کرنا ہے"۔

"او ہو!" میری نے قدرے سنجیدہ انداز سے کہا۔ "بی بنو! تم میرا سورن ہضم کرنا چاہتی ہو۔ خوب! دیکھو کہے دیتی ہوں۔ کہ میں اپنا جیتا ہوا سورن کبھی نہ چھوڑونگی"۔

"اچھا! اچھا!" ہیلن نے متبسم ہو کر کہا۔ "میں تم کو یاد دلا کر تمہارا سورن دے دوں گی۔ لیکن ابھی نہیں"۔

"ہرگز نہیں! ہرگز نہیں۔ میں بالکل کھرا لونگی۔ اور لونگی بھی ابھی"۔

"اچھا تو کیا تم نصف سورن پر معاملہ نہیں کر سکتیں" ہیلن نے مزاحاً کہا۔

"قطعی نہیں وعدہ ہو چکا ہے۔ وعدہ!" میری نے کہا۔ "میں ایک فاردنگ بھی نہیں چھوڑ سکتی"۔

"اچھا تو تم مجھ پر اعتبار کرو" ہیلن نے کہا۔ "کیا تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو"۔

"بیشک!" میری نے کہا۔ "لیکن اس معاملہ میں نہیں"۔

"اچھا! تو ابھی لے لینا"۔

"غلط بات" میری بولی۔ "ابھی نہیں اسی وقت دو"۔

"میرے اللہ!" ہیلن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو تو پوری شیطان ہے"۔

"نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ"۔ میری نے یہ کہا اور پھر دونوں بامذاق سہیلیاں ہنسی سے لوٹنے لگیں۔

"تریر کہیں کی" ہیلن نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "لے اپنا سورن"۔

"لاؤ! لاؤ" میری لیتے ہوئے بولی۔ "شکریہ! اب کہو کیا کہتی ہو"۔

"میں کہوں تو سہی اگر ہنسی میں نہ ٹال دو جب"

"ہاں! ہاں میں وعدہ کرتی ہوں (متبسم ہو کر) اور اگر ایک سورن اور دلواؤ۔ تو قسم تک کھانے کو تیار ہوں"۔

"چل چل! بس رہنے دے! لالچی کہیں کی۔ ہیہات بھی سُنتی"

"اچھا لکھو" میری نے کرسی کو قریب کرتے ہوئے کہا۔
"یہ تو تم جانتی ہی ہو" ہیلن نے کہنا شروع کیا۔ "کہ میں کتنی مدت سے بارٹلے کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں"۔
"ہاں ہاں۔ مجھے اس وحشت کا علم ہے"۔
"خیر وحشت ہی سہی۔ بہرحال یہ تو تم بھی مانتی ہو کہ بارٹلے کی ہستی کسقدر پراسرار ہے"۔
"ہو گی ——"
"ہو گی نہیں بلکہ تم نے خود بارہا اس کا اعتراف کیا ہے"
"اچھا اچھا اب لکھو گی بھی یا ویسے ہی"۔
"ہاں تو میں نے سوچا ہے کہ میں بھی اسی رسالے میں ایک مضمون شائع کراؤں۔ جو ایک خط کی صورت میں ہو۔ اور اس میں اس صورت سے بارٹلے کو پیام ملاقات دیا جائے کہ ماسوا اس کے کسی علم کو نہ ہو سکے اور میرا مطلب بھی حل ہو جائے"۔
"ہاں تجویز تو اچھی ہے! اگر کارگر ہو جائے!"
"دیکھو امید تو ہے۔ آگے۔ آگے خدا مالک ہے"۔
"عنوان کیا ہو گا مضمون کا؟"
"شاید صحف جذبات، مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیوں؟"
"واہ کیا کہنا! ہے نا آخر شاعر کی بیٹی - - - - - -"
"چل دور ہو نابکار۔ تجھے ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے"

(۳)

... دسمبر کی حسین صبح کو جبکہ سرد ہوا کے نرم تھپیڑے جسم میں بجلی کے ساتھ ساتھ ایک مسرور کن گدگدی پیدا کر رہے تھے۔ ... صورت آفتاب کی پیلی دھندلی دھندلی زردی مائل شعاع کے ... ہوتے ہی۔ ہیلن کی مشتاق نگاہوں نے اپنے محبوب کا مسرت بخش پیام دیکھا۔ جو اس کی تخیلی محبوبہ کے نام تھا۔ لیکن! اسکی صحت اس کی اصلیت سے صرف ہیلن کا دل ہی واقف تھا ... چپکے چپکے ہیلن سے کہہ رہا تھا۔
"پیاری ہیلن یہ مسرت افزا پیام تیرے نادیدہ محبوب نے تجھ ہی کو دیا ہے۔ وہ پیام دلکش۔ دلکش و لطیف پیام جو دوسروں کیلئے محض "ادب لطیف" کا ایک شاہکار ہے۔ تیرے لیے عین پیام تیرے پاکیزہ جذبات کے خوشنما تحفہ کا حسین جواب ہے"۔ ہیلن کی مسرت سے سرشار نیم باز آنکھوں نے اپنے محب کا پیام پڑھا۔ لیکن پھر بھی وہ سیر نہ ہوئی۔ وہ گھڑی گھڑی مضمون کے اس حصہ کو پڑھتی اور سر دھنتی تھی۔
"—— اے میری محبوبہ تو نے مجھے بلایا ہے
میں سوچتا ہوں کہ مجھے شادیٔ مرگ کیوں نہ ہو گئی جب تیرا یہ راحت بخش پیام صبح کی خنک ہوا نے مجھے لا کر دیا۔ پچھلی رات کے ٹمٹماتے ہوئے ستارے کچھ عرصہ سے مجھے پلکوں کے اشارے سے اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے۔ لیکن جب میں نے انکی محفل میں تیری ضیاء حسن کی کارفرمائیاں دیکھیں۔ تو میں وہاں جانے کی جرأت نہ کر سکا۔
سچ بتا! اے میرے ارمانوں کی دنیا میں بسنے والی حسین محبوبہ۔ تجھ میں کون سی ایسی قوت مضمر ہے۔ جو مجھے میرے مقابل آنے سے روکتی ہے۔ میں تیرے قدموں پر لٹریں جما کر چلتا ہوں تو مجھے کوئی دقت نہیں ہوتی۔ میں تیرے جسم کو دیکھتے ہوئے چلتا ہوں۔ جب بھی میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ لیکن۔ لیکن! اے سحر ساز نازنین! جب میں تیری نیلی آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوں۔ تو میری ساری قوت سلب ہو جاتی ہے۔ میں بالکل بے حس ہو جاتا ہوں۔ اور میں اپنے آپ کو بالکل بے جان مجسمہ تصور کرنے لگتا ہوں۔ شاید اسے ہی نظر کا جادو کہتے ہیں؟ شاید۔ لیکن مجھے تو آنا ہی پڑے گا آنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ میری سنہرے بالوں والی

ہو۔ میں تیرا حکم نہیں ٹال سکتا۔ میں ضرور تیری بارگاہ حسن میں باریاب ہوں گا۔ لیکن

لیکن میری دلربا میں تو اس وقت کے خیال سے بھی مارے مسرت کے قریب المرگ ہوا جاتا ہوں۔ کجا حقیقت!

کیا میں واقعی اتنا خوش بخت ہوں؟ کیا! کیا یہ ممکن ہے؟ اُف کیا اس وقت ارض و سما کا ذرہ ذرہ ساکنان انجم، ماسد گان قرمجھ پر رشک نہ کریں گے۔ جب سر نازک سر میرے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہوگا۔ جب سری عنبریں زلفیں ہوا کے گستاخ جھونکوں سے بکھر بکھر کر فضا دماغ کو معطر کریں گی۔ اور اور جب میرے کانپتے ہوئے ہونٹ تیرے احمریں لبوں سے پیوستہ ہوں گے۔

اُف! کیا میں اتنا خوش نصیب ہوں۔ کہ اس وقت زندہ رہ سکونگا۔ نہیں، شاید نہیں لیکن — ؟ لیکن میں آؤنگا۔ میرے تخیل کو حقیقت کی شمع سے روشن کرنے والی حسینہ میں آؤنگا۔ وہاں! وہاں جہاں تونے بلایا ہے۔ "کوہ سبز" کی خوشنما وادیوں میں جو کہ خوبصورت چوٹی حسین کیوپڈ کے لئے مخصوص ہے اور جہاں موسم بہار میں فضائے آسمانی پر پرواز کر کے ہوائی خوشنما پریوں کے مکان ہیں۔ ہاں میں وہیں آؤنگا۔ میری محبوبہ اپنے بے چین دل کو تیرے قدموں پر نثار کرنے وہیں آؤں گا —"

حسین ہیلن کی خوبصورت آنکھیں جوش مسرت سے چمک رہی تھیں "کوہ سبز" کی خوشنما وادی۔ آہ! کتنا دلکش مقام ہے۔ میں ضرور جاؤں گی۔ اپنے محبوب سے ضرور ملنے جاؤں گی"

لیکن آہ! وہ کہنے لگی "آہ! کہیں میں سو تو نہیں رہی۔ کہیں یہ سب سراب تو نہیں۔ یہ تو میری زندگی کے وہ رنگین خواب ہیں۔ جنہیں میں روز دیکھتی ہوں۔ اور جو آج تک شرمندہ تعبیر نہ ہوئے۔ کہیں میں اسوقت بھی تو خواب نہیں دیکھ رہی؟ لیکن! نہیں میں یقیناً بیدار ہوں۔ تو! تو پھر میں کس قدر خوش نصیب ہوں۔ میں کسقدر خوش قسمت ہوں"۔

ہیلن نے جذبۂ شوق سے بیخود ہو کر آنکھیں بند کر لیں باد سحر کے گستاخ جھونکے اس کے گلابی رخساروں کو بوسے دے رہے تھے۔ اس کی سنہری زلفوں سے کھیل رہے تھے لیکن وہ بے خبر تھی۔ اس کا تصور اس کے نادیدہ محبوب کی حسین تصویر سے آباد تھا۔ اور تصور ہی تصور میں اپنے محبوب کی بانہوں میں لپٹی اس کے خوبصورت کالر سے کھیل رہی تھی۔

(۴)

شام اپنی تمام کافرادائیوں کے ساتھ جلوہ فرما ہو گئی۔ نیلے اور سپید بادلوں کی اوٹ میں آفتاب کا الوداعی — حسن شام میں ایک کیف آگیں لطافت پیدا کر رہا تھا —

دامن کوہ میں موجزن سمندر کی لہروں میں آفتاب کی زرد کرنیں لوٹ رہی تھیں۔ حسین ہیلن اپنی سحر سامانہ اداؤں کے ساتھ صنوبر کے قد آور درختوں کے کنج میں ٹہل رہی تھی۔

"اُف! میں کیا جانتی تھی۔ کہ انتظار کے لمحات اسقدر طویل ہوتے ہیں"۔ ہیلن نے کوہ سبز کی حسین وادی کی آغوش میں جذب ہو جانے والی پر پیچ پگڈنڈی پر نظر گاڑتے ہوئے کہا حسن پر ابھی تک اس کی مست خرامیوں کے چند مو ہوم نشانات ثبت ہوئے تھے۔

"او خدا! میں کب تک اس کا انتظار کرتی رہونگی" اس نے وقت کی آہستہ روی سے گھبرا کر کہا۔

"اُف کسی طرح آفتاب غروب ہی نہیں ہوتا"۔ وہ پھر

بےچینی سے ٹہلنے لگی۔ لیکن یکایک وہ چونکی۔ "شاید کوئی آ رہا ہے۔
اس کے پژمردہ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔
اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کے مقابل صنفِ قوی
صنفِ لطیف دو متضاد اصناف کے اوصاف وجاہت و
نزاکت کا ایک مخلوط حسین سراپا کھڑا تھا۔ جو دنیائے ادب
میں تہلکہ مچا دینے والا۔ ولیم بارٹلے تھا۔ جس کا حسین جسم سیاہ
سرج کے خوبصورت فراک کوٹ اور بُردباری کے بہترین نمونے
پتلون میں ملبوس بالکل یونان کے ان حسین دیوتاؤں سے مشابہ
تھا۔ جن کے حسین مجسمے بنانے میں اہلِ یونان اپنا تمام فنِ صنم سازی
ختم کر دیتے تھے۔ اور پھر بھی اپنے حسین مجسموں کو اصل کے مقابلہ
میں تشنہ تکمیل ہی پاتے تھے۔

"کیا میں مس ہیلن بارک صاحبہ کی ملاقات کا شرف حاصل کر رہا
ہوں۔" آنے والے خوبصورت جوان ولیم بارٹلے نے مؤدبانہ کہا۔

"جی ہاں مجھ حقیر ہی کو ہیلن کہتے ہیں۔ اور کیا میں مسٹر ولیم
بارٹلے سے مخاطب ہونے کی عزت حاصل کر رہی ہوں۔" ہیلن نے
اپنے خوشنما ہاتھوں کو بارٹلے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میڈم میں ہی ولیم کے نام سے بدنام ہوں۔" بارٹلے
ہیلن کے ہاتھوں کو گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

"خوب۔ میں بے حد مسرور ہوں۔ مجھے بے حد مسرت ہے
کہ وہ معزز ہستی جو عوام کے لئے ایک معمہ لاینحل بنی ہوئی ہے۔
آج میرے سامنے کھڑی ہے۔"

"شکریہ مس صاحبہ! شکریہ!" بارٹلے نے متبسم ہو کر کہا "میں
بے حد مشکور ہوں کہ آپ مجھ حقیر ہستی کو اس قدر اہمیت دے رہی
ہیں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم"

(۵)

ملاقات کے ابتدائی مراحل پرتکلف جملوں سے طے ہو گئے
اور اس کے بعد جب وہ رخصت ہوئے۔ تو ایک دوسرے کے
گہرے دوست تھے۔

آفتاب کو غروب ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ آسمان پر
حسین ستاروں کی ٹولیاں کی ٹولیاں نکل آئی تھیں۔ منگین روڈ
جو کوہ سبز کے دامن میں پیچ و خم کھاتی ہوئی لندن کی طرف چلی گئی
تھی اس وقت برقی قمقموں سے اچھی طرح روشن تھی۔ ولیم بارٹلے نے
ہیلن کے خوبصورت ہاتھ کو پکڑا اور دونوں پہاڑ سے اترنے لگے۔

(۶)

وقت گذرتا گیا اور وقت کے ساتھ ہی ساتھ ولیم بارٹلے
اور حسین ہیلن کی ابتدائی دوستی تکلفات کی حدود سے متجاوز ہو کر
بےتکلفی اور پھر محبت کی آہنی زنجیروں میں جکڑ گئی۔ گو یہ سب کچھ
ہوا لیکن ہیلن بارٹلے کی شخصیت سے اب بھی اتنا ہی ناواقف
تھی۔ جتنا کہ پہلے۔ لیکن وہ مطمئن تھی۔ کیونکہ اس کی خواہش بھی
بارٹلے کی قربت حاصل کرنے سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اس کی سچی
پرستار تھی۔ لہذا اس کی ہستی اب بھی ویسی ہی پراسرار اور
مخفی رہی جیسی کہ تھی۔

(۷)

نوروز کی شعریت انگیز شام تھی۔ "کوہ سبز" کی حسین وادی
میں کیوپڈ کے دو شکار ناوکِ محبت کے دو زخمی انتہائی طمانیت
قلب کے ساتھ فطرت کے بچھائے ہوئے فرشِ زمردیں پر بیٹھے تھے
دونوں کے بشاش چہرے محبت کے مقدس و مطہر نور سے منور ہو رہے
تھے۔ اور دونوں ایک محویت کے عالم میں غروب آفتاب کے دلکش
پرور منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ صنوبر کے فلک بوس درخت
بالکل ساکن تھے۔ سمندر کی نیلی ردا پر باریک باریک شکنیں پڑی
ہوئی تھیں۔ جس میں آفتاب کے اس الوداعی منظر کی پوری جھلملاتی
ہوئی تصویر منعکس تھی۔ خدا معلوم قربتِ محبوب میں کیا نشہ
ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں کشتگانِ الفت لگاتار نصف گھنٹے تک
اس پرشعریت ماحول میں کھوئے رہے۔ اور پھر ان کی محویت کا
یہ لامتناہی سلسلہ اس وقت ٹوٹا۔ جب شام کے ان وجد آفریں
مناظر پر تاریکی کا غلبہ ہو رہا تھا۔

"پیاری ہیلن"۔ ہیلن کے حسین محبوب ولیم بارٹلے نے
اپنی محبوبہ کی ریشم سے زیادہ نرم اور ملائم سنہری زلفوں سے کھیلتے

دیکھتے ہوئے کہا۔ "پیاری ہیلن تم اس وقت کتنی حسین معلوم ہو رہی ہو بالکل ان خوبصورت پریوں کی مانند جو میں (زہرہ) کی دلکش وادیوں میں رہتی تھیں۔ اور جن کا لاثانی سحر سار حسن خود ملکہ وینس کے حسین بیٹے کیوپڈ کو مسحور کر دیا تھا۔"

"کیوپڈ!" ہیلن نے متبسم نظروں سے بارٹلے کو دیکھا اور پھر فطرت کی بوقلمونیوں اور رنگ آمیزیوں کے سمندر میں غوطہ کھانے لگی لیکن یکایک کسی فوری خیال کے زیر اثر چونک کر بولی۔

"میرے محبوب!" بارٹلے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیا ہم ہمیشہ اسی طرح آپس میں ملتے رہیں گے۔ کیا اس ممکن ہے۔ کہ ہم مذہب اور دنیا والوں کی نظروں میں بھی سلک یگانگت میں منسلک نظر آئیں۔"

بارٹلے نے کسی قدر گھبرا کر ہیلن کو دیکھا۔

"کیا کہہ رہی ہو۔ ہیلن؟ کیا ہم اب بھی ایک دوسرے کے نہیں ہیں؟"

"نہیں یہ بات نہیں" ہیلن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ اگر ہم آپس میں شادی کر لیں تو کیا اچھا ہو۔"

"ہاں!" بارٹلے بولا۔ "ہاں اس سے زیادہ بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن ہیلن یہ ہمارے لئے خوشگوار ثابت نہیں ہو سکتا۔"

"یہ کیوں؟" ہیلن نے مجسم سوال بن کر کہا۔ "آخر کیوں؟ کیا دنیا کے تمام معزز انسان شادیاں نہیں کرتے؟"

"آہ! پیاری" بارٹلے نے رنجیدہ صورت بنا کر کہا۔ "آہ! کیا آج مجھے زندگی کا وہ اہم ترین راز منکشف کرنا پڑے گا جو ہماری شادی میں حائل ہے۔"

"راز؟؟" ہیلن نے حیرت سے پوچھا۔ "راز؟ کیسا راز؟ کیا ہماری زندگیوں میں کوئی راز بھی ہے؟"

"ہاں ہیلن! راز میری زندگی کا اہم ترین راز" وہ بولا "لیکن میں تم کو زیادہ عرصہ تک تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا۔ گو میں جانتا ہوں کہ اس کے کہتے ہی تمہاری یہ محبت نفرت میں بدل جائیگی لیکن نہیں میں تم سے آج ضرور کہوں گا۔"

ہیلن نے تعجب سے اس مجسم اسرار ہستی کو دیکھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ڈیر ہیلن کیا تمہارا قلب نازک اس وحشتناک خبر کے سننے کا متحمل ہو سکتا ہے۔"

"کیا تم کو تعجب نہ ہوگا۔ اگر میں کہوں"۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ "اگر میں کہوں کہ میں مشہور ڈاکو 'جان نکولس' ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ جیسے اس کے سر سے کوئی ورنی بوجھ اتر گیا ہو۔ لیکن ہیلن؟ ہیلن کی عجیب حالت تھی وہ اپنے آپ کو زمین و آسمان کے مابین بالکل معلق پا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ زمین پر ہے یا آسمان پر۔ وہ اپنے گرد بالکل خلا محسوس کر رہی تھی۔ جان نکولس! وہ سوچ رہی تھی۔ وہ مشہور و معروف ڈاکو جس کے نام سے سارا یورپ تھراتا ہے۔ جس کے وجود کا احساس حکومت کو بھی خواب میں چونکا دیتا ہے۔ جس کی جستجو میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کے نامی گرامی سراغرسانوں نے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ جس کی اسیری کے لئے حکومت نے پانچ ہزار پونڈ کا گرانبہا انعام مقرر کیا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ پریشان کن اور مغالطہ انگیز بات اس مشہور و معروف ڈاکو! اس حسین انسان کا اس قدر بلند اخلاق اسقدر اعلٰے کیرکٹر کا مالک ہونا اس قدر نیکدل اور شریف ہونا اور سب سے بڑھ کر ایک عدیم المثال شاعر ہونا تھا۔ وہ حیران تھی کہ ایک شخص اس قدر غیر شاعرانہ ماحول میں رہنے والا۔ اس قدر اخلاق شکن اور غیر مہذب پیشہ کا مالک، نازک خیال شاعر اور قابل ادیب ہو سکتا ہے۔ یہی ایک بات تھی۔ جو ہیلن کے دل کو بارٹلے کا قول بعید از صداقت سمجھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ہیلن گوناگوں خیالات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ لیکن بارٹلے اطمینان سے سبزہ کے قدرتی فرش پر بائیں ہاتھ پر سر ٹیکے نیم دراز لیٹا سگریٹ کے بڑے بڑے کش لگا رہا تھا۔ اس کا دل ہر قسم کے خیالات سے بالکل پاک تھا۔ اچانک ہیلن نے اس سے

پُر اطمینان چہرہ کو دیکھا۔ اس وقت اس کے چہرہ پر بے حد معصومیت برس رہی تھی۔ اس کا دل بے چین ہوگیا۔ اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

"پیارے ولیم! چاہے تم دنیا کی نظروں میں کتنے ہی قابل نفرت اور ذلیل کیوں نہ ہو۔ لیکن میرا دل تمہاری اسی طرح پرستش کرتا رہے گا۔ وہ تمہارا اسی طرح شیدا رہے گا۔ میرے محبوب تمہارے اس انکشافِ راز نے کچھ دیر تک ضرور مجھے متعجب رکھا لیکن میرے پیارے اس کا اثر میری اور تمہاری سچی محبت پر کچھ نہ پڑا۔ اور میں اب بھی تم سے اسی صدق دل سے محبت کرتی ہوں جیسی کہ پہلے۔

میں جانتی ہوں۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ پاپا اور سوسائٹی مجھے کبھی بھی تم سے شادی کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں۔ کہ قانون بھی تم کو کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ لہذا دنیا میں ہمارے لئے پُر محبت ازدواجی زندگی بسر کرنا ناممکن ہے اور ہم اپنا یہ ارمان اسی وقت پورا کرسکتے ہیں۔ جب ہماری روح جسم کی اس عارضی قید سے ہمیشہ کے لئے رہا ہو جائے۔ بس میرے پیارے! ہم کیوں نہ آج ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کرکے ہمیشہ کے لئے آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ سوسائٹی، قانون، اور پاپا سے اپنی مقدس محبت کی تحقیر و تذلیل کرواؤں۔ میں اس راز کے منکشف ہونے سے قبل ہی محبت کی قربانگاہ پر بھینٹ ہو جانا چاہتی ہوں"

وہ ایک استقلال اور خودداری نہ لب ولہجہ میں ایک ملوکانہ انداز سے اپنی قسمت کا فیصلہ کررہی تھی۔ بارٹلے نے یہ سب سنا۔ وہ دفعتہً چونک پڑا۔ وہ کسقدر مسرور تھا۔ اسے ساری دنیا میں مسرت ہی مسرت نظر آرہی تھی۔

"میرے حسین خوابوں کی حسین تعبیر! میری دنیائے تخیل میں بسی رہنے والی خوبصورت ہیلن!"

وہ جھوم جھوم کر کہہ رہا تھا۔ "خدا کی بنائی ہوئی سب سے زیادہ حسین مخلوق عورت کا دل بھی کس قدر حسین ہے اس کے جذبات کسقدر پاکیزہ ہیں۔ خدا کے پیارے بیٹے یسوع مسیح کی قسم محبت صرف عورت کرسکتی ہے۔ عورت محبت کی دیوانی عورت! وہ صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ صرف ایکبار اور جس سے کرتی ہے۔ ہمیشہ اُسی کی ہو رہتی ہے"۔

اس نے بیخود ہوکر ہیلن کو اپنی آغوش شوق میں بھینچ لیا اور اُسی وارفتگی اور بے اختیاری کی حالت میں اس کے پُرتعش لب ہیلن کے احمریں کانپتے ہوئے لبوں سے اولیں و آخری بار پیوستہ ہوگئے۔

دو مقدس روحوں دو تشنگانِ محبت کے لبوں کا اتصال، دو ناآشنائے سرور لبوں کا پہلی اور آخری بار واقف لذت ہونا معمولی بات نہ تھی۔ ساری کائنات صہبائے محبت میں غرق تھی۔ ذرہ ذرہ پر مہر محبت ثبت نظر آرہی تھی۔ دو محرومانِ محبت ہم آغوش تھے۔ دونوں کے لب ایک دوسرے سے پیوستہ تھے۔ اور! اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ ہمیشہ کے لئے بند! روح اس فردوسی لذت کی تاب نہیں لاسکتی تھی۔

ماہ نوردزرا اور جھلملاتے ہوئے خوبصورت ستارے حیرت سے اس پُر استعجاب منظر کو دیکھ رہے تھے اور انکی خاموش زبانوں پر بھی محبت کی اس عظیم الشان فتح کی داستان کا چرچا تھا۔ محبت کا حسین فرشتہ عشق کی کمان سے محبت کے تیر برسانے والا دیوتا! نابینا۔ کیوپڈ ان شہیدانِ محبت کے سرہانے کھڑا تھا۔ آج وہ اپنی عمر میں پہلی بار اپنے شکاروں کی بیچارگی پر غمگین نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ مغموم کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھا۔ اس نے اپنے باغ کے خوبصورت پھولوں کی دو مٹھیاں بھر بھر کر انکے مقدس جسموں پر ڈالیں۔

کوہ سبز کی حسین وادی میں رہنے والی خوبصورت پریوں نے اپنے طلائی بربطوں پر دھیمے غمگین سروں میں محبت کا نغمہ چھیڑ دیا۔ محبت کے دیوتا۔ کیوپڈ کا مغرور سر آج اولیں بار خم تھا۔ اور اسکی بے نور آنکھیں پہلی بار پُرنم تھیں۔

(طبعزاد)

نوائے مضمرؔ

صحیح

از محترمہ آر۔ کے۔ بانو صاحبہ مضمرؔ

یاد ہے اُف عشق کی وہ ابتدا میرے لئے — وہ کسی کی اک نگاہِ دلربا میرے لئے

وہ اُٹھی کعبہ کی جانب سے گھٹا میرے لئے — میکدہ ہونے لگا آراستہ میرے لئے

یاد ہیں وہ سوئے در اٹھتی ہوئی نظریں تری — ہر نگاہِ منتظر اک اِلتجا میرے لئے

پھر نگاہِ ناز کو ہے میرے دل سے التفات — عام ہے گویا محبت کی صلا میرے لئے

کوئی میخانے میں کب تک منتظر بیٹھا رہے — لے بھی آ اے ساقیٔ رنگیں ادا میرے لئے

ایک میں ہوں وجہ رسوائی تمہارے واسطے — ایک تم ہو زندگی کا آسرا میرے لئے

زانوئے ساقی پہ سر ہے ہاتھ میں جام و سبو — صرف میں ہے میکدے کا میکدا میرے لئے

ان کے ہونٹوں پر تبسم مست آنکھوں میں شراب — کیف میں ہے گردشِ ارض و سما میرے لئے

ٹھوکروں سے وہ کسی کی پے بہ پے توہینِ عشق — ناصیہ فرسائی کی وہ انتہا میرے لئے

دو جہاں سے کھو دیا کمبخت نے مضمرؔ مجھے

ایک آفت ہے دلِ درد آشنا میرے لئے

رباعیات!

جناب منشی محمد عطاء اللہ صاحب عطاؔ منتظم کتبخانہ اسٹیٹ کلیانی

۱

اسبابِ طرب بادہ سرجوش میں ہیں — سب عیشِ جہاں قسمتِ مے نوش میں ہیں
کہتا ہوں قسم کھا کے میں تجھ سے زاہد — جنت کے مزے ساقی کی آغوش میں ہیں

۲

صہبا نہیں کوئی بتِ طناز نہیں — توبہ کی طرح عیش کا دمساز نہیں
کیوں ہم کو بلاتا ہے عبث اے واعظ — محفل میں تری سوز نہیں ساز نہیں

۳

بے سود ہے رندوں کو نصیحت زاہد — بدلے گی نہ میخواروں کی فطرت ساقی
کچھ سوچ ذرا طعنہ زنی سے پہلے — شاید ہے یونہی رب کی مشیت ساقی

۴

پندارِ خودی آج مٹا دے ساقی — بیگانہ مجھے خود سے بنا دے ساقی
بھر آج تو اس آتشِ سیال سے جام — ہستی کو بھی جو آگ لگا دے ساقی

لانگ فیلو کی ایک نظم

خستگی حیات

کا آزاد ترجمہ

مارچ کی خوبصورت روح افزا شام کو آفتاب کی زریں شعاعیں صاف شفاف سفید چمکیلی موجوں پر رقصاں ہیں جلوہ گاہ دنیا کا ذرہ ذرہ جوش طرب سے جگمگا رہا ہے دامن فلک پر شفق کے رنگا رنگ نقش و نگار "حسن قدرت" میں ایک سحر آگیں اضافہ کر رہے ہیں۔ بادِ جنوب کے معنبر ہلکے ہلکے جھونکے باغ عالم کے حسین پھولوں کو جنبش دے رہے ہیں۔ (ایراد) اس مسحور کن اور دلکش وقت میں بھی اے رہرو جادۂ حیات کے افسردہ و خستہ قدم تو امید و بیم سے بھرے ہوئے شاہراہ زندگی پر جادہ پیما ہے اور ایک عرصہ دراز سے پرصعوبت خارزار زندگی کی رہروی اور بار حیات نے تجھکو زخمی کر دیا ہے اور آبلہ دپا ـــ تو ہمت شکستہ اور افسردہ نہ ہو۔ "منزل مقصود قریب ہے۔ جہاں تیرے تفکرات حیات کا خاتمہ ہو جائیگا پھر آرام ہوگا اور دائمی راحت ـــ اُف ـــ "راہ حیات کی درازی" اور طویل قیام نے تجھے خستہ کر دیا ہے۔

او شاہکار صمدی کے دستِ حسنہ! تو اس طلسم کدہ دنیا میں حاکم رہا ہو یا محکوم تو اہل علم کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا ہو یا تو نے دوسروں کو اپنے بحر فیض سے فیضیاب کیا ہو تیرے مشاغل خواہ کسی کسی نوع کے ہوں اب تو ہر شغلہ سے گھبرا گیا اور بار حیات نے تجھکو خستہ کر دیا۔ اے بے صبری سے دھڑکنے والے ٹوٹے دل! تیری خواہشیں اور آرزوئیں جو لامحدود ہیں اور بے پایاں "تو عصا آرزو پر مثل ایک شعلہ ماماک کے چمک رہا تھا خستگی اور افسردگی حیات نے تیرے تمام جذبات احساسات جلا کر خاکستر کر دیئے۔ آرزوئیں بجھ کر تیری تابانی ان میں پوشیدہ ہوگئی روح! اے میری پاکیزہ اور معصوم روح! تقدس اور انوار ربانی کی شعاعیں تجھ پر اس طرح جلوہ پاش ہوتی ہیں جیسے آفتاب کی درخشاں کرنیں ـــ لیکن اے جوئی زندگی کے گہرے کہریں تو دھندلی نظر آنے لگی آہ! مادہ پرست دنیا کے طولانی قیام نے تجھکو اے پاکیزہ روح اس طرح تاریک و کثیف کر دیا ہے جس طرح غروب ہونے والا گہرا آفتاب

(فاطمہ لیاقت منشی فاضل)

غزل

محترمہ کنیز فاطمہ خاتون صاحبہ حیا لکھنوی

بڑھ گئی ہے کچھ زیادہ بیقراری ان دنوں
کر رہا ہے دل بہت فریاد و زاری ان دنوں

یاد پھر بےچین رکھتی ہے تمہاری ان دنوں
بڑھ گئی ہے وحشتِ دل پھر ہماری ان دنوں

شوق کہتا ہے کہ چلئے کوئے جاناں کی طرف
چاہیئے وارفتگی کی پاسداری ان دنوں

پھر بہار آئی ہے جی اُمڈا ہے یادِ دوست میں
دل کرے زاری و آنکھیں اشکباری ان دنوں

اک نگاہِ ناز نے یہ کر دیا ہے کیا سے کیا
دل کی رگ رگ میں بسی ہے بیقراری ان دنوں

آہ یہ برسات کا موسم یہ زخموں کی بہار
ہو گیا ہے خونِ دل آنکھوں سے جاری ان دنوں

کیا تقاضا کیجیئے ان سے نگاہِ لطف کا
بے نیازی ہے وہاں یاں سوگواری ان دنوں

چھوڑ دو اس بیوفا دنیا کو تم بھی اے حیا
کر نہیں سکتا ہے کوئی غمگساری ان دنوں

جمہوریت کا مستقبل

از جناب علی احمد صاحب فرزند حضرت جلیل مدظلہ

اپنے بڑھتے ہوئے علم اور عقل کی روشنی میں انسان کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اپنے لئے ایک بہتر سے بہتر طرز حکومت کی تشکیل دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ملک کی حکومت ہمیشہ مستقل نہیں رہی بلکہ اس کا طرز نسلاً بعد نسلاً مختلف شکلیں اختیار کرتا گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ یونان قدیم اور روم میں جمہوریت کا دور دورہ تھا۔ وسط یورپ میں آزاد شخصی حکومتیں تھیں اور آج یورپ نے پھر جمہوریت کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ غالباً دنیا نے اب بالاتفاق جمہوریت کو حکومت کا بہترین طرز تسلیم کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ترقی یافتہ ممالک نے اس کے کسی نہ کسی طرز کو اختیار کر لیا ہے۔ جمہوریت اب حکومت کی آخری شکل مان لی گئی ہے۔ لیکن بدلتی ہوئی دنیا کی بسیط فضا میں ہر طرف [illegible] مگر ہم یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ جمہوریت مستقل طور پر قائم رہے گی جب کہ وہ دائمی تغیر کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔

اقوام کا خیال اور رجحان سال بہ سال بدلتا رہتا ہے اور جوں جوں غیر متوقع خرابیاں ظاہر ہوتی جاتی ہیں نئے ادارے وجود میں لائے جاتے ہیں اور اپنے کمال کو پہنچنے سے قبل ہی زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ ان حالات کے تحت یہ امید ہرگز نہیں رکھی جا سکتی کہ جمہوریت کلی استقلال حاصل کرے گی۔ اس جمہوریت کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم صرف اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل ماضی سے مختلف ہوگا۔ لیکن کن صحیح معنوں میں مختلف ہوگا یہ کہنا ناممکن ہے۔ جمہوریت کی پہلی کرنیں جب شخصی حکومتوں کی تاریک راہوں کو طے کرتی ہوئی نکلیں تو اس نے [illegible] منزل دکھلائی جو چند ہی قدم آگے تھی...

ہر ایک دل کو اس شعاع امید نے روشن کر دیا اور سالہا سال کی انتھک کوششوں کے بعد انسان نے اس دستور حکومت کو پا ہی لیا جو اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت خوش آئند معلوم ہوتا تھا۔ اور گذشتہ حکومتوں کے تمام نقائص سے پاک تھا۔ اس نئے طرز حکومت نے ہر فرد کے حقوق کی آزادی کو محفوظ کر دیا اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ دنیا نہ تو مزید سیاسی انقلابات کا شکار ہوگی اور نہ کسی شخصی حکومت کے مظالم کا نشانہ بنے گی۔ لیکن اس کو وجود میں آئے ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ گذرا تھا کہ جمہوریت ان تمام امیدوں میں ناکام رہی جو اس سے پہلے وابستہ تھیں نہ صرف یہ بلکہ چند ایسی خرابیاں بھی ظاہر ہوئیں جن کا پہلے گمان تک نہ تھا۔ جمہوریت کے مستقبل کو کامیاب سمجھنے میں انسان اب اتنا [illegible] روشن خیال نہیں رہا جتنا کہ ایک صدی قبل تھا۔ اس کو اب اس تلخ حقیقت کا احساس ہو چکا ہے کہ دنیا میں کوئی طرز حکومت مکمل نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ فطرت انسانی خود مکمل نہ ہو جائے اور یہ جان کر اور بھی مایوسی ہوئی کہ جمہوریت میں وہی خرابیاں ہیں جن کو رفع کرنے کے لئے اس کا وجود عمل میں آیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جمہوریت کم از کم سیاسی مظالم کا خاتمہ کر دے گی لیکن یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ جمہوری دور میں بہ گذشتہ کی شخصی حکومتوں کے بہ نسبت مظالم میں کوئی نمایاں کمی نہیں ہوئی۔ علاوہ اس کے اور بھی کئی طریقوں سے ہماری جمہوریت سے وابستہ امیدیں منقطع ہوتی جا رہی ہیں۔ جمہوریت عوام کی اکثریت کو [illegible] کی ناانصافیوں سے محفوظ رکھنے میں ناکام رہی، اور ان کا حکومت میں کوئی معقول دخل نہ پیدا کر سکی۔ سب سے

زیادہ یہ کہ انسانی مصائب اور مفلسی کا ازالہ ہوا۔ جو عوام کے نمائندے اکثر ناکارہ ثابت ہوئے اور صاحبِ اقتدار اشخاص اپنی ذمہ داریوں سے ہمیشہ ناآشنا رہے جیسا کہ ایامِ گذشتہ میں ہوتا آیا تھا جس کے سبب نہایت ہی ابتر نتائج ظہور پذیر ہوئے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر موجودہ زمانے میں جمہوریت کی طرف سے لوگوں کا اعتقاد جاتا رہا۔

مدبروں اور سیاست دانوں کو اب یہ شبہ ہونے لگا کہ اٹھارویں صدی کی شخصی حکومتوں کے مقابل میں کسی حد تک جمہوریت کے طرزِ عمل کو بہتر اور کامیاب مانا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ایک دانشمند حکمران اپنے قابل افسروں کی مدد سے موافق حالات کے تحت دنیا کی موجودہ جمہوری حکومتوں سے بہتر طرزِ حکومت قائم کر سکتا ہے۔ جمہوریت کے نتائج سے ناامید ہو کر چند لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پرورش پا رہا ہے کہ آمریت حکومت کی سب سے بہتر شکل ہے بشرطیکہ حکومت کا صدر ایک قابل اور مدبر شخص ہو جو جملہ اختیارات کا مالک ہو۔ کسی جمہوری حکومت کے باشندے ہی حکومتوں سے ہرگز مطمئن نہیں بلکہ برخلاف اس کے وہ اس کی مذمت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ امریکہ میں ظالمانہ طریقے پر جماعت بندی کے خلاف سب سے زیادہ شکایت ہے جس کی بدولت ہر فرد کو کامل آزادی نہیں ہے۔ فرانس میں سب سے بڑی خرابی بلاک سسٹم ([illegible]) کی ہے جس نے تمام سیاسی اداروں کو متزلزل کر دیا ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کے معاشی مسائل سیاسی پیچیدگیوں سے الجھ گئے ہیں جس کی وجہ سے بے شمار خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں حتیٰ کہ سوئٹزرلینڈ میں بھی جہاں کہا جاتا ہے کہ جمہوریت نے بہترین نتائج پیدا کئے ہیں، حکومت کے خلاف بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ جمہوریت کے خلاف ان تمام بے اطمینانیوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ نئی شکلیں اختیار کر رہی ہے اور نئے نئے پہلو بدل رہی ہے۔ صدارتی جمہوریت ایوانی شکل میں اور ایوانی صدارتی میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ نمائندگی کے طریقہ میں بھی مسلسل تغیر ہو رہا ہے۔ نئی ترکیبیں روزانہ پیدا کی جا رہی ہیں تاکہ ذمہ دار حکومت میں عوام کا بھی دخل رہے۔ بعض ملکوں میں براہِ راست قانون وضع کئے جا رہے ہیں اس امید پر کہ عوام کے اختیارات پہلے کی بہ نسبت وسیع تر ہو جائیں۔ ان تمام تغیرات اور ترمیمات کے باوجود جو آئے دن جمہوریت میں ہو رہے ہیں، عوام نتائج سے مطمئن نظر نہیں آتے اس لئے بعض لوگوں کو یہ اندیشہ ہے کہ جمہوریت کو استقلال حاصل نہ ہوگا اور کوئی تعجب نہیں کہ لوگ پھر پرانے شخصی یا بادشاہی طرزِ حکومت کی طرف مائل ہو جائیں۔

اگر جمہوریت ہی کو حکومت کی آخری شکل تسلیم کر لیا جائے اور یہ امید کی جائے کہ جمہوریت دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی، تو ہم ابھی سے یہ فرض کرتے ہیں کہ لوگ سیاسیات میں ہمیشہ دلچسپی لیں گے اور سیاسی اقتدار کا دم بھرتے رہیں گے۔ اس خیال کو فی الحال کسی طرح ہم ثابت تو نہیں کر سکتے تاہم اس وقت صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ عوام نسبتاً اقتدار سے انس رکھتے ہیں لیکن یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا یہ انس دائمی رہے گا۔ اقتضائے حالات کے تحت عوام کی سیاسیات میں دلچسپی کم ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اقتدار سے نفرت کرنے لگیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صورتِ حالات زندگی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے تحت عوام کے لئے روز بروز دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی سیاسی زندگی میں اسی قدر حصہ لیں جتنا کہ غیر ممالک والے حصہ لیتے ہیں اور لے رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا وقت بھی آئے جب کہ اپنے وجود کے لئے مقاومت اس قدر دشوار ہو جائے کہ لوگوں کو سیاسیات میں حصہ لینے کا وقت تک نہ ملے اور اس طرح جمہوریت کا شیرازہ بکھر جائے۔ یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ ناامیدیوں اور شہری ذمہ داریوں کی الجھنوں کے باعث لوگ جمہوریت سے بیزار ہو جائیں۔ ایسی صورت میں ایک دفعہ شاہی حکومت پھر فروغ پا سکتی ہے اور سیاسی منافسات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے عوام ممکن ہے اسی طرف راغب ہو جائیں۔

دوسرا خطرہ جس سے جمہوریت کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فی زمانہ معاشی مسائل میں سیاسی معاملات نے کافی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس صنعتی دور میں معاشی مشکلات کی ہنگامہ خیزیوں نے سوسائٹی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بالخصوص سرمایہ داروں اور مزدوروں کے جھگڑے تو بہت ہی خطرناک حالت اختیار کر چکے ہیں۔ مزدور پیشہ طبقہ میں یہ خیال روز بروز ترقی پاتا جا رہا ہے کہ وہ سرمایہ داروں کے

...مغرب کا شکار رہتے ہوتے ہیں اور ان کی تمام مصیبتوں کا باعث
صرف سرمایہ داری ہیں یقینی طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ اس وقت
...حل معاشی مشکلات کی گتھی سلجھ سکتی ہے اور نہ غریبوں کی مصیبتوں
کا خاتمہ ہو سکتا ہے جب تک کہ سوسائٹی کی ایک نئی اصولی تنظیم نہ کی
جائے۔ ایسی تنظیم کہ امیر و غریب میں کوئی نمایاں امتیاز باقی نہ رہے
اور سب زندگی کی پرپیچ و دشوار رہ گزار طے کرنے کے لئے ایک ہی
صف میں کھڑے نظر آئیں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اکثر و بیشتر لوگ تو آزادی
کی ہوسنی پر جمہوری حکومت کی بھینٹ چڑھا دینے کے لئے بھی تیار
ہیں جمہوری حکومت کی موجودگی میں اگر معاشی جدید تنظیم کا آغاز
بھی کر دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ کامیابی کی آخری منزل پر پہنچنے کے
بعد جمہوریت پھر اپنی اصل حالت پر عود کر آئے اس لئے تہذیب کی
متلاطم موجوں کے نیچے اس کو دفن کر دینا ہی بہتر ہوگا تاکہ پھر کبھی دوبارہ
ابھر نہ سکے۔ تیسرا سب سے بڑا خطرہ جمہوریت کو جنگوں کے چھڑ جانے
کا ہے۔ سائنس کی روز افزوں ترقی نے آج کل کی جنگوں کو اس قدر
تباہ کن بنا دیا ہے کہ لوگوں اور تہذیب کی دنیا کے لئے ایک بڑا خطرہ پیدا
ہو گیا ہے۔ مستقبل کی ایک جنگ بھی تمام حکومتوں کے اعلیٰ معاشی
اور سیاسی نظام کو بدل دینے کے لئے کافی ہے اور انسانوں کی اس
عظیم قربانیوں کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جنگ کے اختتام کے ساتھ
جمہوری حکومتوں کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا چنانچہ ۱۹۱۴ء
کی جنگ عظیم کے بعد لوگ کہتے تھے کہ یہ دنیا کی آخری جنگ ہے جس نے
تمام آنے والی جنگوں کا خاتمہ کر دیا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کا مطلع سکون
جنگ کے مکدر بادلوں سے گھرا ہوا ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ کسی
شورش کے اونچے پہاڑ سے ٹکرا کر برس پڑے۔ بہرحال جمہوریت کے
مستقبل کے متعلق ہم کو بھی دہرانا پڑتا ہے کہ یہ زیادہ مدت تک اپنی اصلی
شکل کو قائم نہیں رکھ سکتی اس لئے کہ دنیا کی ہر چیز تغیر کا شکار ہے
جمہوریت کی کامیابی کا دارومدار وہاں کے باشندوں کی چند خوبیوں میں مضمر
ہے۔ مثلاً شہری ذمہ داریوں کا خیال۔ آزادی کا شوق۔ حکومت
سے متعلق نیک خیالات وغیرہ وغیرہ۔

اگر یہ خیالات باشندوں کے دلوں میں پرورش پا رہے ہیں
تو جمہوریت کو اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہئے لیکن ان
متذکرہ بالا اوصاف کے عدم وجود کی صورت میں یقینی جمہوریت کا مستقبل
تاریک اور بھیانک ہے۔

اب جمہوریت کے مستقبل کی بابت کوئی خیال ظاہر کرنے سے
پہلے یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آیا لوگ کیا ان ترقی کی راہوں پر گامزن
ہوں گے جن کی کشتی کی جمہوریت کے ناخداؤں نے رہبری کی ہے۔
یا اس درجے سے ادنیٰ پستی میں گر جائیں گے جہاں کہ وہ آج کل ہیں اس
مطلب کے لئے ہمیں اس بات کی تحقیق کرنا ہوگی کہ آدمی حقیقی معنوں میں
ترقی کر بھی رہا ہے یا نہیں۔ سائنس کی گوناگوں ترقیوں اور تکلفات
کے سامانوں نے ہمیں یہ غلط باور کرا دیا ہے کہ انسانی زندگی بہت
تیز رفتاری سے ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے لیکن جنگ عظیم کی
ٹریجیڈی نے اگر ہمارے رنگین خیالوں کو تاریک نہیں بنایا تو دھندلا
ضرور کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علم نے تحقیق کے ذرائع ریسرچ
کے آلات کافی طور پر مہیا کر دیئے ہیں اور قدرت کی مخفی ہوئی تمام
چیزوں پر قابو پا لیا ہے۔ علاوہ اس کے کلوں اور مشینوں کے ذریعہ
زندگی کی مسرتوں میں ناقابل بیان اضافہ کر دیا ہے۔ مگر ان ترقیوں
کا ساتھ انسانوں کی ذہنیتوں نے نہیں دیا بلکہ اب بھی اس مقام
پر ہیں جس پر کہ پہلے تھیں۔ یہ تمام حالات جمہوریت کے مستقبل کو
تاریک سائے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ باوجود ان تمام باتوں کے
اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کے خیالات بہت کچھ بدل
چکے ہیں اور جمہوریت کی رہبری کے ساتھ ساری دنیا میں پھیل
رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جمہوری حکومت لوگوں کو ایک
حد تک مطمئن کر رہی ہے اور بہ نسبت قدیم حکومتوں کے زیادہ
آرام و آسائش پہنچا رہی ہے اور اگرچہ ہنوز اس میں بہت سی خرابیاں
باقی ہیں اور لوگوں کو کامل طور پر سکون نہیں۔ تاہم وہ اس بات
کے لئے زیادہ کوشاں بھی نہیں کہ جمہوریت کو کسی اور طرز کی حکومت
میں تبدیل کر دیں۔

یادِ یارِ مہرباں کی آ رہی ہے ایک دم
آنسوؤں کی اک جھڑی سی آ رہی ہے چشمِ نم

از جناب سید حسن برنی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

ایک بلند پایہ فارسی نظم کا حسین ترین ترجمہ اردو میں

یادِ زلفِ تابدار آید ہمی — یاد موئے مشکبار آید ہمی
یاد زلفِ تابدار آنے لگی — یاد موئے مشکبار آنے لگی

شوقِ دیدارش ندارد ہیچ حد — آرزوئے کوئے یار آید ہمی
شوق ان کی دید کا حد سے بڑھا — آرزوئے کوئے یار آنے لگی

یاد بیگردی نگیرد راہِ من — یادِ بزمِ پُر بہار آید ہمی
یاد بیگردی نہ روکے گی مجھے — یادِ بزمِ پر بہار آنے لگی

تار تار پیرہن شد تار تار — نکہتِ گیسوئے یار آید ہمی
تار تار پیرہن ہے تار تار — نکہتِ گیسوئے یار آنے لگی

۲

ابر تیرہ شد مسلط بر ہوا — یادِ گشتِ مرغزار آید ہمی
کالے بادل آسماں پر چھا گئے — یادِ گشتِ مرغزار آنے لگی

آں بساطِ پُر فضائے سبزہ زار — یاد رود و آبشار آید ہمی
وہ بساطِ پُر فضائے سبزہ زار — یاد رود و آبشار آنے لگی

آں خرام با جمال با وقار — یاد کبکِ کوہسار آید ہمی
وہ خرام با جمال با وقار — یاد کبکِ کوہسار آنے لگی

آں کلامِ پُر مذاقِ بانمک — یاد نطقِ شاہوار آید ہمی
وہ کلامِ پُر مذاق و بانمک — یاد نطقِ شاہوار آنے لگی

در میانِ صحنِ گلشن وقتِ گشت — یاد حسنِ گلعذار آید ہمی
درمیانِ صحنِ گلشن وقتِ گشت — یاد حسنِ گلعذار آنے لگی

بر کنار رود آں لطفِ سرود — یاد وجد رود بار آید ہمی
وہ کنار رود پر لطفِ سرود — یاد وجد رود بار آنے لگی

آں صدائے بربط و مینا و چنگ — یاد عیش کامگار آید ہمی
وہ صدائے بربط و مینا و چنگ — یاد عیش کامگار آنے لگی

آں نسیم عطر بیز جانفزا — یاد آغوش دکنار آید ہمی
آں نشاطِ راز دناز بیکراں — یاد بوسِ بے شمار آید ہمی

وہ نسیمِ عطر بیز و جانفزا — یاد آغوش و کنار آنے لگی
وہ نشاط راز و نازِ بیکراں — یاد بوسِ بے شمار آنے لگی

۳

وقت رخصت آں سلامِ لوداع — یاد جان بیقرار آید ہمی
بعد رخصت حال آں زاروزار — یاد چشمِ اشکبار آید ہمی
از پے تسکین جان ناتواں — یاد عہدِ استوار آید ہمی
در فراق آں نگار سیمتن — یاد دور زر نگار آید ہمی

وقت رخصت وہ سلام الوداع — یاد جانِ بیقرار آنے لگی
بعد رخصت حال وہ زار و نزار — یاد چشمِ اشکبار آنے لگی
از پئے تسکین جان ناتواں — یاد عہدِ استوار آنے لگی
اس نگارِ سیمتن کے ہجر میں — یاد دور زر نگار آنے لگی

۴

امتحان جذبِ دل بینی مگر — گرد راہ پر غبار آید ہمی
طوطیائے چشم عاشق میشود — خاک پاک کوئے یار آید ہمی
یک نگاہ و صید بسمل صد ہزار — یاد چشم پر قبار آید ہمی
چشم پر نم شد رواں چوں ابر تر
یاد یار غمگسار آید ہمی

امتحان جذبِ دل ہے دیکھنا — گرد راہِ پُر غبار آنے لگی
طوطیائے چشم عاشق وہ بنی — خاکِ پاکِ کوئے یار آنے لگی
اک نظر میں صید بسمل سو ہزار — یاد چشم پر قبار آنے لگی
چشم پر نم ہے رواں چوں ابر تر
یاد یار غمگسار آنے لگی

لیکن ظفر کے کلام کو روشنی میں لانے سے پہلے ابھی ہمیں ایک مرحلہ اور درپیش ہے۔ غالباً سب سے پہلا فرض "ظفر کی شاعری" پر قلم اٹھانے والے کا یہ ہے کہ آبحیات میں مولینا آزاد نے استاد ذوق کو عقیدت کے پھول چڑھانے کے ضمن میں جو غریب بادشاہ کی عمر بھر کی کاوشوں کے ماحصل پر خاک ڈالی ہے۔ اس کی آلودگیوں سے ظفر کے کلام کو پاک کرے۔ آزاد کا دعوی ہے کہ کلیات ظفر کی جلد اول کے حصہ کو چھوڑ کر، باقی ساڑھے تین دیوان "سر تا پا ذوق کے ہیں"۔ ان کا قاعدہ ہے کہ جو بات کہیں اسے انتہا تک نہ لے چلے جاتے ہیں چنانچہ انھوں نے ایک بار یہ کہہ دینے کے بعد کہ ظفر کا بیشتر کلام ذوق سے ماخوذ ہے۔ اپنی بات کو آخر تک نباہا ہے اور ذوق کے حوالے میں مشکل ہی سے کوئی بات ایسی کہی ہوگی جس کے ضمن میں کنایۃً یا صراحتاً یہ امر جتا نہ دیا ہو۔

الغرض مولینا آزاد کے ان بیانات نے دنیائے اردو کو بڑی غلط فہمی میں ڈال دیا ہے ان کی بزرگی سر آنکھوں پر ہمارے لئے لازم نہیں کہ ہم آزاد کے ہر بیان پر آمنا و صدقنا کہہ دیں۔ آزاد تو ذوق و غالب کے موازنہ میں بھی کئی جگہ ڈنڈی مار گئے ہیں اور آبحیات کو اس کے وہ اجزاء علیحدہ کرنے کے بعد دیکھئے جو تحقیق حال نے رد کر دیئے ہیں تو انشا پردازی کے اعتبار سے بیشک بہت قیمت رکھتی ہے۔ تاریخی و تحقیقی نکتہ نظر سے زیادہ وقیع نہیں۔

سب سے پہلے تو یہ بات کچھ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ ظفر جس کے گھرانے میں پشتہا پشت سے شعر و سخن کا چرچا رہا ہو۔ ادب دوستی جس کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتے اور پروان چڑھتے رہے۔ خود مرزا ابراہیم ذوق کی دلہ ربائی کرے! ان فرصت و فراغت کے ایام میں تو ظفر کا خود شاعر ہونا کمال تھا کہ دل پر صدمے اور جھٹکے بھی اس قدر پہنچے تھے۔ خود کہتے ہیں ؎

دلِ رنجور کو میرے خمِ الفت نے ظفر
[illegible] صدمے دیئے جھٹکے پہ جھٹکے لاکھوں!

پھر اگر اساتذۂ کرام بھی اس کو نوے برس میں شعر گوئی کے قابل نہ بنا سکے تو خود ان کی استادی پر حرف آتا ہے۔ کچھ دل کو نہیں لگتا کہ ظفر جیسا موزوں طبع شیدائی سخن کہ تمام عمر فنا فی الشعر رہا۔ ابتدا شعور سے انتہائے عمر تک شعر کہنا نہ سیکھ سکا۔

ظفر کے کلام کا تجزیہ کیجئے تو بہت بڑا حصہ کلام ایسا نظر آتا ہے جو منہ سے بولتا ہے کہ ظفر کے علاوہ کسی کے دل سے نہیں نکل سکتا ایسے اشعار جن میں خالصتاً شاعرانہ و عاشقانہ جذبات ہوں۔ گمان کیا جاسکتا ہے کہ اوروں نے لکھ کر دے دیئے ہوں گے۔ مگر وہ کلام جو ظفر کی واردات سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی زندگی کی سچی تصویر ہے ممکن نہیں ہوسکتا کہ ذوق یا کسی اور استاد کے قلم سے نکلا ہو ملاحظہ کیجئے

اے ظفر اس وقت میں عزت ہے دولت کا سبب
[illegible] کہی

مہرۂ شطرنج شاہ اپنی ظفر ہے کیا بساط
کرتا ہے وہ [illegible] بردبات اپنے ہاتھ سے

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نام سلطنت

ایک دن وہ تھا کہ تھے یہ لوگ ہم سے کانپتے
ایک دن یہ ہے کہ ہم ان کے ستم سے کانپتے

رہے پیری میں اس لئے جیتے
دیکھنے کچھ عذاب کے دن تھے

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اسی قسم کے بیسیوں اشعار جن سے کلیات ظفر کے صفحات پر ہیں اور جن کے نمونے آپ آئندہ صفحات میں بھی دیکھیں گے ظفر کے علاوہ اور کسی پر چسپاں تو نہیں ہوتے۔ زبردستی کسی کے سر منڈھ دیئے جائیں تو دوسری بات ہے اسی طرح وہ اشعار جن میں ظفر نے اپنے مصاحبین کو پھٹکارا ہے اور ابنائے زمانہ کی خبر لی ہے۔ جگر نہیں تھا کہ اسے ندرانہ میں پیش کئے جاتے ؎

دیتے نہیں تو ڈر کے کرو اسا مجھے صاف جواب
اے ظفر ان کے پلے جو ہے سکر کے ٹکڑے

ہیں لوگ دغا باز ہوئے گرد ہمارے

شگفتگی بیان۔ ذوق کی ان تمام خصوصیات کے آگے ظفر کا دیوان پھیکا پھیکا ہے لیکن ظفر کی "سیاست" کا جو ذوق کے ہاں مطلق نہیں ملتا جو فی الحقیقت ظفر کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ ظفر کا ایک بڑا حصہ کلام "قنوطیت" سے لبریز ہے جس درد و اثر، سوز و گداز ظفر کے ہاں بافراط پایا جاتا ہے۔ ذوق کے کلام میں اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ ملاحظہ ہو ؎

ذوق } نو گرفتا قفس گر یونہی تڑپے صیاد
کوئی دم میں یہ سمجھ کہ قفس ٹوٹ گیا

ظفر } مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
اس قفس کے قیدیوں کو آب و دانہ منع ہے

ان دو شعروں میں معنوی تعلق تو تھوڑا ہی سا ہے لیکن کلام کے رنگ میں تمیز ضرور کراتے ہیں۔ یا یہ دو شعر دیکھئے ؎

ذوق } یاد آیا جو اسیران قفس کو گلزار
مضطرب ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گیا

ظفر } دیکھ کر ہوتے ہیں حسرت پرواز ہیں
ہائے کیا دم بے بال و پری آتی ہے!

بقول صاحب "گل رعنا" "سوز و گداز کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ و جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے" ظفر کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ "اب نہیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا"

سوز و اثر کے اعتبار سے دونوں شاعروں کا مختلف ہونا مثالوں کے ذریعے توضیح کی گنجائش تو نہیں رکھتا لیکن اسرار ہے۔ ذوق کے مشہور و معروف "احوال شب ہجر" والے قطعہ کو دیکھئے۔ شاعر پر جو کٹھن وقت گزرا ہے اُس کا تھوڑا بہت اندازہ اس سے کیجئے کہ "وہ کٹنی اک اک گھڑی سو سو مہینے" سارا قطعہ پڑھ جائیے فنی اعتبار سے لاجواب چیز ہے اور بہت کامیاب ؎

نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر
مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
حواس و ہوش جو مجھ سے قرین تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے

مرے سینہ زنی کا شور سنکر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے

مبالغہ، رعایت لفظی، استعارات و تشابیہ واقعی بہت کچھ قابل داد ہیں لیکن نفس مضمون کے اس قدر المناک ہونے کے باوجود درد و اثر کا کہیں نام نہیں۔ اب ظفر کا ایک شعر سنئے ؎

یار نہیں، غمخوار نہیں، ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں
کنج غم میں آپ ہی کہئے دل کو مرے بہلائے کون

سیدھا سادا سا شعر ہے۔ ذوق کے قطعہ کی صنائع میں سے ایک بھی اس میں موجود نہیں مگر سوز و اثر کی پوٹ ہے۔ ذوق کا قطعہ پڑھ کر آپ داد دیں گے اور ظفر کا شعر پڑھنے میں خود آپ کا لہجہ بدل جائے گا بس یہی دونوں شاعروں کے کلام کا فرق ہے۔ ایک جگہ کہا ہے ؎

اے ظفر رو دیا ہے جب میرا
کچھ سنا ماجرا کسی نے ہے!

ذوق کہتے ہیں ؎

مری سینہ زنی کا شور سنکر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے

دونوں شعروں کو آمنے سامنے رکھئے اور امتیاز کو خود محسوس کر لیجئے۔

ان دونوں شاعروں کا کلام اور بھی کئی باتوں میں مختلف ہے ظفر بقول آزاد "زمین کے بادشاہ" تھے طرح طرح کی اور رنگ برنگ کی زمینیں ظفر کی کلیات میں نظر آتی ہیں۔ ذوق کے ہاں یہ بوقلمونی زمین کی نہیں پائی جاتی۔ بیشتر کلام ذوق کا خوشنما زمینوں میں ہے ذوق محاورے کے بادشاہ ہیں اور یہ صفت اپنے کلام کی ہر جگہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے بہت سے اشعار میں محض محاورہ ہی محاورہ صاف نظر آتا ہے کہ یہاں ذوق محض اپنی زبان کی داد چاہتے ہیں کسی خیال یا کیفیت کا اظہار ثانوی حیثیت رکھتا ہے ؎

دکھانے کو نہیں ہم مضطرب حالت ہی ایسی ہے
مثل ہے رو رہے ہو کیوں کہا صورت ہی ایسی ہے
چھپی تو نے انشاں جو اسے مہ جبیں سے ہے!

ستاروں میں کہا کیا "چھان ڈالتے ہیں" ہے
رُکے اشک اور آہ پہنچی فلک پر!

مرا عشق "کم خرچ بالا نشیں" ہے
یہاں کے آنے کا مقرر قاصد اوہ دن کیجے

جو تو مانگے گا وہی دوں گا "مذاودن کیجے"
خدا کرے کہ تجھ سے یہ کچھ "سنا لگی"

کہ زلف اے بتِ بدکیش میرے کان لگی
دل مرا "بوسہ بہ پیغام" نہیں ہے ہمدم

یار لیتا ہے تو لے "اپنی زبانی مانگے"
تو جو کہتا ہے کہ دے ساغرِ مے غیر کو بھی

ہاتھ کیا اس کے ہیں اے عربدہ جو "ٹوٹ گئے"
کہہ تبدیل قوافی غزل اک اور بھی دق

دیکھیں کس طرح سے بتلاتا ہے تو "ٹوٹ گئے"

یہ آخری شعر ہمارے بیان کی تصدیق کو کافی ہے۔ اسی طرح تقریباً تمام کلام ذوق کا محاورات کی اچھی خاصی دھنگ ہے "ٹوٹ گئے" کے جتنے محاورے دیکھنے ہوں ردیف الیاء کے ماتحت اس غزل میں تلاش کر لیجئے۔ لیکن ظفر کا مطالعہ احتیاط سے کیجئے تو نظر آئے گا کہ اُن کا کلام بھی قلعۂ معلی کی صاف ستھری با محاورہ زبان میں ہے مگر انہیں شعر میں صرف محاورہ باندھنے کا کچھ ایسا شوق نہیں نظر آتا۔ ظفر کے ہاں بہت کم ایسے شعر نکلیں گے جن میں انھوں نے صرف محاورہ بٹھانا چاہا ہو۔ کسی صنعت کے پیدا کرنے یا کیفیات و خیالات کے اظہار میں ضمناً بیشک آجاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن خیالات میں تازگی و ندرت نہ ہو۔

ہم سے ظاہر وہ ہوئے صاف تو کیا ہوتا ہے
دل تو صاف اُن کا ہوا ہم سے ظفر جب تک نہیں

یہاں "تک نہیں" کی طرف شاید آپ توجہ بھی نہ کریں اظہار احوال کی طرف پہلے متوجہ ہوں گے زبان مضمون کے ماتحت ہے مضمون زبان کے ماتحت نہیں۔ چنانچہ یہ ایک ایسا نکتہ ہے کہ ذوق کے ہاں محاورہ جو بہ آوردہ ہوتا ہے اور بکار نظر آتا ہے۔ مگر ظفر کے

یہاں بے ساختہ ہوتا ہے اور خاموش سے

نہیں عزیزہ عزیزوں سے سرخرو ہرگز
ہوئے ہیں ایسے لہو زیرِ آسمان سفید!

کھلی ہے جس پر کہ کچھ حقیقت وہ کھول کر دیدۂ بصیرت
تماشے قدرت کے دیکھتا ہے نہ منہ سے بولے نہ سر ہلائے

ایک اور جگہ مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں "نوجوان ولی عہد، طبیعت کے بادشاہ تھے، ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی" واقعہ یہ ہے کہ بہادر شاہ کی عمر اُن دنوں ذوق سے کم و بیش دو گنی تھی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے مولانا کی رائے میں جوانی پہلے آتی ہے نوجوانی بعد میں۔ ذوق کی تاریخ ولادت ۱۲۰۴ھ ہے اور ظفر کی ۱۱۸۹ھ۔ اس طرح دونوں کی عمر میں پوری ایک جوانی کا فرق نکلتا ہے۔

ایک لطیفہ اور اسی قسم کا آبحیات میں ملتا ہے۔ مولانا آزاد نے نواب الٰہی بخش خاں معروف کو بھی ذوق سے مشرف بہ تلمذ کرایا ہے۔ اس کی تردید بعد میں نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں اور نواب احمد سعید خاں صاحب طالب نے خود مولانا آزاد سے بحث و تمحیص کے بعد بہ براہین قاطع کر دی تھی۔ دخمخانۂ جاوید تذکرہ "گلِ رعنا" میں اس واقعے کے متعلق تحریر ہے کہ "آزاد نے جس طرح ظفر مرحوم کی کاوش دماغ پر پانی پھیرا ہے ان کے نتائج فکر کو بھی اپنے استاد ذوق کے دامن بکمال سے وابستہ کیا ہے۔ باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی اور ذوق مشکل سے اٹھارہ برس کے ہوں گے مگر جوشِ عقیدت میں اس کا خیال نہ رہا"۔

ایک اور نکتہ ظفر کی برات میں مولوی امیر احمد صاحب علوی نے آزاد کے بیانات میں سے تلاش کیا ہے۔ مولانا آزاد ہی کے الفاظ میں "ظفر کے باقی تین دیوانوں کے علاوہ پہلا دیوان بھی نصف سے زیادہ ذوق کا ہے"۔ اور انہی کے بیان کے مطابق ظفر کا ذوق سے تلمذ اُس وقت شروع ہوا جب سندھ اور کابل وغیرہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدنامے ہوئے اور میر کاظم حسین بیقرار جان الفنسٹن کے ساتھ سرحدی ممالک کی طرف روانہ ہوئے یعنی ۱۸۰۹ء یا ۱۲۲۳ھ

سے ذوقؔ نے ظفرؔ کو اصلاح دینی شروع کی لیکن ظفرؔ کا دیوان اوّل ۱۲۲۳ھ میں مکمل ہی نہیں بلکہ مرتب بھی ہو چکا تھا اور قطعۂ تاریخی کی صورت میں "ہاتف غیبی" کی شہادت آج بھی اُس کی ردیف یا میں موجود ہے اس طرح مولٰینا آزاد کے بیانات خود ایک دوسرے کی چغلی کھا جاتے ہیں۔

اب ذرا ظفرؔ کے اُس کلام کی طرف نظر کیجیے جو انھوں نے استاد ذوقؔ کی وفات کے بعد کہا۔ وہ قطعات تاریخ جو ظفرؔ نے ذوقؔ کے انتقال پر لکھے۔ کہہ لیجیے کہ "ہاتف غیبی" کے فرمودات ہو گئے مگر وہ تمام ذخیرۂ کلام جس کا سلسلہ ظفرؔ کے آخری سانس تک جاری رہا آخر کہاں سے پیدا ہو گیا تھا۔ فی الحقیقت قیام رنگون کا کلام ظفرؔ کی شاعری کا معراج ہے اور یہ عین فطرت ہے۔ غم و اندوہ کی انتہا ہو چکی تھی۔ سینکڑوں داغ دل پر لگ چکے تھے۔ کیسی کیسی مصیبتیں تھیں جن سے غریب بادشاہ کو دوچار ہونا پڑا، خیال کرنے سے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔ ایسی صورت میں جو لفظ اُس کے دکھے ہوئے دل سے نکلا شعر تھا ؎

ظفرؔ شعر و سخن سے راز دل کیونکر نہ ہو ظاہر
کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

افسوس کہ غدر کے بعد کا کلام بہت کم دستبرد زمانہ سے محفوظ رہا بنا سے وطن نے ایسی بے رخی غریب ظفرؔ سے برتی کہ اس کے ان جگر پاروں کی طرف بھی اعتنا نہ کیا جو کسی کی زبان پر رہ گیا وہ رہ گیا۔ باقی دست فنا نذر میں محفوظ ہوا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سرکار دولت مدار نے ظفرؔ کی تمام تحریروں کو حفاظت خاص میں لے لیا تھا غدر کا ہنگامہ تازہ تازہ ہو چکا تھا اور اس کا داغ درد مندوں کے دل میں ہرا تھا۔ یاد وہ "حرف غلط" روشن رہتا جسے حکومت دلوں سے یکقلم محو کر دینا چاہتی تھی۔

اُڑتا ہوا سا یہ سنا تھا کہ جسٹس سید محمود صاحب مرحوم کو ایک مرتبہ کسی انگریز سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کے پاس ظفرؔ کا کلام قیام رنگون کا لکھا ہوا موجود تھا۔ غالباً وہ شخص اُسے اپنی حفاظت میں ولایت لے جا رہا تھا۔ مرحوم نے اُسے ایک نظر دیکھا اور بہت کچھ زبانی یاد ہو گیا۔ اس واقعہ کے متعلق ڈاکٹر سر راس مسعود الطاف کا بیان ہے کہ "میرے والد کو بہادر شاہ مرحوم کا وہ تمام کلام خود یاد تھا جو انھوں نے رنگون کے زمانۂ قیام میں کہا تھا۔ وجہ اُس کی یہ تھی کہ میرے والد کو اُن مصائب کے ساتھ بےحد ہمدردی تھی جو مغلوں کے آخری بادشاہ کو اٹھانا پڑیں"۔

ظاہر ہے کہ سید محمود صاحب مرحوم کے لیے وہ تمام کلام اولیغ نہ ہوگا۔ اور ظفرؔ نے رنگون میں بھی ایسے شعر کہے ہیں کہ صاحب ذوق انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کرے اُن کے ذریعے اس المناک افسانہ کو ہمیشہ ہرا اور اپنی ہمدردیوں کو زندہ رکھے ؎

یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو
مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سنو

مگر افسوس اب اس فسانۂ غم کے صرف چند اقتباسات باقی رہ گئے ہیں۔ کاش سید صاحب مرحوم اس مجموعے کو طبع کرا دیتے۔

اسے ادب نوازی کا عہد کہیے یا محض دستور، بہر حال یہ ایک قاعدہ ہو گیا تھا کہ بادشاہ کا کوئی استاد ضرور موجود ہو۔ اور استاد شہ ایک عہدہ بن کر رہ گیا تھا جس طرح ایک بیدار مغز اور عقل مند کاربادشاہ کی سرکار میں بھی امور سلطنت کی مشاورت کے واسطے "مشیر کار" کا عہدہ موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح بہادر شاہ کے یہاں بھی اس نوعیت و کہنہ مشقی کے باوجود استاد کی جگہ خالی تھی چنانچہ ذوقؔ کی وفات سے اختتام حکومت تک ظفرؔ نے مرزا غالبؔ سے بھی سلسلۂ تلمذ رکھا ہے لیکن کسی ایک شعر میں بھی غالبؔ کا رنگ دیکھنے میں نہیں آتا۔ وہی یک رنگی، وہی یکسانیت ظفرؔ کے تمام دیوانوں میں پائی جاتی ہے جس کا تسلسل کہیں قطع نہیں ہوتا بالفاظ مولانا حالی "ظفرؔ کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اوّل سے آخر تک یکساں ہے"۔ ممکن ہے حضرت غالبؔ بھی برائے نام استاد ہوں مگر آزاد نے انہیں کسی جگہ اس صفت سے متصف نہیں کیا "طبقات شعرائے ہند" تالیف منشی کریم الدین صاحب بہت معتبر تذکروں میں شمار ہوتی ہے اور منشی صاحب بہت بے لاگ لکھنے والوں میں ہیں۔ اور ذوقؔ کے ہمعصر و ہمسکن۔ ذوقؔ کی بابت اس تذکرے میں بالصراحت لکھا ہے کہ "فن شعر میں ابتدا سے عمر سے مصروف ہیں مگر حالت صبا سے آج تک بہ عادت طبیعت

[illegible] کسی کو نہیں دیتے۔ بادشاہ کے استاد ہیں۔ اصلاحِ شعر کی بادشاہ کو دیتے ہیں۔" برخلاف اس کے مولانا آزاد پھر آئے بڑھ گئے کے سامنے ذوق کو یہ کہتے سناتے ہیں کہ بادشاہ کے لئے غزل لکھ رہا ہوں اور فلاں غزل اپنی بادشاہ کو دے دی کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ حقیقت منشی کریم الدین صاحب کے علم میں نہ ہوتی جبکہ الفاظ میں لکھتے ہیں کہ تمام عمر ایک شعر کسی کو عنایت نہیں کیا۔ اس بات کی وضاحت کچھ ضروری نہیں تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ ذوق اس معاملے میں خاص طور پر بہت وضعدار واقع ہوئے تھے۔ یہ خاصیت ان کی طبیعت کا ظفر سے کیونکر پوشیدہ رہ سکتا تھا جو بقول منشی احمد حسین سحر ان کے "مخصوصان میں سے تھے۔ اس پر بھی وہ ان سے غزلیں طلب کرتے تو یہ بڑی بے حمیتی کی بات ہوتی جو قرینِ قیاس نہیں۔

آبحیات کے علاوہ ظفر کے عہد یا مابعد کے اور کسی تذکرے میں ان کے متعلق اس بدگمانی کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ تذکرہ "صبحِ گلشن" مؤلفہ ابوالنصر سید علی حسن خاں صاحب ۱۲۹۵ھ میں مرتب ہوا تھا۔ گویا ظفر کے انتقال سے (۱۶) انیس سال بعد۔ اس میں ظفر کے متعلق تحریر ہے کہ:

"ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ خلف اکبر رشید سلطان جہاں محمد اکبر شاہ بادشاہ دہلی در ریختہ دستے بلند داشت و در سخن پایہ ارجمند۔ گفتارش اگرچہ سادہ و پرکار است۔ اما ہمہ اش خاطر شکار است۔ محاورہ گوئی از آن اوست و معاملہ بندی زیر فرمان او۔ سخن گوئی از شاہ نصیر و ذوق آموختہ و کسب آتش از غالب مشق ایں فن کردہ و در فتنۂ غدر تو دستگی در ۱۲۷۹ھ بخوابگاہ عدم برآسود۔ چہار دیوان از نتائج فکر بلند اوست۔"

کہیں کوئی اشارہ ساری عبارت میں اس بات کا نہیں کہ استادوں سے غزلیں چھین لیا کرتے تھے بلکہ "فکر بلند" "سادہ و پرکاری" اور "معاملہ گوئی" ہی کا مذکور ہے اور سخن میں پایہ ارجمند قرار دیا ہے۔

مرزا قادر بخش کا تذکرہ "گلستانِ سخن" بھی ظفر کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ کا مطبوعہ ہے گو مرزا قادر بخش [illegible] ذوق [illegible] ہم حال ان کی رائے میں بھی ظفر کا کلام پڑھنے تو "نفس شگفتگی الفاظ سے نسیم چمن اور نگاہ تازگی رقم سے رشتۂ یاسمن بن جاتی ہے۔" اشعار شعری شعار سے بھی کچھ انتخاب پیش کیا ہے کہ ارباب نظر اس سے لذت اور اہل دل اس سے معرفت حاصل کریں۔ مگر انتخاب کچھ سلیقہ کا نہیں۔

مولوی عبد الغفور خاں نساخ کا تذکرہ "سخن شعرا" البتہ معتبر کتاب ہے۔ انھوں نے بھی ظفر کے کلام پر کسی شبہ کا اظہار نہیں کیا اس تذکرے میں ہر شاعر پر بہت مختصر الفاظ میں رائے زنی کی گئی ہے اور ظفر کے متعلق لکھا ہے کہ "اکثر خطوط کو اچھی طرح لکھتے تھے اور شعر نہایت شیریں و نمکیں کہتے تھے"۔ انتخاب بھی خاصہ پیش کیا ہے۔

اسی طرح نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرے "گلشن بیخار" ۱۲۵۰ھ میں لکھتے ہیں کہ:

"ایں فن بسیار مادوست۔ شیخ ابراہیم ذوق از مائدہ نعمتش زلّہ ربا و وظیفہ خوار است و افکار ایشاں بنگاہ اصلاح در سلک مواز[illegible]۔"

ان کے علاوہ مولوی امیر احمد صاحب علوی نے بھی اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر" میں اقتباسات مختلف کتابوں سے فراہم کئے ہیں۔ مثلاً منشی احمد حسین سحر اپنے تذکرہ "بہارِ بے خزاں" میں لکھتے ہیں کہ "ظفر تخلص مرزا ابوظفر بادشاہ دہلی بلبلِ شعر بہ لطف دستا بستے تمام دارد۔ ابراہیم ذوق از مخصوصان حضرت اوست و افکار ایشاں باصلاح او چوں گوہر آبدار اند۔"

طبقاتِ شعرائے ہند میں (مطبوعہ ۱۸۴۸ء) ظفر کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ شعرا ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کوئی نہیں کہتا تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا کہ تخت نشین ہوئے۔ ابتدا میں ولیعہد تھے۔ ان ایام میں بھی ان کے شعر بہت اچھے ہوتے تھے۔ تمام ہندوستان میں اکثر قوال اور رنڈیاں ان کی غزلیں، گیت، ٹھمریاں گاتے ہیں ہر ایک قسم کے شعر ہیں۔"

ان گیت اور ٹھمریوں کے متعلق آزاد کا خیال ہے کہ سینکڑوں ہی کہیں سب کی سب بادشاہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ لکھا ہے ایک ٹھمری بھی ذوق نے بادشاہ کی نظر سے بچا کر اپنے نام کی نہ چھوڑی

الغرض ان تسلیمات سے قطع نظر کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ظفر کا تمام سرمایۂ سخن ان کا اپنا نہیں متاعِ بُردہ ہے۔ ہاں اس میں کلام نہیں کہ ظفر کی شاعری کو ذوق کی اصلاح سے بہت فائدہ ہوا اور دیوانوں کی موجودہ شکل ان کے ردّ و بدل، اور اصلاح کے بعد پیدا ہوئی ہوگی تو اصلاح کی گنجائش ہر جگہ رہتی ہے۔ کوئی چیز دنیا میں اکمل نہیں قرار دی جا سکتی۔ ایک آدھ شعر بھی کچھ غزلوں میں اصلاح کے ساتھ اپنی طرف سے دے دیا ہو تو تعجب نہیں کہ کہیں کہیں ذوق کا مخصوص رنگ جھلک بھی جاتا ہے۔

مولینا آزاد مرحوم کے احسانات جو اردو ادب پر ہیں۔ ہمارے سر آنکھوں پر اردو ہمیشہ ان کی زیر بار رہے گی مگر غریب ظفر پر مولینا جو ظلم ذوق کے وفورِ عقیدت میں کر گئے ہیں۔ سراہا نہیں جا سکتا۔ یہ ایک نکتہ ہے کہ مولینا آزاد کے محتاط قلم نے کہیں ایک لفظ ایسا نہیں لکھا کہ انہیں کوئی ارادت بہادر شاہ سے تھی۔ اس کار خانے کے اجڑ جانے کا کوئی ملال انھوں نے اپنی تحریر سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ برخلاف اس کے ظفر کا نام جہاں لیا ہے نہایت روکھے پن سے لیا ہے شاید ان کے نزدیک یہ مقتضائے وقت ہو۔

(باقی آئندہ)

رباعی

انوارِ ازل بادۂ سرجوش بہم ریخت

اسرارِ ابد سینہ بہ سینہ بہ سخن ریخت

ہر پیالہ عشق حقیقت خبر دار ہمی

میخانۂ [illegible]

از

جناب منشی محمد عطاء اللہ صاحب عطا (دہلوی)

نذرِ بتانِ حرم

حضرت علامہ عیش فیروزپوری

کب غیر اُسے میں نے سمجھا کب اُس نے مجھے اپنا جانا
میں نے تو اُسے پہچان لیا، اُس بت نے مجھے کب پہچانا

اک دن ہے لب کوثر جانا کام آئیگا میرا سمجھانا
چل محفلِ ساقی میں واعظ آ جائیگا ساغر چھلکانا

گر عشق نیازِ مجسم ہے، تو حسن بھی نازِ مجسم ہے
اُس نے نہ مجھے بندہ سمجھا گو میں نے اس کو خدا مانا

وہ اشک بداماں جب آئے تربت پہ تو دل چلّا اٹھا
اب آپ نے غیر کو کیا سمجھا، اب آپ نے مجھکو کیا جانا

ٹھکرایا ہوا ہر در کا تھا ٹھکرایا ہوا قسمت کا تھا
ٹھکرا گیا دنیا سے مجھکو تیرا مرے دل کو ٹھکرانا

کیوں رشتۂ الفت توڑ دیا دیرینہ تعلق چھوڑ دیا
کیوں ترک کیا ملنا مجھ سے کیوں چھوڑ دیا آنا جانا

بندھ جائے نہ صبر اسیرِ قفس کا ہے اٹھتی جوانی کا عالم
ہر دل کو ہمارے دل کی طرح گیسو میں نہ اب تم الجھانا

تو دشمنِ اہلِ وفا بھی ہے بےمہر بھی ہے بیدرد بھی ہے
در اصل اجل کی آمد تھی تجھ پر مرے دل کا آ جانا،

اب آرزوئے کوئے جاناں، اس مرحلہ پر تو لے آئی
دل کا کبھی مجھکو سمجھانا، میرا کبھی دل کو سمجھانا

تو اٹھ کے ہمارے پہلو سے جا بیٹھا عدو کے پہلو میں
شاید کہ پسند آیا تمکو دنیا سے ہمارا اُٹھ جانا

یہ جذبۂ شوقِ پابوسی شاید کہ اثر دکھلا جائے
میں دل کو یہی سمجھاتا ہوں خاکِ رہِ جاناں ہو جانا

اُس محفل سے مل بیٹھنے کی کیا غیب سے راہ نکل آئی
قسمت کا مری یوں لڑ جانا ملتے ہی نظر دل مل جانا

میں حسن کے راز سے واقف ہوں [illegible] عشق و محبت ہوں
آیا ہی نہیں پھر دل کو "آنے سے بتوں پر" باز آنا

انجام مرے افسانے کا آغاز نئی روداد کا ہے
کھو دیگا زمانے سے مجکو پا کر اسے دل کا کھو جانا

افسانہ کسی نے کھولا ہر راز مرے افسانے کا!
یوں اُس کا سرِ بام آ جانا اس طرح مرا غش کر جانا

اچھی طرح مجکو سمجھا کر ناصح کی سمجھ میں یہ آیا
آشفتہ نظر کو سمجھانا، پتھر سے ہے سر کو ٹکرانا

[illegible] بیٹھنے والے کو [illegible] دیر و حرم سے کیا مطلب
ہر ایک جگہ اے عیش حزیں اچھا نہیں پاؤں پھیلانا

زمرد کا چشمہ

(از جناب مولانا حکیم عارف صاحب بلگرامی)

ظہیر دہلی کا معمولی چشمہ فروش تھا۔ اس کے ایسے وہاں نہ معلوم کتنے دوکاندار ہونگے مگر باپ کے ترکہ میں اُس نے زمرد کا ایک ایسا بیش بہا چشمہ پایا تھا جس کی نظیر شاہان مغلیہ کے خزانہ میں بھی مشکل سے ملتی۔ "چاندنی چوک زمرد کا چشمہ بیچنے کے لئے مناسب جگہ نہیں ہے" مہینوں کوشش کرنے کے بعد اُس نے یہی فیصلہ کیا اور جن جن صورتوں سے ممکن ہوا زادِ راہ کے لئے بہت سا روپیہ جمع کر کے رختِ سفر باندھا۔ بمبئی پہونچ کر اُس نے وہاں کے ممتاز جوہری سیٹھ موتی چند کو چشمہ دکھایا۔ جوہری اُسے دیکھتے ہی عش عش کر گیا اور کئی سوالات کے بعد اُس نے کہا "چیز نایاب ہے مگر اس کے خریدار تو یورپ کے دولتمند ہی ہو سکتے ہیں"

ظہیر نے خشک جواب پا کر دل میں کہا: "خیر تھوڑی سی زیر باری ہوئی لیکن صحیح رائے تو مل گئی"۔

چوتھے روز ولایتی ڈاک کا جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ اس نے ایک روز قبل ہی ٹکٹ خرید لیا اور روانگی کے دن صحن جہاز سے اُس زینہ کی جانب چلتے ہوئے جدھر سے سیلون کو راستہ جاتا اُسے دہلی کے اسٹیشن ماسٹر مسٹر ملبرٹ دکھائی دیئے ان سے کئی سال کی دوستی تھی دونوں مل کر خوش ہوئے اور معمولی گفتگو کے بعد مسٹر ملبرٹ نے کہا۔ "غالباً آپ کا یہ پہلا بحری سفر ہوگا؟" اور جب ظہیر نے اعتراف کیا تو کہنے لگے:- "آیئے جہاز کے مختلف حصے دیکھتے جائیں" وہ ظہیر کو پہلے تابناک کشتی کے کمرے میں لے لئے پھرا انجن گودام میں وہاں سے اس مقام پر جہاں ملاح وغیرہ رہتے ہیں اُس کے بعد کھیل کے مختصر میدان سے گذرے جیسے ہی صحن جہاز کی سیڑھی پر دم لیا جہاز کی روانگی کا وقت ہو گیا اور جہاز کی پرشور آوازوں کے ساتھ وہ ساحل بمبئی سے روانہ ہو گیا:

ظہیر پورٹ سعید تک اپنے رفیقِ راہ سے واقف اندوز ہو چکے علاوہ اکثر مفید معلومات بھی حاصل کرتا رہا دونوں کی منزلیں مختلف تھیں ملبرٹ لندن براہ راست گئے اور ظہیر مسافت طے کرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچا۔ اس نے کئی روز کے قیام میں وہاں کے خاص لوگوں کو چشمہ دکھایا اور جب دیکھا کہ کامیابی امید نہیں تو وہ آسٹریا جا پہنچا وہاں بھی ناکامیاب رہا اُس کے بعد برلن گیا اُسے یقین تھا کہ جرمن دولتمند اس کا چشمہ ضرور خرید لیں گے مگر یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوا کہ لوگ غیر معمولی طور پر فوجی کاموں میں منہمک ہیں وہ سب جنگ عظیم کی تیاریاں تھیں جو اس وقت تک سینوں میں تھیں اس لئے ایسی اہم اور ولولہ انگیز حالت میں چشمے کی خرید و فروخت کون کرتا۔ بیچارہ وہاں سے بھی ناکام چل کر کے الپس کی عظیم الشان سرنگوں کو طے کرتا ہوا اٹلی اسوار سیلز ہوتا ہوا فرانس پہنچ گیا اُس سلسلے میں کہہ دو گو اس وقت تک میں بہت وقت اٹھا چکا ہوں مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ میرا مال نایاب ہے اور پیرس کے شوقین غیر معمولی طور پر دولتمند ہیں اس لئے ممکن ہے کہ خرید لیں اور میری تمام کلفتیں مسرت سے بدل جائیں۔ دو ہفتوں پیرس کے کوچہ و بازار میں سرگرداں رہا، اُس کا وہاں کے آسمان بوس محلوں کے گرد طواف کرنا امراء سے خصوصاً پریسیڈنٹ کی خدمت میں باریاب ہونا سب بے سود ہوا تاہم وہ ہمت نہ ہارا، وہاں سے چل کر شہنشاہ برطانیہ کی خدمت میں بڑی کوششوں کے بعد حاضر ہو سکا اُس نے چشمہ دکھایا۔

شہنشاہ نے دیکھتے ہی حیرت زدہ ہو کر دل میں کہا۔ "بلا کسی معدن ہے جس سے اتنے بڑے [illegible] رنگ [illegible] بلا شبہ دستیاب ہو گئے کہ چشمے [illegible] بن سکے [illegible] ہندوستانی [illegible] دیکھے ہیں مگر [illegible]

... ہوں گے؟"

شہنشاہ نے ظہیر سے مخاطب ہو کر دریافت کیا۔ "یہ چشمہ کہاں سے حاصل کیا؟"

"حضور والا! یہ شاہان اودھ کے خزانہ میں تھا۔ حضور انعام میرے والد کو ملا تھا اور ان کی وفات کے بعد میرے قبضہ میں آگیا۔"

"اچھا اس کی قیمت؟"

"جناب عالی! یوں تو یہ ایک نادر چیز ہے جو کسی قیمت پر بھی بازار میں دستیاب نہیں ہو سکتی مگر میں نے ہندوستان سے لندن تک طویل سفر محض اس خیال سے اختیار کیا کہ حضور کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کروں اور جو کچھ حضور والا تجویز فرمائیں بخوشی قبول کروں اور اب چونکہ سرکار عالی نے مجھی سے قیمت دریافت کی ہے اس لئے ایک لاکھ پاؤنڈ چاہتا ہوں۔"

"اچھا کل تک جواب کا انتظار کرو۔"

دوسرے روز صبح کے اخبار میں ظہیر کی لندن میں آمد اس کی بادیابی اور اس کے زمردیں چشمے کا جوہریوں کو دکھایا جانا تفصیل سے درج تھا۔

ظہیر نے اس خبر کو توجہ سے پڑھتے پڑھتے آخر میں جب یہ دیکھا کہ جوہریوں نے پندرہ ہزار پاونڈ اس کی قیمت کا اندازہ کیا ہے تو وہ بہت ہی مغموم ہوا۔ اس نے بیش بہا زمردیں چشمے کے علاوہ غیر معمولی مصارف اور صعوبات سفر برداشت کرتے ہوئے دل میں کہا۔ "میں تو پندرہ ہزار میں ہرگز فروخت نہ کروں گا۔ اس کی وجہ سے میرا جیتا ہوا کاروبار برباد ہوا اور مکان مسکن کا کل اثاثہ صرف ہو گیا۔ بہالا گھر بھی ہتھیا کر نالی اور پھر بھی کامیاب نہ ہوا۔ اب میں ہندوستان جا کر دوستوں کو کیا منہ دکھاؤں گا، خالفوں کے طعنے اور دشمنوں کے حملے برداشت سے باہر ہوں گے۔ لوگ مجھے بیوقوف کہیں گے، میری مفلسی، بیکاری اور حماقت آمیز ارادوں پر مضحکہ اڑائیں گے۔ ایسی صورت میں منہ لپیٹنے سے بہتر ہے۔" ظہیر انہیں خیالات میں محو تھا۔ کہ شاہی ملازم نے ہوٹل میں پہنچ کر پرائیویٹ سکریٹری کی چٹھی اور چشمہ [illegible] کہ پندرہ ہزار پاؤنڈ میں چشمہ فروخت کرنا [illegible]۔"

ظہیر لندن سے جبرالٹر اور مالٹا ہوتا ہوا براعظم افریقہ کے ایک مشہور ساحل پر پہنچا۔ اس نے وہاں کے فلک بوس مینارے اور طرز قدیم کی عمارتیں دیکھ کر معلوم کیا کہ یہی اسکندریہ ہے۔ اُسے سینما اور تھیٹروں کے وہ تماشے یاد آگئے جن میں اسکندریہ کے خوشنما مناظر دیکھ کر اُسے اسکندریہ دیکھنے کا بڑا شوق پیدا ہوا تھا۔ وہ دل میں کہنے لگا۔ "آخر منزا توجہ ہی اسکندریہ کیوں نہ دیکھ لوں۔" اُس نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور کئی روز وہاں کے آثار قدیمہ، عجائب خانہ اور پرانی درس گاہوں کے نقش و نگار دیکھے۔ سہ پہر کے وقت وہاں کے بڑے پارک میں گیا۔ اُس وقت ڈوبتے ہوئے آفتاب اور پھیلی ہوئی شفق نے وہاں کی ہر چیز کو رنگین بنا دیا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا خوبصورت قلعے کے قریب پہنچا۔ سامنے دریائے نیل پرکیف انداز سے رواں تھا۔ اس کی رفتار کی دھیمی آواز میں شاید سکندر اعظم اور دوسرے مشاہیر کی عبرتناک کہانیاں تھیں۔ دوسری طرف دیکھا تو یورپ اور ایشیا کے سیاح اور مقامی شوقین سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں میں سے ایک شخص نے ظہیر کے قریب ہو کر سوال کیا۔

"کیا آپ ہندوستانی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"اور آپ؟"

"میں بھی ہندوستانی ہی ہوں۔"

دونوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا، وطن کی محبت اور بچھڑے ہوئے عزیز و اقارب کی یاد نے جتنا دلوں کو غمگین کر دیا تھا اُس اتفاقیہ ملاقات نے اُس کی بہت کچھ تلافی کر دی، نو وارد نے وطن کا پتہ اور نام موتی چند بتایا، کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کیں بعد ظہیر کو کوٹھی پر چلنے کے لئے مجبور کیا، دونوں موٹر میں بیٹھے وہ کئی طویل سڑکیں طے کرتا ہوا ظہیر کو مکان لے گیا اور اندر پہنچتے ہی کہا۔

"اچھا جناب بے تکلف فرمائیں آپ اس وقت کیا کھائیں گے۔ مجھے کھانے کی تکلیف نہ کیجئے اس کے لئے ہوٹل کافی ہے۔"

"نہیں جناب! یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ تا قیام اسکندریہ یہیں کھائیں گے۔ یہیں رہیں گے اور اسی کوٹھی سے رخصت ہوں گے۔"

گذارش

ہاشمی بکڈپو ہندوستان میں اُردو کا سب سے بڑا کتبخانہ ہے جہاں مشہور مصنفین کی تمام بلند پایہ تصانیف وتراجم کی سب کتابیں ہروقت موجود رہتی ہیں۔ تاریخ وتنقید ادب، مقالات و انشاء، مکاتیب، ناول، افسانہ، ڈرامے، نظم، ظرافت، اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، فلسفہ، منطق، نفسیات، طبیعات، اخلاقیات، کیمیا، حفظان صحت، علم نوعی اور زراعت پر شاید ہی کوئی کتاب ہو جو موجود نہ ہو۔ علاوہ ازیں ہاشمی بکڈپو نے مشہور مصنفین مثلاً پطرس ایم۔ اے سید امتیاز علی تاج بی۔ اے حکیم احمد شجاع بی۔ اے، ڈاکٹر تاثیر ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (کینٹب) مشہور کانگرسی لیڈر ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی، پروفیسر عابد علی عابد ایم۔ اے۔ محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ۔ ڈاکٹر رشید جہاں مصنف "انگارے" ن۔ م۔ راشد ایم۔ اے سے متعدد مضامین پر نہایت اعلیٰ اور شاندار کتابیں لکھوا کر شایع کی ہیں۔ جو حضرات علم وادب کا ذوق رکھتے ہیں اور اردو زبان وادب کی خدمت اور ادبی اداروں اور ناشروں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں وہ ہاشمی بکڈپو کی سرپرستی قبول فرمائیں، یہ اردو زبان وادب کی بہت بڑی خدمت متصور ہوگی،

نیازمند۔ جنرل منیجر ہاشمی بکڈپو۔ لاہور

تاریخ سیاست سوانح عمری

مصطفےٰ کمال پاشا ترک ... 2/-
فدایان اسلام کی مکمل داستان ... 1/-
عربوں کا تمدن ... 2/-
جاپان ... 1/8/-
چینی مسلمان ... 1/8/-

ادب و تنقید

غالب ... از غلام رسول مہر ... 3/-
غالب نامہ ... اکرام آئی سی ایس ... 3/-
اردو میں ڈرامہ نگاری ... 2/-
اردو کا پہلا ناول نگار ... 1/-

قصہ جات اردو

داستان امیر حمزہ ... 1/8/-
نوشیرواں نامہ ... 3/8/-
ہومان نامہ ... 3/8/-
طلسم ہوشربا حصہ اول ... 3/8/-
صندلی نامہ ... 3/-
الف لیلہ مکمل ... 1/8/-
سوانح عمر عیار ... 1/6/-
رامائن مکمل ... -/8/-
بوستان خیال جلد اول ... 4/-
فسانہ دلپذیر ... -/9/-
فسانہ عجائب ... -/8/-
[illegible] ... 3/4/-
[illegible] ... -/8/-
[illegible] ... -/4/-

نوعی اور صنفی کتابیں

دلہن کی ڈائری ... 1/4/-
دلہنوں کی کانفرنس ... 1/-
لذت النسا ... 1/-
سہاگ رتی (دلہن کی پہلی رات) ... -/8/-
شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ... -/8/-
سہاگ کا سکھ ... -/8/-
امراض مخصوص زناں ... 2/-
بہار شباب ... 1/-
مجربات بوعلی سینا با تصویر ... 1/8/-
بازاری محبوبہ حصہ اول -/1 حصہ دوم 1/-
کیف مواصلت ... 1/-
دوشیزہ کی بہار ... -/12/-
شاہی کوک شاستر ... 1/8/-
افشائے راز پنہاں ... 1/4/-
دوشیزہ ... 3/8/-
صنف نازک ... 6/8/-

لغات اردو

کریم اللغات ... -/9/-
لغات کشوری ... 3/-
لغات فیروزی ... 2/8/-
فیروز اللغات دو جلد ... 8/-
نور اللغات چار جلد ... 30/-
جدید لغات اردو ... 3/-
سعیدی ڈکشنری ... 4/-

کتب نظم اردو

بانگ درا (اقبال) ... 3/8/-
بال جبریل " ... 3/-
ضرب کلیم " ... 2/-
شعلۂ طور (جگر مرادآبادی) ... 2/8/-
شعلہ و شبنم (جوش) ... 3/-
نقش و نگار " ... 2/-
فکر و نشاط " ... 1/-
کلیات اکبر الہ آبادی تین جلد ... 4/8/-
دیوان رسوا ... -/6/-
دیوان میر درد ... -/6/-
دیوان حالی ... -/8/-
دیوان غالب ... -/8/-
دیوان ذوق ... -/8/-
باقیات فانی ... 1/8/-
نغمہ زار (حفیظ جالندھری) ... 1/4/-
سوز و ساز " ... 2/-
مثنوی زہر عشق ... -/8/-
قصائد مومن ... -/12/-
کلیات میر تقی ... 1/8/-
دیوان داغ ... 1/4/-
کلیات آتش ... 1/4/-
بہارستان (مولانا ظفر علی خان) ... 4/-
آیات وجدانی (مرزا یاس یگانہ) ... 1/8/-
بادہ مشرق (ساغر نظامی) ... 5/-
جواہر کلیات نظیر ... 1/8/-

ہمارے یہاں ہر قسم کی عمدہ - سستی - دلچسپ اور کارآمد کتابیں مل سکتی ہیں

جنرل منیجر ہاشمی بکڈپو - لاہور

ہاشمی بکڈپو کی چند قابلِ مطالعہ مطبوعات!
طلسمات از پروفیسر سید عابد علی عابد ایم۔اے۔
جوانی کی تلخیوں اور رنگینیوں کے چند مرقعے ۔/1
عورت اور دیگر افسانے از ڈاکٹر رشید جہاں
عورت کی مظلومی کی دلگداز داستان ۔/1
مہدی از ایم۔ایم اسلم
سرزمین مصر کا زبردست تاریخی ناول پانچ جلدیں یکجا ۔/3
دو ڈرامے چیخوف کے دو مشہور مطائبات ۔/8/۔
کلیات طغرائی پنجاب کے مشہور شاعر حضرت فیروز الدین طغرائی کے کلام کا مجموعہ قیمت ۔/2
مجلس بزم سخن گورنمنٹ کالج لاہور میں جو مضامین پڑھے جاتے ہیں ان کا انتخاب قیمت ۔/8/1
گناہ کی راتیں از ایم۔ایم اسلم
انسان کی سیہ کاریوں کے دل ہلا دینے والے افسانے ۔/1
قلوپطرہ از سلمیٰ تصدق
سرزمین مصر کا زبردست تاریخی ناول۔ مصر کی ملکہ اور دنیا کی سب سے پر اسرار عورت قلوپطرہ نے اگر کسی کو چاہا ہوگا تو کیا ہوا ہوگا۔ کیسی کیسی خون کی ہولیاں کھیلی گئی ہونگی۔ ناول ہی ملاحظہ فرمائیں ۴۰۰ صفحات ولایتی کاغذ مجلد
داستان
اسکندریہ قدیم کی ایک کمسن عروس بازاری زرینہ اور مشہور صناع دیمیطریس کے عشق و محبت کی داستان۔ ابتدا سے اخیر تک مادی اور روحانی جذبات کی کشمکش! ۔/2
صنوبر کے سائے اور دوسرے رومان!
از جناب امتیاز علی صاحب ۔ اردو کی بہترین رومان نویس کی بہترین تصنیف، ایک نکہت جو آپ کے دل و دماغ پر رومان کی رعنائیاں مسلط کر دیگی۔ ایک نغمہ جو آپ کو آہوں کی سحر آلود سرزمین میں گم کر دے گا۔ قیمت ۔/1
زیر طبع کتب
ناگ رانی :- علامہ محمد الدین تاثیر ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی
لینن :- ڈاکٹر کے۔ایم۔اشرف۔ایم۔اے
حسن کی قیمت :- حکیم احمد شجاع بی۔اے
مرد کامل :- حکیم احمد شجاع بی۔اے
ہاشمی بکڈپو۔ لاہور

[illegible] ملاحظہ فرمائیے آپ کو ہر قسم کے ناول ہیں جس سے آپ اپنی پسند و مذاق کے ناول انتخاب کرکے ہم سے طلب کریں

دلچسپ ناول

ضرور ملاحظہ فرمائیے — [illegible] حیرت خیز

ناول	قیمت
[illegible]ین	-/12/-
[illegible]رقہ	-/10/-
[illegible]	-/12/-
[illegible]ن و مامون	-/12/-
[illegible]ق بن حریاد	-/12/-
شیطان کی خالہ	-/8/-
شیر کابل	1/4/-
پراسرار موت	1/8/-
خون کے پیاسے	1/-/-
زبیدہ بھوتوں کی قید میں	1/-
لٹیرے سمرقند	1/-
فرانس کی حسینہ	1/-
بھولا ہوا خواب	-/8/-
ڈاکوؤں کی ملکہ	1/-
جہازی ڈاکو	-/12/-
شہباز ڈاکو	-/8/-
شہباز کی بیٹی	-/12/-
نقاب پوش	-/12/-
[illegible]قند کی عیاریاں	-/8/-
[illegible]فیروز	-/8/-
[illegible] سردار	-/12/-
[illegible] کال	-/12/-
[illegible]	1/8/-
[illegible]	1/4/-
[illegible]	1/8/-
[illegible]	1/4/-
[illegible]	1/8/-

ناول	قیمت
ویرا	-/9/-
انقلاب فرانس	-/12/-
اسرار بالشوازم	1/-
طلسم سامری	1/6/-
ناظمہ کی آپ بیتی	2/8/-
میری ناتمام محبت	1/4/-
لاش اور دوسرے افسانے	1/8/-
محبت کے پھول	-/6/-
سید دفلپانا	2/-
مشرق کی حور	1/-
آرمینیا کا چاند	2/-
بہادر دلہن	1/8/-
ایران کی حسینہ	1/8/-
منزل مقصود	2/8/-
خوفناک قتل	1/10/-
نقاب پوش ڈاکو	-/8/-
خونی ملاح	-/6/-
خونی بھائی	1/4/-
خونی بھید	1/8/-
شریف چور	1/8/-
آلات کیمیا سیلکوں کرو	-/8/-
طلسمی انگوٹھی	1/8/-
کبھی کا ماز	-/8/-
عیاروں کا شہنشاہ	1/4/-
[illegible]مین	1/8/-
لیلیٰ یا محمود غزنالہ	2/-
[illegible]	1/8/-
[illegible]	2/-

ناول	قیمت
شرلک ہومز	2/8/-
مہر خموشی	2/-
آزادی	2/-
سنہری لاش	3/-
مقدس جوتا	2/-
کرنی کا پھل	2/8/-
خنجر بیداد	2/8/-
قاتل ہار	2/8/-
مصری جادوگر	2/8/-
شاہی خزانہ	2/-
ڈاکٹر نکولا	1/8/-
انمول ہیرا	1/-
انصاف	1/4/-
آتشی کتا	1/4/-
تاج عصمت	1/8/-
کملا بائی	1/-
لال قلعہ میں چوری	1/4/-
خوفناک سازش	-/12/-
کرنل کی بیٹی	1/2/-
ویرا اچوت	-/12/-
سراج الدولہ	2/8/-
جھانسی کی رانی	1/8/-
انارکسٹ	-/8/-
شاہی بٹ مار	-/12/-
کپال کنڈلا	-/8/-
سندر اندرا	-/12/-
گورو چیلے کی چوٹ	-/8/-
برق حسن	1/-

ناول	قیمت
طلسمی شیشہ	-/14/-
زہرا	-/14/-
مسعود و شکنتلا	-/12/-
طلسمی پنجہ	1/-
مصر کا چاند	2/-
انقلاب سمرنا	-/6/-
حور بغداد	-/6/-
قتل بے گناہ	-/8/-
بہرام کی سینہ زوریاں	-/8/-
شاہی جاسوس	-/8/-
اسیر محبت	-/10/-
شاہی قزاق	-/8/-
بیرحم بشرے	-/6/-
مہذب ڈاکو	-/5/-
خونی سکیم	-/10/-
جوش جوانی	-/12/-
باغی سپاہی	-/10/-
عیاروں کا عیار بہرام	-/10/-
نیلم کی چوری	-/10/-
مقدس جلاد	-/8/-
محمود درونا	-/12/-
ترکی فرشتے	-/12/-
طلسمی ہار	-/7/-
خونی شمشیر	1/8/-
حسین شہزادی	1/8/-
طوفانی زندگی [illegible]	2/8/-
موجودہ لندن کے اسرار	1/-
میدان [illegible]	2/8/-

[illegible] بکڈپو لاہور

ا ہوگیا، موتی چند نے کھڑے کہا
بلدی بتا یئے کیا پکایا جائے؟
یہ آپ نہیں مانتے تو سنئے۔
ں انگریزی کھانے کھاتے کھاتے عاجز آگیا ہوں اس لئے
سانی کھانا کھاؤنگا" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔
ر دقت نہ ہو تو کھچڑی پکوائیے"
"جناب دقت کیسی؟"
ں نے فوراً اپنے مصری خانساماں کو طلب کرکے حکم دیا:
یسوا راماکی مدد سے کھچڑی تیار کرو" ٹین میں ہندوستانی
ئی سے چٹنی اور کئی قسم کے اچار آئے تھے — جاؤ

ہر نے کئی روز مہمان رہ کر اپنے مفصل حالات بیان کئے
دد سے سن کر کہا۔ افسوس ناتجربہ کاری کے باعث آپ
ے دوسری ہندوستانی ہونے نے کامیابی سے بار رکھا
ر لندن جائیے۔ آپکا چشمہ وہاں کے مشہور جوہری جبریکو خرید لیگے
نار دیتا ہوں۔ ایک دستی خط بھی لیتے جائیے اور بالکل

ہانہ کرتا۔ ظہیر مجبوراً لندن جاکر جبریکو سے ملا۔ اُس نے چشمہ

یہ وہی چشمہ ہے جس کا اخبارات میں ذکر آیا تھا؟
ں جناب یہ وہی چشمہ ہے" اُس نے خط دیکھ کر کہا:
آپ موتی چند سے ملنے اسکندریہ چلے گئے تھے؟"
ن سے اسکندریہ میں ملاقات ہوگئی تھی"
خود اُنہوں نے کیوں نہیں خریدا؟
ہ کے لینے کی چیز تھی"
ہیں کہہ سکتا"
پ کل سہ پہر کو تکلیف کیجئے"
ے روز ظہیر ہوٹل سے مقررہ وقت پر پہنچا، جبریکو جیسے
اس نے دیکھتے ہی پچیس ہزار پاؤنڈ کا چک دیتے

ہوئے کہا "لیجئے یہ آپ کے دوست کی تجویز کے موافق پوری پوری
رقم حاضر کرتا ہوں"۔ ظہیر نے خوش ہوکر شکریہ کے ساتھ چک لے لیا

چشمہ فروخت ہوتے ہی ظہیر کے حواس درست ہوگئے آج
صبح تک وہ یا تو جان سے بیزار اور امید وبیم کی کشمکش میں تھا۔ اور
اب اُسے خیال ہوا کہ لندن کی سیر کرے اور جی بھر کے تفریح کرلے۔ اُس نے
سب سے پہلے سوٹ اتار کر پھینکا۔ ہاریک سوٹ پہن کر نیچے چولی کا دو آنچ والا
انگرکھا زیب تن کیا۔ پنڈلیوں سے چپٹا ہوا ایک پائجامہ پہنا سر پر
دوپلی ٹوپی رکھی اور نہایت نفیس کا مدار جوتہ پہن کر سیر کو نکل گیا۔ وہ ابھی
کچھ ہی دور گیا تھا کہ اسکول کے لونڈے اس کے گرد جمع ہوگئے، بازاری
قریب کھڑے ہنس رہے تھے اور مہذب سے مہذب لوگ بھی دور ہی
سے مسکراتے ہوئے نکل جاتے تھے وہ تماشہ دیکھنے نکلا تھا۔ اور جب
خود ہی تماشہ بن گیا تو اُسے سخت ناگوار ہوا، مگر اُس کی ناراضگی مجمع میں
کچھ اور اضافہ ہی کرتی رہی۔ خیریت گذری کہ معاً ایک سارجنٹ موقع
پر پہنچ گیا، اُس نے دونوں ہاتھ بلند کرکے کہا "یہ ولایت غیر کے رہنے
والے جب اپنے ملک میں جاکر تمہاری اس بے تمیزی کا ذکر کریں گے
اسوقت تمہارے ملک کی کتنی ذلت ہوگی؟" سارجنٹ کی تقریر سنتے ہی
لڑکے اور کل تماشائی ہنستے ہوئے چلدیئے۔ ظہیر نے سارجنٹ کا شکریہ
ادا کیا۔ وہ ایک طرف کو جا ہی رہا تھا کہ ایک لڑکے نے مؤدبانہ سلام کر
کے کہا: "معاف کیجئے گا۔ آپ کو مس جوانا سلام کہتی ہیں" "کون مس
جوانا؟" لڑکے نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: "وہ سامنے والی
کوٹھی میں ہے"
ظہیر نے مس کا نام سنتے ہی دل میں کہا لڑکے اور جوان تو مذاق
اڑا چکے مس جوانا کیوں رہ جائیں چلوں اُن سے بھی مل لوں۔ وہ اچھوتے
رہبر کے ساتھ قریب کی کوٹھی میں پہنچا وہاں ایک نوجوان دوشیزہ مہر
فرنگی کی تو رعنائیوں کے کمال کا مجسم نمونہ بنی ہوئی موجود تھی۔ سر پر اپنی
زلفوں کی بجائے ترشے ہوئے بال نیلگوں آنکھیں اور نگین لب و رخسار
ظہیر ایسے منچلے کو گرویدہ کر لینے کے لئے کافی تھے اُس نے چند قدم
بڑھ کر ظہیر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "معاف فرمائیے میں نے آپکو

[illegible] نشست کے کمرے میں لے گئی نام دلشان [illegible] کے بعد اُس نے کہا "قصور معاف کیا میں آپ سے [illegible] سنجیدہ درخواست کر سکتی ہوں" ظہیر نے مسکراتے ہوئے کہا "بڑے شوق سے کہئے میں بسروچشم حاضر ہوں" مس لمبی لمبی پلکوں کو جنبش دیتے ہوئے کہنے لگی "بات یہ ہے کہ مانس ہندوستانی وضع میں دیکھ کر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ آپ کی تصویر کھینچ لوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ میں بھاگوں اور آپ مجھے چھو لینے کی کوشش کریں۔ کہئے کچھ عذر تو نہیں؟"

"نہیں جناب مجھے کچھ عذر نہیں ہے" مس نے مزید شکریہ ادا کرتے ہوئے چند منٹ کی غیر حاضری کی معافی چاہی اور دلفریب انداز سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ظہیر اس عجیب فرمائش پر حیرت سے غور کرتا رہا مگر کچھ نہ سمجھ سکا۔ ایک لمحہ میں مس نئے لباس میں آئی اور اس نے ایک لعرفی ساڑی میں سو پاونڈ کا چیک پیش کرتے ہوئے کہا "لیجئے یہ آپ کی نذر ہے"

ظہیر اُس ملک کا رہنے والا تھا جہاں بڑے بڑے کام بلا معاوضہ نکال لینے کے لوگ عادی ہیں۔ اُس نے لینے سے انکار کیا۔

واہ جناب نذرانے کی کیا ضرورت ہے؟

مس نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "اگر آپ کو معاوضہ کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے بھی تکلیف دینے کی ضرورت نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے مس نے بڑھ کر ایک کرتہ ظہیر کے شانے پر رکھ دیا جس سے اس کی رگ رگ میں جیسے لذتوں کی بجلیاں تڑپنے لگی ہوں اور دوسرے ہاتھ سے چیک باریک انگرکھے کی جیب میں رکھ دیا پھر اُس کا بازو پکڑ کے کوٹھی کے لان تک لائی اور خود عجیب بانکپن سے ایک خوشنما پرندی کی طرح گویا اڑنے پر آمادہ ہو گئی آگے آگے مس اور پیچھے پیچھے ظہیر دوڑنے لگے۔ شروع میں کیسے انتہا نازک شوخ گیسو بکھار پھولا پھولا لباس سب کا ہلکا [illegible] پر نوٹے ناتمام کی نمائش اور تمام قدرتی [illegible] کہ ظہیر بیچارہ قدم افسردہ گرنے گرتے سنبھلتا [illegible] بھاگتا تھا اور پوری قوت سے چاہتا تھا کہ آگے [illegible] تیزی سے آگے ہو اور ہاتھ کر [illegible] میں ایک متحرک دائرہ بن گئی تھی۔ ظہیر کئی بار اُس کے قریب پہنچ گیا مگر اس نے ایسی جھکائی دی کہ گرفت میں آتے آتے قہقہہ مارتی ہوئی نکل گئی۔ اور یہ غریب دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

اس عرصہ میں ایک دائرے کے اندر دوڑتے دوڑتے ظہیر [illegible] نرکیبوں اور اس کی جھکائیوں سے واقف ہو گیا تھا مس کو اندیشہ [illegible] کے پہنچ گئی تو اس بار گرفت میں آجاؤنگی یہ محسوس کرتے ہی اس نے دوڑنے کا طریقہ بدلا اب وہ کبھی سیدھی دور تک دوڑتی کبھی مربع شکل میں دوڑنے لگی اور کبھی نیم دائرے میں بھاگتی تھی۔ ظہیر اس بے قاعدہ دوڑ میں پورب کی بجائے پچھم اور پچھم کی بجائے پورب کی سمت بے تحاشہ دوڑتا چلا جاتا تھا غرضیکہ یہ دلچسپ دوڑ مختلف شکلوں میں کامل دو گھنٹے تک ہوتی رہی اس کے بعد مس جوانا نے تھک کر یا بالقصد اپنی رفتار کم کر دی ظہیر کو موقع مل گیا۔ ایک بار اُس نے جھپٹ کر مس کا بازو تھاما اور دوڑ سے رکتے رکتے اُس پر گر پڑا، ساتھ ہی وہ بھی گری بہانتک دونوں ہنستے [illegible] اور لے احساں ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر پر لطف گفتگو رہی۔ مس جوانا نے [illegible] کچھ شکریہ ادا کرتے ہوئے دوبارہ ملاقات کی غرض [illegible] بلانے کے بجائے آٹھویں روز خود ہی ہوٹل میں آنے کا وعدہ کیا۔

ظہیر العیش ہوٹل میں مقیم تھا، وہاں کی چہل پہل اور راحت و آرام کے اسباب سب بدستور تھے مگر ظہیر اپنے دل میں عجیب طرح کی بے چینی محسوس کرتا تھا، مس جوانا کی محبت کا جادو اس پر ایسا چل گیا تھا کہ دلچسپ سے دلچسپ مناظر اور انتہا پرکیف مشغلے بھی اس کی نظر میں ہیچ تھے۔ مس جوانا کے انتظار میں اُسے دیوانوں کی طرح چھ دن گزارنے پڑے رات آتے ہی اس کی حالت ناقابل برداشت ہو گئی وہ دل ہی دل میں کہتا "دن تو گزر گئے اب آخری رات کیسے گزرے گی؟ اچھا [illegible] سے دل بہل جائے، وہ لفٹ پر پہنچا اور ہوٹل سے نکلتے ہی ایک ٹیکسی پر بیٹھ گیا ڈرائیور نے دریافت کیا "کدھر چلوں؟" ظہیر نے دل میں کہا "کہاں بتاؤں" پھر کچھ سوچ کر کہا "سامنے ہی چلو" اُس نے ڈرائیور سے اس طرح کہا جیسے کہیں کا ارادہ نہ ہو۔

موٹر کچھ ہی دور گیا تھا کہ چوراہے کے سامنے چند سفید لالٹین کا

سرخ شیشہ دکھا کر ادھر سے آنے والی سواریاں روکیں اور دوسری جانب کی پاس کر تا رہا، ظہیر کا موٹر بھی رک گیا تھا۔ اس نے داہنی جانب نظر کی تو اُسے ایک خوشنما سائن بورڈ نظر آیا جس کی عبارت برقی قمقموں نے بخوبی روشن کر دی تھی، اُس نے پڑھنا شروع کیا: "آداب عرض! کشف شام کو کہاں ملاقات ہوگی؟ "دی الگزنڈرا امپیریل پیلس میں" کیوں؟ عجیب ولولہ انگیز تماشہ ہو"

"کون سا تماشہ ہے؟"

"ایشیائی گلفام کی جد و جہد اور مغرب کا معشوقانہ گریز"

"واقعی خوب تماشہ ہوگا۔ بہتر ہے ضرور چلو نگا"

ظہیر نے اشتہار پڑھتے ہی ڈرائیور سے کہا "سنو! سنو! الگزنڈرا سنیما چلنا ہے" "اِین! الگزنڈرا... ... وہ تو اُدھر ہی رہ گیا" یہ کہتے ہوئے اُس نے موٹر کا رخ بدلا ظہیر کو وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تماشہ شروع ہونے کو ہے! اُس نے فوراً ٹکٹ لیا اور جیسے ہی اپنی جگہ پر بیٹھا اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ دل میں کہنے لگا۔

"بڑی خیریت ہے کہ اس وقت میں سوٹ میں ہوں" اُس نے فوراً جیب سے چشمہ نکال کر لگایا، رومال سے لب و دہان چھپائے اپنی ہیئت میں تبدیلی کی بہت کوشش کی، پھر بھی فرط انفعال سے پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ کیونکہ سامنے سکرین پر مس جوانا اس کی جیب میں جھک رکھ رہی تھی اور خود عجیب حالت میں نظر آ رہا تھا، اُس وقت یہ فیصلہ مشکل تھا کہ وہ متحیر زیادہ ہے یا منفعل بہرکیف وہ انہیں حالتوں میں تمام واقعات جو اُسی ہفتہ میں جوانا کے ساتھ گزرے تھے۔ دیکھتا رہا اور باوجود اٹھ کر چلے جانے کی کوشش کے تماشا گاہ سے اُٹھ نہ سکا۔ سارا ہال گیلریاں اور باکسز بھرے تھے، ہر شخص لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بجز ظہیر کے۔ کل مجمع میں وہی ایسا تھا جسے پریشانی، شرمندگی اور استعجاب نے عجیب عالم میں پہنچا دیا تھا۔ یہ دلچسپ تماشہ جلد ہی ختم ہو جاتا اگر اُس میں کئی قسم کے خوش آہند رقص اور مداحیہ عنصر نہ شامل کئے گئے ہوتے۔

واپسی میں ظہیر تماشہ کی حسرت ناک نوعیت پر غور کرتا ہوا ہوٹل پہنچا اور پہنچنے کے بعد بھی رات کو دیر تک تبصرہ کرتے کرتے سو گیا۔

صبح نو بجے ہوٹل کا کمرہ خوبصورت جوانا کی جلوہ گری سے جگمگا پڑا، ظہیر اُسے دیکھتے ہی فرط مسرت سے بیخود ہو گیا، و معانقا اور مصافحہ کرتے ہوئے جذبات شوق سے بے اختیار ہو کر اپنے لب کا قرار جانا کے نازک اور شفاف ہاتھ پر رکھ دیئے اور کوئی نصف لمحہ اُسی عالم میں ساکن رہا۔

جوانا تبسم ہو کر کہنے لگی۔ کاش یہ حالت بھی اُسی مضحکہ کی ہوتی؟ ظہیر نے شرمندہ ہو کر اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور جوانا نے قہقہہ مارتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

"اچھا یہ فرمایئے کہ اب بھی کوئی چشمہ جیب میں ہے؟

کیسا چشمہ؟

وہی رات والا جسے لگا کر سنیما میں اپنی ہیئت تبدیل کرنا چاہتے تھے ... ؟ جوانا ہنستے ہنستے لوٹ گئی کیونکہ اُس نے گذشتہ رات کو ظہیر کی خجالت، حلیہ تبدیل کرنے کی انتہائی کوشش اور غیر معمولی اضطراب سے بے حد لطف اٹھایا تھا۔

ظہیر نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "واقعی خوب تماشا تھا۔ اور مشکل یہ تھی کہ عین وقت تک نہیں سمجھا ورنہ جاتا ہی کیوں؟" جوانا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور مجھ سے پوچھئے جب آپ وہاں بغلیں جھانک رہے تھے اور جلدی سے چشمہ لگا کر شکل و شباہت بدلنا چاہتے تھے۔ اس وقت میری حالت بھی ناقابل دید تھی میں ہنستے ہنستے بیتاب ہوئی جاتی تھی اور چاہتی تھی کہ کس طرح تماشائیوں سے آپ کو متعارف کرا دوں اس لئے کہ دنیا کا کوئی نقال اور کوئی ایکٹر اُن قدرتی کیفیات کی نقل نہیں کر سکتا جو آپ پر طاری تھیں۔ اور سچ بتایئے اگر اس وقت تعارف کرا دیا جاتا تو کیا ہوتا؟"

"ہوتا کیا؟ قسم خدا کی پھر تو شرم سے میں مر ہی جاتا" دونوں نے زبردست قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ ملا لیا۔

ظہیر نے کہا۔ ایک تو میں خالص ہندوستانی دیہہ بے جھجک امور کا عادی نہیں ہوں اُس پر ستا کا مجمع —— خدا کی پناہ! ایک ساتھ ایک جگہ کر بیٹھا ہوں، ہر طبقہ کے یورپین اور اُن کے علاوہ بھی ہندوستان میں سے میسیوں قسم کے لوگوں کا اژدحام —— یقین جانئے میں اس

باقیاتِ فانی!

از حضرت سید شاہ شاہد علی صاحب فانیؔ - رئیس اعظم گورکھپور

سنتے ہیں کہ تم غیر سے مصروفِ وفا ہو
دل ہم بھی لگا بیٹھیں کہیں اور تو کیا ہو

دشمن کی طرح یہ بھی دغا تم سے کریگا،
دو روز کا یہ حسن ہے بھولے ہوئے کیا ہو

مشہور تو کی تھی خبرِ وصل عدو نے
ناحق کو خدا واسطے تم مجھ سے خفا ہو

ہم بھی کسی مہرو سے لگائینگے دل اپنا
کچھ غم نہیں تم شوق سے اغیار کو چاہو

بیمارِ غمِ ہجر کی حالت تو عیاں ہے
سینے سے لپٹ جاؤ بھلا اب دیکھتے کیا ہو

کچھ مر تو نہ جائینگے اگر تم نہ ملوگے
ہم سے جو کشیدہ ہو تو کیا کوئی خدا ہو

معشوق وفادار کہیں ہوتے ہیں فانیؔ
جس طرح بنے اُن بتِ بدخو سے نباہو

"افسانۂ روح"

ٹیگور کا ایک شاہکار

مترجمہ جناب ملک سلمان الارشد صاحب فاروقی

— ۱ —

اس سال میں نے میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں کیا اور سائنس میں صوبہ بھر میں اول رہا۔ میرے والد نے مجھ کو حکم دیا کہ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کروں گو میں نے اس سے بہت بچنا چاہا مگر والد کا حکم دینا تھا میرے بس کی بات نہیں تھی مجبوراً میں اس پر تیار ہو گیا والد کی رائے تھی کہ چھٹیوں کے اندر اندر مجھے جسم انسانی کی بناوٹ کا مطالعہ کر لینا چاہئے چنانچہ اس مقصد کیلئے والد نے ایک لڑکے کا پنجر منگوا کر میرے کمرہ میں رکھوا دیا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ مُردے سے بچے کس قدر ڈرتے ہیں گو میری عمر اس وقت اٹھارہ برس کی تھی مگر مجھ کو یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ اس مُردے کو دیکھ کر میرے دل میں ایک طرح کا خوف پیدا ہو گیا تھا گو میرے ساتھی کہتے تھے کہ ایک بیجان پنجر کیا نقصان پہنچا سکتا ہے مگر اس کے اس نظریہ سے مجھ کو ہمیشہ اختلاف رہا میری رائے تھی اگرچہ روح اس جسم سے جدا ہو چکی ہے مگر پھر بھی وہ کبھی کبھی اپنے جسم کو دیکھنے آتی ہے گو میرا یہ خیال قرین قیاس نہ تھا مگر یہ امر واقعہ ہے کہ میرا یہ خیال درست نکلا۔

— ۲ —

ایک روز شام کو جب میں بازار سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اس لئے آج کی رات مجھے اپنے کمرے میں گذارنی پڑے گی۔ کبھی رات کو میں کمرے میں نہ سویا تھا ۔۔۔ گئے تک ۔۔۔ کرتا رہا اور ۔۔۔ ہی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا یہاں تک کہ رات کے بارہ بج گئے بدقسمتی سے آج لیمپ میں بھی تیل ختم ہو گیا اور اس کی لو کم ہوتے ہوتے آخرکار بالکل ختم ہو گئی یکایک میں نے محسوس کیا کہ کوئی متحرک چیز میرے اردگرد پھر رہی ہے کچھ عرصہ بعد ٹھنڈی سانسوں کی آواز اور قدموں کی آہٹ سنائی دی میں نے خیال کیا کہ یہ میرا وہم ہے رفع شک کی خاطر میں نے آواز دی "کون ہے؟" میری آواز سن کر وہ نامعلوم ہستی میرے قریب آ کر بولی "میں ہوں سوشیلا اپنی ہڈیوں کو دیکھنے آئی ہوں"۔

میں سمجھا کہ دلیپ ہے جو مجھ کو ڈرا رہا ہے میں نے کہا "یہ کونسا وقت ہے جو تم آئے اپنا مقصد بیان کرو"۔

آواز آئی "میرے لئے وقت کی کوئی قید نہیں میری چیز ہے جب دل چاہا اس کو دیکھنے آ گئی اس پنجر میں میں نے اپنی زندگی کی پوری بائیس بہاریں گذاری ہیں آپ کا کوئی ہرج تو نہیں ہوا"۔ میں نے اس کو ٹالنے کے لئے کہا "نہیں آپ شوق سے اس کو دیکھئے میں سوتا ہوں" میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی وہ یہاں سے ٹلی میں بھاگ جاؤں گا۔ مگر وہ جانے والی آسامی نہ تھی کہنے لگی "کیا آپ یہاں اکیلے سوتے ہیں اچھا تو آیئے میں آپ کو اپنی سرگذشت سناؤں"۔

ڈر کے مارے میرا برا حال تھا۔ مگر مجبوراً میں نے کہا "ضرور سنائیے"۔ کوئی شخص کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا اور کہا کہنے لگی:

"آج سے ۲ سال قبل میں بھی آپ کی طرح ایک انسان تھی اور انسانوں میں بیٹھ کر گفتگو کیا کرتی تھی لیکن اب ایک مرگھٹ میں رہتی

ہوں آج میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی کہ میں آج پہلا ایک انسان سے ہمکلام ہوں میں آپکا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ میری سرگذشت سننے کو ہو گئے آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔

میں نے کہا نہیں کیونکہ نہیں کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔

~ ۳ ~

وہ کہنے لگی "جب میں انسان تھی تو اس وقت صرف ایک شخص سے ڈرتی تھی جو میرے لئے موت کے فرشتے سے کم نہ تھا۔ وہ میرا شوہر تھا یہ شخص مجھ کو میرے والدین سے لے آیا تھا مگر خدا کی قدرت کہ شادی کے دو ماہ بعد ہی اسکا انتقال ہو گیا لوگ اس کے مرنے پر خوب روئے اس کی ماں نے اپنا منہ کوٹ لیا۔

مگر میں خوش تھی کہ میری راہ کا اٹکا ہوا روڑا دور ہو گیا۔ مجھ کو اب امید تھی کہ گھر جانے کی اجازت مل جائیگی اور میں پھر اپنی پرانی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کروں گی۔ لیکن کچھ عرصہ تک مجھ کو میکے جانے کی اجازت نہ ملی ایک دن میرا سسر گھر میں آیا اور میری ساس سے کہنے لگا یہ لڑکی ڈائن معلوم ہوتی ہے ان الفاظ نے میرے دل پر ایک سخت چرکہ لگایا یہ الفاظ مجھ کو اب بھی اسی طرح یاد ہیں۔ جیسے ابھی کہے گئے ہوں لیکن اس کے بعد میں گھر بھیجدی گئی گھر پہنچ کر جو خوشی مجھ کو حاصل ہوئی اسکا اظہار میرے احاطہ بیان سے باہر ہے میں وہاں اپنی زندگی عیش و عشرت کے ساتھ گذارنے لگی۔

اسی زمانہ میں میں نے لوگوں سے اپنے حسن کے بارے میں لاکھوں تعریفیں سنیں کوئی مجھ کو پری کہتا کوئی کنول کے پھول سے تشبیہ دیتا۔ اچھا آپ کی میرے متعلق کیا رائے ہے؟ میں نے گھبرا کر کہا میں نے آپ کو زندگی میں نہیں دیکھا اس لئے میں اس کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں آپ پہلے جو کچھ کہا وہ صحیح ہوگا وہ بولی آہ آپ کو کیا معلوم میری خوبصورتی . . . . . بسر گمیں دراز گیسو سیمتن بدن گداز جسم یہ آنکھیں جو آج بے رونق ہیں لوگوں کے دلوں پر بجلیاں گراتی تھیں مجھے یاد ہے کہ جب میں چلا کرتی تھی تو کتنے لوگ دل تھام کر رہ جاتے تھے میری چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں مہرجان کو شرماتی تھیں افسوس کہ اس شاہنجہ

نے میرے حسن و جمال کے متعلق آپ کو غلط رائے قائم کرنے کا موقع دیا اگر آپ مجھ کو عالم جوانی میں دیکھتے تو یقیناً آپ کی آنکھوں کی نیند اڑ جاتی علم تشریح کا سودا آپ کے دماغ سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتا

میں نے جواب دیا محترمہ آپ یقین کیجئے کہ فن تشریح کے متعلق کی تمام معلومات سے اس وقت میں خالی الذہن ہو گیا ہوں اور آپ کی خوبصورتی میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے اس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا میرے بھائی نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ شادی نہ کرے گا اس لئے اب گھر پر میری والدہ کے علاوہ کوئی دوسری خاتون نہ تھی ماں ضعیف ہونے کے سبب سے ایک کونہ میں بیٹھی پوجا کیا کرتی تھیں۔ میں سہ پہر کو باغ چلی جاتی اور سایہ دار درختوں میں بیٹھتی تو درخت مجھ کو گھورا کرتے اور ٹھنڈی ہوائیں میرے ساتھ اٹکھیلیاں کرتیں مجھ کو اپنے حسن پر ناز تھا اس لئے میں مغرور بھی ہو گئی تھی کبھی میں خیال کرتی کہ شہر کے تمام نوجوان مجھ پر مرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں میری ماں بیمار پڑی اور بھائی کا دوست تپش کمار ان کو دیکھنے آیا تو اس نے مجھ کو نہیں دیکھا مگر میں نے اس کو دیکھ لیا مجھ کو یہ کہنے میں ذرا بھی شرم نہیں معلوم ہوتی کہ اس کی خوبصورتی نے مجھ پر ایک خاص اثر کیا ماں کی بیماری بڑھتی گئی اور اس کی آمد کا سلسلہ برابر جاری اب میں اس سے کترانے لگی تھی اسی دوران میں ماں صحتیاب ہو گئی۔ میرے بھائی متین اور سنجیدہ آدمی تھے۔ ان کو سوائے دوکان کے اور کوئی کام نہ تھا اس لئے وہ صبح سے شام تک دوکان پر بیٹھتے اور میں اکیلی گھر میں رہتی تو تپش کا خیال میرے دل میں چٹکیاں لیا کرتا۔ ادھو آپ کیا سوچنے لگے ہیں۔ میں نے کہا کاش تپش کمار میں ہی ہوتا! وہ ہنسی اور کہنے لگی محبت بعد میں کیجئے گا پہلے سن لیجئے"

"ایک دن مجھ کو بخار ہو گیا بھائی نے تپش کو بلایا اس نے اس سے پہلے مجھ کو کبھی نہ دیکھا تھا وہ مجھ کو دیکھکر سکتے میں رہ گیا مگر وہ جلدی سے سنبھلا اور کہا میں ان کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں میں نے اپنا ہاتھ نکال دیا تپش نے میری نبض پر ہاتھ رکھا میں نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس کو کیا ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا وہ خود بیمار ہو گیا ہے [illegible] کا خیال

...ل میں جا گزیں ہو چکا تھا ... مو کہ خفا تھا کہ شام کو کپڑے بدل کر
...ییٹتا تو میرے کہنے ... باغ میں چلی جاتی اور گھنٹوں اپنی صورت دیکھا
...تی کہا آئینہ ... کتنا بھلا ہے میں نے کہا ہرگز نہیں میرے دل سے
...ب خوف بالکل دور ہو چکا تھا۔ اس نے کہا آئینہ دیکھ کر میں یہ محسوس
...تی کہ میں دو زندگیوں میں منقسم ہو گئی ہوں یعنی ایک سوشیلا اور ایک
...ل ہوں میں خود تیش بن کر اپنے سے محبت کیا کرتی مجھ کو اس میں
...ا لطف آتا تھا۔ شام کو اکثر میں خواب میں دیکھتی کہ نیتی آیا اور میرا
...سے کر چلا گیا۔ اچھا اب آپ کو نیند آ رہی ہے میں جاتی ہوں۔
...م کو اس کہانی سے بہت لطف آ رہا تھا اس لئے میں نے کہا نہیں
...کو نیند نہیں آ رہی آپ کہے جایئے۔ وہ کہنے لگی کچھ عرصہ کے بعد تیش
...کا کام بہت بڑھ گیا۔ اس نے میرے مکان کے نیچے اپنا مطب کھول
...یا جب اس کو مریضوں سے فرصت ملتی میں اس کے پاس جا بیٹھتی
...اس سے دواؤں کے نام پوچھا کرتی وہ بہت شوق اور محبت سے
...ے کو ان کے نام بتاتا مگر میں نے یہ دیکھا کہ جب میں اس کے سامنے
...اتی اسکا چہرہ زرد ہو جاتا نگاہیں جھک جاتیں۔

ایک صبح ڈاکٹر نے بھائی سے رات کے لئے موٹر مانگی میں نے
...بھائی سے پوچھا وہ اتنی رات گئے کہاں جائیگا۔ بھائی نے کہا وہ اپنی
...شادی فروخت کرنے جائیگا یعنی آج اس کی شادی ہے۔ یہ سنکر
...میرے چہرہ پر ایک مردنی سی چھا گئی لیکن میں نے اپنے آپ کو
...سنبھالا۔ ڈاکٹر نے آخر یہ بات مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھی یہ مجھ کو ناگوار
...تھا کیا میں اس کو روکتی کہ بیاہ نہ کرو۔

شام کو جب ڈاکٹر مریضوں سے فارغ ہوا تو میں نے اس سے
کہا کیوں ڈاکٹر صاحب آج آپ کی شادی ہے یہ کہہ کر میں قہقہہ مار
کر ہنسی ڈاکٹر یہ سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا اس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے
لگیں میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کیا شادی کے بعد بھی اسی طرح لوگوں
کا ... دیکھا کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب شاید آپ مکمل ڈاکٹر نہیں ورنہ
... دیکھ کر دل کا بھی پتہ لگا سکتے کیونکہ دل بھی تو جسم کا ایک حصہ
... ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

(۴)

برات کے جانے میں دیر تھی ڈاکٹر اور میرا بھائی بیٹھ کر حسب
معمول شراب نوشی کرنے لگے۔ ڈاکٹر پیتے پیتے نیم مدہوش ہو گیا اور میرا
بھائی بھی۔ میں نے موقعہ پا کر ڈاکٹر کے گلاس میں زہر کی پڑیا ڈالدی جو
میں نے دوپہر کو اس کی غیر حاضری میں چرائی تھی ڈاکٹر نے اپنا گلاس
ختم کر لیا اتنے میں میرے بھائی نے کہا چلو وقت ہو گیا ڈاکٹر اور بھائی
اٹھ کر چلے گئے "

میں بھی اپنے کمرے میں گئی اور نئے کپڑے پہن کر سولہ سنگار
کئے سر سے عطر لگایا اور پائیں باغ میں چلی گئی جہاں میں شام کو اکثر بیٹھا
کرتی تھی باغ خوشبو سے مہک رہا تھا ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی باقیماندہ
دوا میں نے کھالی اور اوپر سے پانی پی لیا تھوڑی دیر بعد مجھ کو چکر آیا اور آنکھیں
بند ہونے لگیں زمین آسمان پھرتے ہوئے معلوم ہوئے اور پھر بس آج
۲ سال بعد میں بیدار ہوئی تو دیکھا کہ میرا ڈھانچہ یہاں رکھا تھا جس سے
کہ تم علم تشریح سیکھ رہے تھے اچھا اب میں جاتی ہوں تم سو جاؤ۔

اس کے بعد ایک سرسراہٹ سی سنائی دی اور میں بیہوش
ہو گیا صبح جب آنکھ کھلی تو سخت گرمی۔ دن چڑھا ہوا تھا اور والد اور دوست
میرے گرد بیٹھے تھے میں نے سب سے یہ قصہ بیان کیا مگر اس کا
کوئی یقین نہیں کرتا لیکن میں نے اس کی یہ تمام گفتگو ہوش کی حالت
میں سنی ہے اب خواہ کوئی یقین کرے یا نہ کرے :

شہرۂ آفاق ادیبہ جارج ایلیٹ کی کتاب زندگی کے رومانی اوراق

(از جناب افسر صاحب ماہ پوری)

"کیا یہ انسان کی بہت بڑی اکثریت کا ظلم نہیں ہے۔ کہ ہم پر بلا وجہ جور و استبداد کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔"

مندرجہ بالا سطریں انیسویں صدی کی شہرۂ آفاق ادیبہ جارج ایلیٹ کے قلم سے اسوقت نکلی تھیں جب اُسے اس کے اعزہ و احباب نے ہدف لعنت و ملامت بنایا تھا — محض اس بنا پر کہ وہ جارج ہنری لوئیس کے دام محبت میں گرفتار ہو گئی تھی — کیا محبت کرنا کوئی گناہ ہے؟

فی الحقیقت اسکا نام میری این اوانس تھا مگر علمی و ادبی دنیا میں وہ جارج ایلیٹ ہی کے نام سے مشہور ہے۔

اس کی داستان عشق کی سرگزشت سے بخوبی آگاہ ہونے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رحجانات طبیعت اور خصائل و شمائل پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

جہاں میری این کا دماغ مردانہ خصوصیات سے مالا مال تھا۔ وہاں اس کا دل نسوانی جذبات و احساسات سے بھی معمور تھا! اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے دماغ میں متانت اور سنجیدگی سے مسائل کی چھان بین کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی مگر اسکا دل جذبات کی رو میں بہہ جانے کے لئے اسے مجبور کر دیتا تھا۔

میری این [illegible] کی انتہائی کمزوری ہے۔ وہ عورت جو اپنے دل [illegible] ہر قدم پر حماقتیں کرتی ہے۔ اور اسے سخت ناکامیوں [illegible] سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

[illegible] میری این [illegible] کی [illegible] سے محروم تھی لیکن [illegible] کر دی تھی

سادگی اور بانکپن منور کر دیا تھا۔ جو لوگوں کے دلوں پر بے اختیار تسلط جما لیتا تھا۔ اس کا دل و دماغ شاعرانہ اور ادیبانہ رنگ سے قطعی طور پر مملو تھا۔ وہ ان کمزور عورتوں میں سے نہیں تھی جو کارزار حیات اور کشاکش زندگی سے ہراساں و سراسیمہ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ میری این نے اپنے محبوب کی محبت میں شہرت و ناموری جیسی کمیاب دولت کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر ایثار کی ایک ایسی قیمتی مثال پیش کی ہے جس پر جنس لطیف جس قدر ناز کرے کم ہے۔

اگرچہ لوئیس فہم و فراست اور عقل و ادراک کی بنا پر میری این کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم بہ حیثیت ایک ادیب و فلسفی و نقاد کے اس نے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ میری این کی طرح وہ بھی شکیل و جمیل نہیں تھا۔ لیکن اس کا دماغ ادراک و فراست کی دولت سے معمور اور اس کا دل وفاداری، ایثار اور قربانی کے مقدس جذبات سے لبریز تھا۔ بالآخر وہ میری این کا سچا خیر خواہ اور معاون و مددگار رہا۔

لوئیس سے ملاقات کے قبل میری این کی زندگی کی دیواریں متزلزل بنیاد پر استوار تھیں۔ مدت تک وہ فلسفہ و ادب اور دیگر علوم و فنون کے میدان میں سرگرداں رہی — مگر بے سود۔ یہ لوئیس ہی تھا جس کی انتھک تگ و دو نے اسے صراط مستقیم پر گامزن کیا۔

کہا جاتا ہے کہ میری این کی رومانی زندگی کا آغاز ایک مشہور و معروف مصور کی محبت سے ہوا مگر اس واقعہ میں کہاں تک حقائق کا تعلق ہے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میری این کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات تھی۔ ہربرٹ اسپنسر بھی اس کے دوستوں میں

سے تھا۔ اسی شخص نے ۱۸۵۱ء میں جبکہ میرین کی عمر تئیس برس کی تھی۔ اس کا تعارف لوئیس سے کرایا تھا۔ جو اس وقت "لیڈر" کا مدیر تھا۔ وہ ہر وقت کبیدہ خاطر رہتا کیونکہ اس کی بیوی نے اس سے بیوفائی کی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق تو دے دی تھی لیکن بچوں کی تعلیم و تربیت کا سارا بار اسی پر پڑ گیا تھا۔ جب میرین کو اس کی خانگی زبوں حالی کی خبر ہوئی تو اس کا دل رحم و کرم کی لاانتہا ہی موجوں سے بھر گیا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے دل کے تاریک ذرّوں سے محبت کی نورانی شعاعیں پھوٹنے لگیں۔

وہ ایک دوسرے کے حقیقی دوست و غمگسار ہو گئے۔ خوشی مسرت اور رنج و غم میں ایک دوسرے کے شریک تھے۔ ان کے درمیان دنیا کی کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ محبت کے پرستار تھے۔

بالآخر وہ دن بھی آیا جب میرین نے لوئیس سے استدعا کی کہ وہ اُسے ہمیشہ کے لئے اپنی کنیز بنا لے۔ لوئیس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں کیونکہ عدالتی پیچیدگیاں میرین کی اس خواہش کی تکمیل میں مانع تھیں۔

اس پر بھی میرین نے صداقت پر محبت کو ترجیح دی اور لوئیس کے ساتھ عمر بھر رہنے کا اعلان کر دیا۔ سوسائٹی اس پر تحقیر و تذلیل کی بارش کرنے لگی۔ بھائی نے اسے اس کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا اور اعزہ و اقربا نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ گویا اس نے محبت کر کے ایک ایسے گناہ کا ارتکاب کیا تھا جو کسی حال میں بھی قابل عفو نہ تھا۔

اوپر میں عرض کر چکا ہوں کہ میرین معمولی دل و دماغ کی تو تھی نہ تھی وہ راسخ عزم اور اٹل ارادہ رکھتی تھی۔ لہٰذا وہ ہرگز تیار نہیں تھی کہ سوسائٹی کی بے جا اور بیجا خواہش پر اپنی محبت کا خون کر کے متاع حیات کو غارت کر دے۔ اس نے سوسائٹی کی قطعی پروا نہ کی اور لوئیس اور اس کے مابین جو محبت کے غیر متزلزل تعلقات قائم تھے انہیں "اخلاقی شادی" کے نام سے منسوب کیا۔ چنانچہ وہ اس سلسلہ میں فکس ہولٹ میں اظہار خیال کرتی ہے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شادی کیا ہے؟ ایک ظاہری بندش ہے۔ اس میں عموماً محبت ایثار و قربانی کا فقدان ہوتا ہے۔ اگر شادی میں محبت ایثار و قربانی کے پاک جذبات کارفرما نہ ہوں تو اسے شادی کا درجہ دینا سخت حماقت کے مترادف ہے ۔ ۔ ۔؟"

گو میرین اپنے نظریات کے مطابق ایمان کی روشنی میں صبر آزما مصائب و تکالیف کا مردانہ وار مقابلہ کر رہی تھی اور اپنے کو لوئیس کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک تصور کرتی تاہم کبھی کبھی اس کا دماغ شکوک و شبہات کی جولانگاہ بنجاتا تھا۔ لہٰذا اپنی آتشیں کتاب "رومولا" میں اپنی روح کی بیقراریوں اور بےچینیوں کا اظہار "سیونا رولا" کے منہ سے ذیل کے الفاظ میں کرتی ہے۔

"تم یہ پسند کر سکتے ہو کہ اپنے فرائض سے کنارہ کش ہو کر تمام اذیتوں اور تکلیفوں کی قید و بند سے آزاد ہو جاؤ۔ مگر تمہارا یہ خیال باطل ہے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ تمہیں کن کن چیزوں سے دوچار ہونا پڑیگا۔ آہ! مت پوچھو ——— رنج و غم اور یاس و ناامیدی۔"

میرین اپنی راہ پر گامزن تھی ——— بغیر کسی خوف و خطر کے ——— چوبیس سال تک اس نے اس شخص کی جسے وہ اپنا "شوہر" سمجھتی تھی، ایسی عبادت اور پرستش کی کہ آج تک اسکا نام دنیا میں روز روشن کی مانند چمک رہا ہے۔

جونہی لوئیس اور میرین لندن سے جرمنی پہنچے لوئیس نے "لائف آف گوئٹے" پر اپنی تمام و کمال توجہات مرکوز کر دیں۔

میرین کے دل میں کبھی یہ شبہ نہیں گذرا کہ جس راستہ پر وہ چل رہی ہے، غلط ہے حالانکہ سوسائٹی ہمیشہ اس کی مخالف رہی اس نے گناہ کیا تھا؟ محبت! اور صرف محبت!!

میرین نے اپنے کو ایک ایسے ہیجان کا منار میں ڈال دیا تھا۔ جس کی ہولناکیاں لوگوں کے دلوں میں ارتعاش پیدا کر سکتی ہیں۔ وہ کس سے جنگ کر رہی تھی اور کس چیز سے؟ ——— سوسائٹی کے مظالم کے خلاف اور اپنے دل و دماغ کی بے پناہ قوتوں سے ——— کیا کوئی خاتون ایسا کر سکتی ہے جو کر سکی ہو؟

میرین [illegible] سال کے سن میں روحی اور ذہنی کشمکش سے [illegible] کا وفادار دوست داغ مفارقت دے گیا۔ بعد ازاں [illegible] پیری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک شخص سے شادی کر لی۔

۱۸۵۹ء میں جب "آدم بیڈ" کی اشاعت ہوئی تو دنیا نے میرین کو ایک بے نظیر ادیبہ کی حیثیت سے پہچانا اور اسے بے حد خراج تحسین [illegible] اس کے بعد "مل آن دی فلوس" اور "کلاس مارنر" یکے بعد دیگرے جلد ہی شائع ہوئے۔ ان کتابوں کو شاہکار سمجھا گیا اور انہیں امتیازی درجہ حاصل ہوا۔

اب شہرت اور ناموری نے میرین کے قدم چومے۔ پہلے میرین کو اپنے قلم پر شبہ تھا۔ لیکن یہ لوئیس کی پر خلوص کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک جلیل القدر ادیبہ بن کر غیر فانی شہرت کی مالک بنی۔

"رومولا" بے حد مقبول ڈرامہ ثابت ہوا ۱۸۶۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہو گیا پھر ۱۸۶۸ء میں "اسپین گیپسی" اور ۱۸۷۱ء میں "مڈل مارچ" کی پہلی جلد غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی

بعد ازاں میرین کے قلم سے بیشمار کتابیں ڈرامے اور افسانے وغیرہ شائع ہوئے جو انگریزی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قارئین کرام کو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ لوئیس کی پہلی بیوی کے بطن سے تین بچے تھے۔ اب میرین ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کی ذمہ دار تھی۔ انہیں وہ اپنی اولاد کی طرح پیار کرتی۔ چنانچہ لوئیس میرین کا از حد ممنون احسان تھا۔ لہٰذا اس ضمن میں وہ ایک جگہ یوں تحریر کرتا ہے۔

"میرین سے واقف ہونا، اس سے محبت کرنا میری مقسومات ہیں بنابریں میری زندگی میں ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ .... پھر آگے لکھتا ہے میری تمام جائداد اور میری تمام مسرتیں اس کے دم سے وابستہ ہیں ___ وہ ایک بہادر عورت ہے ___ اس کی روح شجاعت سے معمور ہے۔"

میرین کی روز افزوں شہرت و ترقی سے اس کے مخالفوں میں ایک عجیب و غریب تغیر وقوع پذیر ہوا۔ وہ اس کے سچے ہمدرد اور خیر خواہ بن گئے۔ لوگ اس کے گرد حلقہ بنائے ہمیشہ جمع رہتے اور اس پر تعریف و تحسین کے پھول نچھاور کرتے۔

۱۸۷۸ء میں لوئیس کا انتقال ہو گیا۔ میرین پر غم و الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دل و دماغ پر حزن و ملال کی گھٹائیں چھا گئیں۔ زمانے کے سفاک ہاتھوں نے اسکے سرمایہ حیات کو خاک میں مدفون کر دیا تھا۔ اسکے دل کی تمام خواہشیں و آرزوئیں مفقود ہو گئیں۔ اپنی بے سروسامانی اور ضعیفی کو مدنظر رکھ کر اس نے ۱۸۸۰ء میں جان کراس سے بیاہ کر لیا جسے وہ تقریباً دس برس سے جانتی تھی۔ بعد کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی راہی ملک بقا ہو گئی۔ گرچہ وہ مر چکی ہے مگر اسکا نام اب تک ادبی و علمی دنیا میں زندہ جاوید ہے۔

عثمانی کیپ
شیخ محمد فیاض الدین اینڈ سنز
استاد درزیاں باتصویر
مصنفہ
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ